کربلا شناسی

مجموعہ

مجالس عزا

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

ناشر

تنظیم المکاتب

گولہ گنج۔ لکھنؤ

بسمہ سبحانہ

سلسلۂ آثار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ

کربلا شناسی

مجموعۂ

مجالس عزا

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

ناشر

تنظیم المکاتب

گولہ گنج، لکھنؤ ۱۸، یو۔پی (انڈیا)

نام کتاب : کربلا شناسی

مصنف : علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

کتابت : جلال الدین احمد

طباعت

پہلا ایڈیشن : نومبر ۱۹۹۵ء

دوسرا ایڈیشن : ستمبر ۲۰۰۴ء

تیسرا ایڈیشن : فروری ۲۰۱۶ء

تعداد : پانچ سو

مطبوعہ : اے۔بی۔سی۔آفسیٹ پریس، دہلی

ناشر : تنظیم المکاتب، لکھنؤ۔انڈیا

ہدیہ : Rs. 90/-

فہرست

خطبہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ
الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ
خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ
وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ
وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ ○ اَمَّا
بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہٖ
الْکَرِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ
رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ○
وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○

بسمہٖ سبحانہٗ

عرضِ تنظیم

ادارہ تنظیم المکاتب نے تحریکِ دینداری کو آگے بڑھانے کے لئے کتابوں کی نشرواشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا بحمداللہ ارتقائی منزلوں سے گذر رہا ہے اور یکے بعد دیگرے کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں۔

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کی تقاریر کا یہ مجموعہ "کربلا شناسی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مومنین کی فرمائش بالحاظ اُن کی دینی معلومات میں اضافہ، نیز مجالس میں با مقصد بیان کے پیش نظر اسے دوبارہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔ پہلی اشاعت میں کمپوزنگ کمپیوٹر سے ہوئی تھی لیکن اس کتاب کو مزید دیدہ زیب بنانے کے لئے اب کتابت کرائی گئی ہے۔

ربِ کریم ہماری اس سعی کو قبول فرمائے اور ملت کو کربلا شناسی کے ذریعہ راہِ حسینؑ پر چلنے کی مزید قوت عطا فرمائے۔

والسلام

سید صفی حیدر
سکریٹری تنظیم المکاتب

مجلس نمبر ۱

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ ۝

امابعد!

"اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ اور میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

۱۴۲۱ھ کے آغاز کے ساتھ مرکزِ حسینی کا جو سلسلۂ مجالس شروع ہو رہا ہے اس میں عشرۂ اوّل کی مجالس کے لیے جو عنوانِ بیان طے کیا گیا ہے وہ ہے مسئلہ کربلا شناسی۔

دورِ قدیم کے حالات دورِ حاضر کے حالات سے یقیناً مختلف ہیں اگر آپ پچھلے ادوار میں اُمتِ اسلامیہ کے حالات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ اس دور میں مسائلِ کربلا اس قدر مبہم نہیں بنائے گئے تھے جس قدر مبہم اور مشکوک دورِ حاضر میں بنائے جا رہے ہیں۔

زیادہ زمانہ نہیں گذرا آج سے نصف صدی پہلے شاعر نہایت ہی آزادی اور بے باکی کے ساتھ یہ کہتا تھا کہ "لفظ یزید داخلِ دشنام ہو گیا" لیکن آج نام نہاد مسلمانوں کے درمیان ایسے افراد بہر حال پیدا ہو گئے ہیں جو یزید نواز، یزید پرست

اور اپنے کو یزید کہنے میں بھی کوئی شرم و حیا محسوس نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اگر آپ مزید مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہوا کا رُخ اتنا بدل گیا ہے کہ ایسے بے غیرت مسلمان بھی پیدا ہو گئے ہیں جو واقعۂ کربلا کی ذمہ داری تمام تر خود امام حسینؑ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

کل صرف ایک شخص پیدا ہوا تھا جس نے واقعۂ کربلا کا انکار کر دینے کی جرأت کی تھی۔ آج نہ جانے کتنے بے ہوش اور بدحواس مسلمان پیدا ہو رہے یا پیدا کیے جا رہے ہیں جن کا تمام تر منشا یہ ہے کہ اگر اصل واقعہ کربلا کا انکار نہ کر سکیں تو اس کی حیثیت کو یکسر تبدیل کر دیں۔

میں ان تفاصیل کو ان مجالس میں آپ کے سامنے گذارش کروں گا لیکن گزشتہ برسوں کی طرح پھر آپ کو یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ یہ مجالس جو عشرۂ اول میں اس عزاخانے میں منعقد ہوتی ہیں ان کی حیثیت ان تمام مجالس سے مختلف ہے جو تمام سال اس عزاخانے میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس کے شرکاء سال بھر کے شرکاء سے مختلف ہوتے ہیں ان مجالس میں حصہ لینے والے مختلف نظریات مختلف خیالات اور مختلف عقائد کے لوگ ہوتے ہیں اس کے علاوہ (جیسا کہ آگے چل کر دیکھیں گے) ان مجالس کا محل وقوع بھی عام مجالس سے مختلف ہوتا ہے اس لیے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ گفتگو کو اتنا سنجیدہ اور علمی رکھا جائے کہ اگر کسی انسان میں اونچی سنجیدگی فکر پائی جاتی ہے اور کوئی انسان واقعاً مسائل کو سمجھنا چاہتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ سُن بھی سکے اور سمجھ بھی سکے۔

اگرچہ بعض افراد کے مخصوص جذبات کی تسکین نہیں ہو سکتی ہے اور میں اس کے لیے ہمیشہ معذرت خواہ رہتا ہوں اور پھر معذرت خواہ ہوں کہ اگر آپ کو ایسے مسائل کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا ہیں تو یہ سلسلۂ عزا تمام سال قائم رہتا ہے آپ تشریف لائیں اور انشاء اللہ وہ سارے مسائل جو آپ کے ذہن میں ہیں یا جن کے بارے میں آپ سننا چاہتے ہیں وہ تمام سال بیان ہوتے رہتے ہیں اور بیان ہوتے رہیں گے۔ ان مسائل سے دلچسپی لینے والے حضرات کو چاہیے کہ عشرۂ محرم کے

بعد بھی عزاخانہ کا رُخ کرنے کی زحمت گوارا کیا کریں۔ یہ آیات کریمہ جن کی آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے یہ سورہ مبارکہ فجر کی آخری آیتیں ہیں اور سورہ مبارکہ فجر وہ سورہ ہے جس میں پروردگار عالم نے ان تمام اقوام کے انجام کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے روئے زمین پر فساد برپا کیا۔ اپنی بلندی اور برتری کا اعلان کر کے مخلوقاتِ خدا کو ذلیل کیا۔ زمینِ خدا کو تباہ و برباد کیا۔ "فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ" دنیا میں جتنا فساد ان کے امکان میں تھا اتنا فساد پھیلایا اور یہی خیال کرتے رہے کہ ہم اتنی طاقت والے ہیں، اتنی قوت و ہمت والے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی ہے۔

لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ ہم نے جب ان قوموں کو فنا کرنا چاہا تو آج ان قوموں کے نام باقی رہ گئے ہیں مگر نشان باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ ان تمام تذکروں کے بعد پروردگار عالم نے اپنے مخصوص بندوں کو مخاطب بنایا ہے۔ "يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي" اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

میں حسب روایات سلسلۂ بیان کو شروع کرنے سے پہلے آیۂ کریمہ کے الفاظ کی مختصر وضاحت کرنا چاہتا ہوں تاکہ روز اوّل سے یہ باتیں آپ کے ذہن میں محفوظ رہیں اور آئندہ فضائل اور مسائل کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

اگر میرے تمام سُننے والوں نے آیۂ کریمہ کے اس لہجہ پر توجہ دی ہے اور اس مضمون کو نگاہ میں رکھا ہے تو آپ کو محسوس ہوا ہوگا کہ اس میں ایک بات ہے جو اوّل سے آخر تک بیان کی گئی ہے۔ "اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔ ہمارے بندوں میں شامل ہو جا، ہماری جنت میں داخل ہو جا۔"

مکمل مضمون ایک مضمون ہے جس میں پروردگار عالم نے نفس مطمئن کو مخاطب قرار دیا ہے۔ اگر قرآن مجید میں سورۂ فجر کو آپ دیکھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مضمون ایک ہے مگر آیتیں چار ہیں۔ یعنی پروردگارِ عالم نے ایک مضمون کو چار آیات میں بیان

کیا "یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ" یہ ایک آیت ہے۔ "اِرۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً" یہ دوسری آیت ہے۔ "فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ" یہ تیسری آیت ہے۔ "وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ" یہ چوتھی آیت ہے۔ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰ یہ چار آیتیں ہیں سورہ مبارکہ فجر کی آخری آیات جن کی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اور جن کا مضمون مسلسل ایک مضمون ہے جس کو پروردگار عالم نے چار آیات میں بیان کیا ہے۔

یہ ایک مسئلہ ہے جو صاحبانِ نظر ہیں یا جنھیں حقائق قرآن کے پہچاننے سے دلچسپی ہے اور مزید معلومات کے لیے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یہ بات میں ان کے لیے گذارش کر رہا ہوں میں نے خود تفسیر قرآن میں جو شاید دو چار مہینہ کے بعد منظر عام پر آئے ان مسائل کی نشاندہی کی ہے کہ جن کے تفصیلات کو مفسّرین نے عام طور سے اور خصوصیت کے ساتھ ہماری زبان میں تفسیر لکھنے والوں نے یا نظر انداز کر دیا ہے یا بالکل ضمنی حیثیت دی ہے جب کہ یہ خود اپنے مقام پر مستقل موضوعات ہیں جن پر بحث ہونی چاہیے تھی اور مفسّرین کو ان کے بارے میں تفصیلات اُمّت اسلامیہ کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

ان میں سے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جا بجا جو آیتیں پائی جاتی ہیں ان آیتوں کا مقصد کیا ہے۔

یہ تفصیلات آپ کو کتابوں میں نہیں ملیں گی اور اس انداز سے عام طور پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ میں تو خالی اشارہ کر رہا ہوں اپنے موضوع تک جانے کے واسطے تاکہ آپ اس حقیقت کو محسوس کر سکیں جس کی طرف آپ کے اذہان عالیہ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید میں مثلاً یہ سورہ ساٹھ آیتوں کا ہے، وہ سورہ دو سو چھیاسی آیتوں کا ہے۔ یہ سورہ گیارہ آیتوں کا ہے، وہ سورہ تیرہ آیتوں کا ہے۔ وہ ستّرہ آیتوں کا ہے۔ وہ سو آیتوں کا ہے۔ تو یہ آیتیں جن کے نشانات الگ الگ گول آپ کے سامنے قرآن مجید میں موجود ہیں ان آیات کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ کیوں پروردگار عالم اپنے بیان کو ایک

مقام پر روک کے جب سلسلہ کو آگے بڑھاتا ہے تو جہاں دوبارہ روکا جاتا ہے یہ دوسری آیت ہوتی ہے، جب کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیان اتنا مسلسل ہے کہ جب تک ساری باتیں بیان نہ کرلی جائیں بیان مکمل ہونے والا نہیں ہے۔

میں دور آپ کو نہیں لے جاؤں گا، قرآن مجید کا وہ سورہ جو صبح وشام آپ پڑھتے ہیں اور جس کی تلاوت ہر مسلمان ہر نماز میں کرتا ہے "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ"۔ ساری حمد اللہ کے لیے ہے۔ وہی اللہ جو عالمین کا پالنے والا ہے۔ وہی اللہ رحمان ہے وہی رحیم ہے۔ وہی روز قیامت کا مالک ہے۔ یہ ساری باتیں ایک ہی اللہ کے بارے میں ہیں۔ اللہ ہی رب العالمین ہے، اللہ ہی رحمان ورحیم ہے، اللہ ہی مالک یوم الدین ہے یعنی یہ ساری باتیں اللہ ہی سے متعلق ہیں۔ تو بظاہر جب یہ ساری صفتیں ختم ہوجائیں تو ایک اللہ کا ذکر ختم ہوتا ہے۔ جب یہ سارے کمالات بیان ہوجائیں تو بات مکمل ہوتی ہے۔ مگر "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" یہ ایک آیت ہے۔ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" یہ دوسری آیت ہے۔ "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" یہ تیسری آیت ہے۔

یہی سلسلہ آخر میں ہے۔ پروردگار عالم کہتا ہے مجھ سے دعا کرو کہ "پروردگار! ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ صراط مستقیم کن کا راستہ ہے جو نعمت والے ہیں جو گمراہ نہیں ہیں، اُن پر غضب نازل نہیں ہوا ہے۔ تو یہ ساری بات مکمل ہو کے ایک بات تمام ہوتی ہے مگر اس کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ تو جب بات مکمل ہوتی ہے دو آیتوں میں، تین آیتوں میں، چار آیتوں میں تو درمیان درمیان آیتیں رکھ کے وقفہ کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ ایک بات کو دوسری بات سے کیوں الگ کیا گیا ہے۔ یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس پر مفسرین نے بحث نہیں کی ہے تو میں آپ کے ذہن کے حوالے کیسے کروں، یا اپنے بچوں اور نوجوانوں پر کیسے اعتبار کروں کہ وہ سمجھ جائیں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں ایک اشارہ کر رہا ہوں تاکہ آئندہ آپ پڑھیں اور علمائے کرام سے دریافت کریں کہ پروردگار عالم جو بیچ میں اپنے بیانات کو آیت کے ذریعہ روک دیتا

ہے، تو اس روک دینے کا مقصد کیا ہوتا ہے جب کہ بات کبھی دو آیتوں میں مکمل ہوتی ہے، کبھی تین میں مکمل ہوتی ہے، کبھی چار میں مکمل ہوتی ہے، بلکہ اس سے زیادہ واضح "وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" قسم ہے عصر کی۔ کہ انسان گھاٹے میں ہے، علاوہ ان کے جو ایمان لائے، نیک عمل کیے اور حق و صبر کی وصیت کرتے رہے۔ یہ قسم کے بعد ساری بات جب مکمل ہوتی جب ان کا ذکر بھی ہو جائے جو گھاٹے میں ہیں اور ان کا ذکر بھی ہو جائے جو خسارے میں نہیں ہیں۔

مگر قرآن مجید میں "وَالْعَصْرِ" ایک آیت ہے۔ "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" دوسری آیت ہے۔ "اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" تیسرا تذکرہ شروع ہو گیا ہے۔ جب کہ ساری باتیں ملا کے ایک بات پروردگار نے کہی ہے کہ قسم ہے عصر کی کہ انسان گھاٹے میں ہے، علاوہ ان انسانوں کے جو ایمان و کردار والے ہیں۔ تو بات تو مکمل ہوتی ہے ان سارے مضامین کو ملا دینے کے بعد، مگر قرآن مجید میں اسی ایک مضمون کو مختلف آیتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

میری بات پر آپ غور کر رہے ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات آپ کے ذہن نشین ہو جائے، اس کے بعد جس کو شوق ہو گا وہ تلاش کرے گا۔

لیکن جس بات کو مجھے گذارش کرنا ہے اجمالاً تا کہ آپ بات کی بنیاد کو محسوس کر سکیں اور آئندہ تحقیق کرنے کے لیے پھر راستہ کھل سکے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کی مصلحتوں میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ پروردگار عالم جب کسی ایک طویل مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہے تو اس مضمون میں جتنے اہم مراحل ہوتے ہیں، جتنی اہم منزلیں ہوتی ہیں، یا یوں کہا جائے کہ جن اہم نکات پر پروردگار اپنے بندوں کے ذہن کو روکنا چاہتا ہے وہیں پر آیت کا نشان لگا دیا جاتا ہے تا کہ انسان یہاں ٹھہر کے پہلے اس بات کو سمجھ لے کہ ہیں نے کیا کہا ہے اس کے بعد آگے بڑھے۔ اگرچہ بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے مگر یہ جگہ وہ ہے کہ جہاں خوب غور کرنا چاہیے۔ دوسرا مرحلہ وہ ہے جہاں پھر غور کرنا چاہیے۔ تیسرا مرحلہ وہ ہے کہ جہاں پھر غور کرنا چاہیے۔ آخری مرحلہ وہ ہے کہ جہاں بات جا کر مکمل ہو جائے گی مگر ایک بات کے کہنے میں یہ چار مقامات ہیں جہاں انسان کو سوچنا چاہیے اور غور کرنا چاہیے۔

اس کی ایک واضح سی مثال جس کو میں آپ کے سامنے گذارش کر رہا ہوں تاکہ چھوٹے بچے بھی محسوس کر سکیں۔

میں جو آپ کے سامنے اس روانی کے ساتھ تقریر کر رہا ہوں جب میں نے ابتدا سے آپ کے سامنے بیان شروع کیا تھا تو یہ روانی نہیں تھی۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مجھے بولنا نہیں آتا تھا اور دو چار منٹ کے بعد تقریر کرنے کا سلیقہ آ گیا۔ مجھے یہ اعلان کرنا ہے کہ حضرات کل پہلی محرم ہے، مثلاً جمعرات کا دن ہے، اگست کی تین تاریخ ہے، مجلس ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو گی، بیان نو بجے شروع ہو گا۔ یہ تو میں ایک سانس میں بھی کہہ سکتا تھا مگر یہ اعلان جو میں نے شروع کیا، میں نے کہا کل تین اگست پہلی محرم، جمعرات کا دن، رات کا وقت، ساڑھے آٹھ بجے سوز و سلام کا سلسلہ، اور نو بجے بیان کا سلسلہ شروع ہو گا، آپ حضرات شرکت فرمائیں۔ یہ بار بار میرے بیان میں وقفہ کیوں ہو رہا ہے۔ یہ بار بار میں لفظوں کو توڑ توڑ کے کیوں بیان کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ میرا منشا یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں تین اگست بھی رہے، آپ کے ذہن میں جمعرات بھی رہے، آپ کے ذہن میں پہلی محرم بھی رہے، آپ کے ذہن میں وقت بھی رہے، آپ کے ذہن میں بیان بھی رہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں ایک سانس میں بیان کر دوں اور لوگ یہی سمجھیں کہ شاید سب ایک ہی بات ہے یا سب الگ الگ باتیں ہیں اور سمجھ نہ پائیں۔ جب مخاطب کو کوئی بات سنجیدگی سے سمجھانا ہوتی ہے تو بیان کو روکا جاتا ہے تاکہ بات ذہن نشین ہو جائے۔

اور اس کے بعد خدا نکردہ اگر آپس میں اختلاف ہو جائے تو میں اس کا مجرم نہیں ہوں۔ انسان جو ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتا ہے، یہ اس لیے نہیں کہ زبان میں لکنت پائی جاتی ہے یا اسے بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ ہر لفظ پر توجہ دی جائے تو لفظوں کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے اور جب یہ چاہتا ہے کہ پورا مضمون سمجھا جائے اور الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے تو ساری باتوں کو سمیٹ کے ایک جملہ میں کہہ دیا جاتا ہے۔

اب آپ پہچانیں کہ پروردگار عالم نے ایک مضمون کو چار حصوں میں کیوں بانٹا ہے

"اے نفس مطمئن" رُک گیا۔ بیان ٹھہرا ہوا ہے۔ "اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ، تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔ بیان روک دیا گیا۔ "فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ" میرے بندوں میں شامل ہو جا۔ بیان پھر رُک گیا۔ "وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ" میری جنت میں داخل ہو جا۔ اب بیان مکمل کیا گیا۔ کیوں؟

اس لیے کہ انسان کی زندگی کے چار مرحلے ہیں یا اس کے چار پہلو ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ اس کا ساتھ نفس کیسا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کے اپنے پروردگار سے تعلقات کیسے ہیں۔ تیسرا رُخ یہ ہے کہ پروردگار سے تعلقات یکطرفہ ہیں یا دوطرفہ ہیں۔ چوتھا رُخ یہ ہے کہ اس کے روابط اور تعلقات کس کس سے ہیں۔ پانچواں رُخ یہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہے۔ اللہ نے ان چار آیتوں میں یہ پانچوں باتیں بیان کردی ہیں۔ بات میں ان سے کر رہا ہوں جن کا نفس مطمئن ہے۔ جن کا نفس غیر مطمئن ہے انھیں نہیں پکار رہا ہوں اور بات ان سے کر رہا ہوں جن سے میرا تعلق ہے۔ "اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ" اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ۔ اور یہ تعلقات یکطرفہ نہیں ہیں کہ یا ہم اس سے راضی ہوں یا وہ ہم سے راضی ہو۔ نہیں ہم اس سے راضی ہیں اور وہ ہم سے راضی ہے۔ اور اگر تعلقات دیکھنا ہیں تو تعلقات ہمارے ان بندوں سے ہیں جن میں ہم شامل کرنا چاہتے ہیں اور انجام ہماری جنت ہے جس میں ہم داخل کرنا چاہتے ہیں۔

کہ جو ہمارے بندوں میں شامل ہو جائے گا اس کا آخری انجام جنت ہے۔

یہ چار پانچ مقامات ہیں جہاں انسان کو بیٹھ کے غور کرنا چاہئے تاکہ یہ محسوس کر سکے کہ پروردگار عالم نے جس انسان کو یا جن انسانوں کو مخاطب بنایا ہے ان کا نفس کیسا ہے، ان کا کردار کیسا ہے، پروردگار سے ان کے روابط اور تعلقات کیسے ہیں، وہ کن لوگوں کے درمیان رہتے ہیں اور ان کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے۔

یہ ساری باتیں اگر تمہید کے طور پر آپ کے ذہن عالی میں محفوظ ہو گئی ہیں تو اب میں اس سلسلۂ بیان کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ کربلا کو پہچاننے کے لیے ان موضوعات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اپنا حاصل مطالعہ جو آپ کے سامنے آئندہ مجالس میں

گذارش کروں گا۔ میں چاہوں گا کہ آپ اس کو ذہن میں محفوظ کریں، اور اگر نہ محفوظ ہو سکے تو اب الحمد للہ ایسے وسائل موجود ہیں کہ جن میں ان باتوں کو محفوظ کیا جا سکتا ہے اور آئندہ اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور دوسروں تک یہ پیغام پہونچایا جا سکتا ہے۔

واقعۂ کربلا کا پہلا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ واقعۂ کربلا میں جن شخصیتوں کا نام آتا ہے وہ خود کون ہیں اور ان کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ یوں تو شخصیتیں بہت ہیں جن کا کربلا کے ذیل میں ذکر آتا ہے۔ اِدھر والے بھی اور اُدھر والے بھی۔

لیکن جو دو نمایاں کردار ہیں ان میں ایک کردار ہے فرزند رسولؐ حسینؑ ابن علیؑ کا، اور ایک کردار ہے ابن ابی سفیان کے بیٹے یزید کا۔

میں آپ کے سامنے ابتدائی مراحل میں چاہوں گا کہ ان دونوں کرداروں کو آپ عالمِ اسلام کی نگاہ میں پہچانیں اور روایات اور آیات کی روشنی میں دیکھیں کہ روایات اور آیات کی روشنی میں شخصیتِ امام حسینؑ کیا ہے، اور روایات اور تاریخ کی روشنی میں کردارِ یزید بن معاویہ کیا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ کچھ دن پہلے ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر آدمی پہچانتا تھا کہ امام حسینؑ کا کردار کیا ہے اور یزید کی زندگی کیا ہے۔ مگر دورِ حاضر میں حالات کو اتنا اُلٹا جا رہا ہے اور تاریخ کو اتنا مسخ کیا جا رہا ہے کہ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے تاکہ یہ باتیں انسان کے ذہن میں رہیں کہ اگر واقعۂ کربلا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہے تو فقط یہی دیکھ لے کہ جس معرکہ میں ایسے دو کردار ٹکرائیں گے وہ معرکہ کیا ہوگا۔

تو پہلی منزل ہے شخصیتِ امام حسینؑ۔

امام حسینؑ کی شخصیت کو پہچاننے کے لیے تین راستے ہیں۔ یا امام حسینؑ کو آیاتِ قرآن سے پہچانا جائے، یا امام حسینؑ کو سیرت و کردارِ پیغمبر سے پہچانا جائے، یا امام حسینؑ کو خود ان کی سیرت و کردار سے پہچانا جائے۔

پہلو تو بہت ہیں لیکن ظاہر ہے کہ میں ایک گھنٹہ میں، یا دو گھنٹہ میں ساری باتیں نہیں گذارش کر سکتا ہوں لہٰذا میں صرف خاکے آپ کے سامنے رکھوں گا تاکہ مطالعہ کرلیے

دوسرے راستے کھل جائیں۔

امام حسینؑ کی شخصیت باعتبار قرآن۔ امام حسینؑ کی شخصیت باعتبار سیرتِ پیغمبر، اور امام حسینؑ کی شخصیت خود اپنی سیرت اور اپنے کردار کے اعتبار سے تاکہ تاریخ کے اعترافات بھی آپ کے سامنے آجائیں۔

اگر آیاتِ قرآنی کے اعتبار سے کردارِ امام حسینؑ کو دیکھا جائے تو اس حقیقت سے کوئی انکار کرنے والا پیدا نہیں ہوا ہے، اور جس کی نگاہ قرآن مجید اور تفاسیر قرآن پر ہے وہ جانتا ہے کہ جس وقت قرآن مجید کی آیۂ کریمہ "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا" نازل ہوئی تو اس آیۂ کریمہ کے نزول کے وقت جن لوگوں کو پیغمبرؐ نے چادر میں لیا تھا اور جن اہلبیت کہہ کر متعارف کرایا تھا اور جن کو پروردگار عالم نے اہلِ بیت کہہ کر مخاطب بنایا تھا۔ ان افراد میں ایک شخصیت تھی امام حسینؑ کی۔ اور یہ وہ بات ہے کہ جس کے روایت کرنے والے مردوں اور عورتوں میں سب ایک سے ایک معتبر افراد ہیں جو عالم اسلام کی بڑی شخصیات ہیں۔ صحابۂ کرام میں بھی اور ازواج میں بھی دونوں جگہ۔ خود جناب ام سلمہ راوی ہیں، ام المومنین عائشہ راوی ہیں۔ صحابۂ کرام میں کتنے بڑے بڑے اصحاب ہیں جنھوں نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے زیر کساء جن افراد کو لیا تھا، علیؑ فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ تھے اور اس کے بعد نبیؐ نے دعا کی تھی "اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَيْتِیْ" اے پروردگار! یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے ہر برائی کو دور رکھنا۔ ان کو طیب و طاہر رکھنا۔ پیغمبرؐ کی اس دعا کے بعد پروردگار عالم نے اس آیۂ کریمہ کو نازل فرمایا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نگاہِ قرآن میں اہلبیتؑ کا مصداق ہیں حسینؑ، نگاہ قرآن میں طہارت و عصمت کا مرکز ہیں حسینؑ ابن علیؑ۔

تو جس کو پروردگار عالم نے رجس سے دور رکھا ہے اور جس کو اللہ نے طیب و طاہر بنایا ہے اگر اس کے کردار میں ادنیٰ کمزوری پیدا ہو جائے یا اس کی زندگی میں ادنیٰ عیب پیدا ہو جائے یا اس کے نفس میں ادنیٰ گندگی پیدا ہو جائے تو یہ اس کے نفس کا عیب نہیں ہے۔ یہ اس کے نفس کی کمزوری نہیں ہے۔ یہ اس پاک کرنے والے کی کمزوری ہے کہ جس کے پاک بنانے

کے بعد بھی پاک نہ ہو سکا اسی لیے اللہ نے طہارتِ اہلبیتؑ کا اعلان ان کی طہارت کے نام سے نہیں کیا ہے بلکہ اپنے ارادہ کے نام سے کیا ہے کہ جتنا میرے ارادے میں زور ہوگا اتنا ہی آلِ محمدؐ کی طہارت میں زور ہوگا۔

یہ میرا موضوع تو نہیں ہے لیکن اب بات آگئی ہے تو ایک نیا رُخ ہے میں چاہتا ہوں آپ کے حوالے کردوں اور آپ اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ابو سعید خدری پیغمبرؐ کے معتبر صحابی ہیں اور عالم اسلام میں سب ان کے اعتبار کے قائل ہیں اور خود امام حسینؑ نے ان کے اعتبار کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ سے پوچھا گیا یارسول اللہ! یہ آیۂ تطہیر کس کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

آپ برابر سنتے رہتے ہیں اور حدیث کساء میں برابر پڑھتے رہتے ہیں مگر یہ پیغمبرؐ کے معتبر صحابی اور جلیل القدر صحابی ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ انھوں نے پیغمبرؐ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! یہ بتائیے یہ اہلبیتؑ کون ہیں۔ یہ آیۂ کریمہ آیۂ تطہیر کس کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ یہ اہلبیتؑ کون ہیں تو پیغمبرؐ نے فرمایا "نَزَلَتْ فِیَّ وَفِی عَلِیٍّؑ وَفَاطِمَۃَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ" پیغمبرؐ نے فرمایا کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے اور علیؑ کے بارے میں اور فاطمہؑ کے بارے میں اور حسنؑ کے بارے میں اور حسینؑ کے بارے میں۔ یعنی پیغمبرؐ نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ اس سے مراد میرے گھر والے نہیں اس لیے کہ اگر نبیؐ کے گھر والے ہوتے تو نبیؐ کے گھر والے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ ہوتے۔ پیغمبرؐ نے کہا یہ خود میرے بارے میں نازل ہوئی ہے اسی لیے حدیث کساء میں اہلبیتِ نبیؐ کا ذکر نہیں ہے اہلبیتِ نبوۃ کا ذکر ہے کہ نبیؐ کے گھر والوں میں نبیؐ کے علاوہ افراد ہوں گے اور نبوت کے گھر والوں میں خود نبی بھی ہیں، علیؑ بھی ہیں، فاطمہؑ بھی ہیں اور حسنؑ و حسینؑ بھی ہیں۔

بہرحال یہ جو رُخ میں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں یہ پروردگار عالم کی تائید ہے جو یہ بات میرے ذہن میں آئی ہے اور انشاء اللہ یہ بات اگر آپ کے ذہن نشین ہوگئی اس روایت کی روشنی میں تو کبھی یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا کہ اہلبیتؑ کون ہیں۔

حضورؐ نے کیا فرمایا، یہ آیت میرے بارے میں، علیؑ کے بارے میں، فاطمہؑ کے بارے میں، حسنؑ و حسینؑ کے بارے میں، تو اب پیغمبر اسلامؐ کا یہ بیان ایک مسئلہ کا مستقل حل ہے اور وہ مسئلہ کیا ہے کہ پاک کرے یا پاک رکھے۔ ہمارے یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اے اہلبیتؑ! اللہ کا ارادہ ہے کہ تم کو طیب و طاہر رکھے۔ ہر برائی سے الگ رکھے لیکن عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ اہلبیتؑ کو پاک کرے اور یہ کہہ کر سب خوش ہوتے ہیں کہ جب اللہ نے کہا ہے کہ ہم تم کو پاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہے کہ اللہ اہلبیتؑ کو پاک کرنا چاہتا ہے اور جب پاک کرنا چاہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے معاذ اللہ کوئی کمزوری تھی۔ پاک نہیں تھے تو پاک کرنا چاہتا ہے لیکن میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ ٹھیک ہے اللہ پاک کرنا چاہتا ہے اللہ اہلبیتؑ کو پاک بنانا چاہتا ہے۔ اتنی بات سمجھ لیجئے کہ جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے ان میں ایک پیغمبرؐ ہیں، ایک علیؑ ہیں، ایک زہراؑ ہیں، ایک حسنؑ ہیں، ایک حسینؑ ہیں اور آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب امام حسنؑ اور امام حسینؑ پیدا ہو چکے تھے اور پیدا ہو کے اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ اپنے پیروں سے یہ بھی آئے اور اپنے پیروں سے وہ بھی آئے۔ مباہلہ میں تو یہ روایت ہے کہ پیغمبرؐ میدان میں حسینؑ کو گودی میں لے گئے، مگر چادر تطہیر میں آنے میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ حسینؑ کو گودی میں لے گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ امام حسینؑ اپنے پیروں سے چل کر آئے۔ امام حسنؑ اپنے پیروں سے آئے تو اتنی عمر تو بہر حال ہوگی کہ اپنے پیروں سے چلنے کے قابل تھے اور چل کے آئے اور چادر میں داخل ہو گئے۔

تو امام حسنؑ پیدا ہوئے ۳ھ میں، امام حسینؑ پیدا ہوئے ۴ھ میں حضورؐ دنیا سے گئے ۱۱ھ کے آغاز میں۔ ۱۱ھ ماہ صفر میں یا ربیع الاول میں۔ تو جتنے واقعات یا جتنی آیتیں یا جتنا قرآن نازل ہوا وہ سب ۱۱ھ کے آغاز تک اس کے بعد تو کوئی آیت نہیں آئی۔ تو پیغمبرؐ کے زمانہ میں قرآن نازل ہوا تو پیغمبرؐ جب دنیا سے جا رہے تھے تو امام حسنؑ کی عمر کیا تھی تقریباً سات سال۔ امام حسینؑ کی عمر تقریباً چھ سال تقریباً

اٹھارہ سال معصومہؑ عالم، اس لیے کہ معصومہؑ کا انتقال پیغمبرؐ کے فوراً بعد ہو گیا ہے پچھتر دن کے بعد یا تین مہینہ کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں تو سترہ اور اٹھارہ کے درمیان معصومہؑ عالم۔ خود پیغمبرؐ کی عمر کیا ہے تقریباً تریسٹھ سال۔ علیؑ کی عمر تیس سال کم کر دیجئے۔ تو جب بھی یہ آیت نازل ہوئی ہے، فرض کیجئے پیغمبرؐ کے دنیا سے جانے سے دو تین سال پہلے یہ آیت نازل ہوئی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ کی عمر تھی ساٹھ سال علیؑ کی عمر تیس سال۔ زہراؑ کی عمر پندرہ سال۔ حسنؑ کی عمر مثلاً چار سال حسینؑ کی عمر تھی تین سال۔

میں پھر دہراؤں تا کہ یہ بات آپ کے ذہن نشین ہو جائے۔ اگر پیغمبرؐ اسلام کے انتقال سے دو تین سال پہلے یہ آیت نازل ہوئی ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ سرکار دو عالمؐ تھے ساٹھ سال کے۔ مولائے کائناتؑ تھے تیس سال کے۔ شہزادیؑ تھیں مثلاً پندرہ سال کی۔ امام حسنؑ تھے چار برس کے۔ امام حسینؑ تھے تین سال کے، اور ان سب کو سامنے رکھ کے خدا کہتا ہے اے اہلبیتؑ! ہم تم کو پاک کرنا چاہتے ہیں تو اگر خدا پاک کرنا چاہتا ہے اور آپ یہ کہنا چاہتے کہ جب خدا پاک کرے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے پاک نہیں تھے تو جوڑیے کون کتنی زندگی تک پاک نہیں تھا۔ نبی جب ساٹھ سال کے ہو گئے تب خدا کو پاک بنانے کا خیال آیا علیؑ تیس سال کے ہو گئے تب یہ بات پیدا ہوئی۔ زہراؑ پندرہ سال کی ہو گئیں تب یہ بات پیدا ہوئی اس اعتبار سے بھی جو شرف حسینؑ کو حاصل ہوا وہ کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔

یعنی نزول آیت کے بعد ابھی امام حسینؑ کو ۵۴۔۵۵ سال دنیا میں رہنا ہے۔ حضورؐ کو تو تین ہی سال رہنا ہے۔ اب اگر پلٹ کے آپ حساب لگائیں گے تو آپ کا کیا ایمان بنے گا پیغمبرؐ کے بارے میں۔ کیا عقیدہ بنے گا سرکار دو عالمؐ کے بارے میں۔ اور یہاں تک جو بات میں نے گذارش کی ہے ایک مسئلہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ اگر مسئلہ پاک کرنے ہی کا ہے تو چلئے خیر سے اب تو خدا نے پاک کر دیا۔ توجہ۔ اب جو چادر میں آ گئے اور خدا نے طہارت کا اعلان کر دیا اب تو سب پاک ہو گئے تو جس کے بارے میں جتنا شبہ ہو گا وہ اس کے پہلے ہو گا۔ آج کے بعد اب کوئی شک و شبہ نہیں ہو گا

اس لیے کہ اب تو خدا نے پاک بنا دیا ہے۔

مسلمانو! یہ کہنے سے پہلے سوچ کر جو شبہ ہو گا وہ پہلے ہو گا بعد میں نہیں ہو سکتا ہے تو اتنا تو سوچا ہوتا کہ نبیؐ نے نبوت کا اعلان پہلے کیا ہے اور علیؑ کی ولایت کا اعلان بعد میں ہوا ہے۔ پیغمبرؐ نے اپنی رسالت کا اعلان آیت کے نازل ہونے سے پہلے کیا ہے اور علیؑ کی ولایت کا اعلان آیت کے نازل ہونے کے بعد کیا ہے۔ یعنی "بقول آپ کے" طہارت کے پہلے کا وہ اعلان ہے یا طہارت سے پہلے کا یہ اعلان ہے؟ اگر شک کرنا ہے تو نبوت میں کرو، علیؑ کی مولائیت میں شک نہ کرنا۔

میں تو خالی آج کہہ رہا ہوں کہ اگر شک ہو سکتا ہے تو اُدھر ہو سکتا ہے اِدھر نہیں ہو سکتا ہے لیکن اتفاق سے یہ بات تاریخ کے مطابق ہو گئی کہ شک ہوا بھی تو اُدھر ہی ہوا اِدھر تو واضح طور پر کہہ دیا کہ آپ میرے مولا ہو گئے اس لیے کہ یہ تو طہارت کے بعد کا اعلان ہے اب اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور سارا واقعہ بہر حال اس آیت کے نزول کے بعد کا ہے اس لیے حسینؑ کے کردار میں شک نہیں ہو سکتا ہے حسنؑ کے کردار میں شک نہیں ہو سکتا ہے یہ تو سب آیتِ تطہیر کے بعد کی منزلیں ہیں۔ اگر حسنؑ صلح کریں گے تو اعتراض نہ کرنا خدا انھیں پاک بنا چکا ہے۔ اگر حسینؑ جنگ کریں گے تو اعتراض نہ کرنا خدا انھیں پاک بنا چکا ہے۔ اور اگر آپ کی سمجھ میں حسنؑ کی صلح کا انداز نہ آئے تو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے، یہ خدا سے کہو کہ دو مختلف کردار ہیں تو دونوں کو کیوں پاک بنا دیا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آیتِ تطہیر میں اہلبیتؑ کا مصداق ہیں حسینؑ بن علیؑ یعنی ان مصادیق میں، جو اس آیت کے ہیں ایک حسینؑ بن علیؑ ہیں تو حسینؑ باعتبار آیۂ تطہیر منزل و مرکزِ طہارت ہیں۔ اس کے بعد سرکارِ دو عالمؐ عیسائیوں کے مقابلہ میں مباہلہ کے میدان میں آئے تو حسینؑ کو گودی میں لے کر آئے اور خدا اعلان کر رہا تھا پیغمبرؐ! کہو ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ " آؤ مباہلہ کریں اور سب مل کر جھوٹوں پر لعنت کریں۔ تو جو یہ جھوٹوں پر لعنت کرنے کے لیے قافلہ آیا ہے اس میں بھی حسینؑ بن علیؑ ہیں۔ گویا وہ طہارتِ حسینؑ کا اعلان تھا اور یہ صداقتِ حسینؑ کا اعلان ہے۔ یعنی اگر کوئی طہارت کو حسینؑ

سے الگ کرے تو ارادۂ خدا میں شک ہے اور اگر کوئی حسینؑ کے مقابلہ میں آجائے گا تو وہ مصداق صادقین نہیں ہو سکتا ہے مصداق لعنت تو ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اعلان کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے آ کر عرض کی کہ سرکار دو عالمؐ! آپ نے بڑی زحمتیں برداشت کی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی زحمتوں کا جو معاوضہ ہوتا ہے وہ ہم حاضر کر دیں؟ پروردگار نے اعلان کیا "قل لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی" پیغمبرؐ! آپ کہہ دیں کہ ہم کوئی اجر نہیں چاہتے ہیں، فقط یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اقرباء سے محبت کی جائے، مودت رکھی جائے۔

یہ اقرباء جن کی مودت کو اجرِ رسالت قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک حسینؑ بن علیؑ بھی ہیں۔ یہ تو وہ جگہیں ہیں کہ جہاں آیتیں نازل ہو رہی تھیں جب بیمار ہونے کے بعد روزوں کی نذر کی گئی اور وفا کا وقت آیا۔ روزے رکھے گئے یتیم و مسکین اور اسیر کو کھانا کھلا دیا گیا اور پروردگار عالم نے سورۂ ھَلْ اَتٰی نازل کیا تو سورۂ ھَلْ اَتٰی میں جہاں علیؑ ہیں، زہراؑ ہیں، وہیں حسنؑ بھی ہیں، حسینؑ بھی ہیں۔ یعنی حسینؑ آیاتِ قرآنی میں مرکزِ تطہیر، حسینؑ آیاتِ قرآنی میں منزلِ صادقین میں، حسینؑ آیاتِ قرآنی میں منزلِ اجرِ رسالت ہیں، حسینؑ آیاتِ قرآنی میں منزلِ سورۂ ھَلْ اَتٰی ہیں۔ یہ ہے حسینؑ کی حیثیت آیاتِ قرآنی میں۔

اب آیئے حسینؑ پیغمبرؐ کے اقوال و ارشادات میں، سرکار دو عالمؐ کے فرمان میں، حضورؐ کی سنت و سیرت میں، حسینؑ بن علیؑ کا مرتبہ وہ بھی حساب لگانا ہوگا۔

پیغمبر اسلامؐ نے حسینؑ کی منزل کا اعلان چند طریقوں سے کیا ہے۔ کبھی حسینؑ کا اعلان اہلبیتؑ کے ذیل میں کیا ہے۔ یعنی جب اہلبیتؑ کے فضائل بیان کیے ہیں تو اہلبیتؑ میں سے ایک حسینؑ بن علیؑ تھے مثلاً پیغمبرؐ نے فرمایا "اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ" میں تم میں ثقلین چھوڑے جا رہا ہوں، کتاب خدا اور عترت، جو میرے اہلبیتؑ بھی ہیں۔ انہی اہلِ بیتؑ میں حسینؑ بن علیؑ بھی ہیں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا" اَھْلُ بَیْتِیْ اَمَانٌ لِاَھْلِ الْاَرْضِ کَمَا اَنَّ النُّجُوْمَ اَمَانٌ لِاَھْلِ السَّمَآءِ" جیسے اللہ نے ستاروں کو اہلِ آسمان کے لیے امان بنایا ہے ویسے ہی اہلبیتؑ کو زمین والوں کے لیے امان بنایا ہے۔

ان ہی اہلبیتؑ میں حسین بن علیؑ بھی ہیں۔

پیغمبرؐ نے اعلان کیا" مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ" میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتیٔ نوح کی ہے جو کشتی پر سوار ہوگیا نجات پاگیا جو الگ ہوگیا وہ ڈوب گیا، غرق ہوگیا۔

اہلبیتؑ میں حسینؑ بن علیؑ بھی ہیں۔ لہٰذا جن کو نبیؐ چھوڑ کے گئے اور جن سے تمسک واجب ہے۔ جن کو پیغمبرؐ نے مثل سفینۂ نوح قرار دیا ہے ان میں حسینؑ بن علیؑ بھی ہیں۔ یہ ہے ایک انداز باعتبار اہلبیتؑ۔

دوسرا انداز جہاں پیغمبرؐ نے حسینؑ کے کمالات کا اعلان کیا ہے مگر دونوں شہزادوں کو ملا کے امام حسینؑ کے شرف کا اعلان کیا ہے مثلاً" اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ" حسنؑ و حسینؑ دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ یہ فضیلت حسینؑ بھی ہے اور فضیلتِ حسنؑ بھی ہے۔ پیغمبرؐ نے اعلان کیا" ھٰذَانِ اِبْنَایَ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا" یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں چاہے کھڑے ہوجائیں چاہے بیٹھ جائیں۔ یہ کمال حسینؑ کا اعلان ہے حسنؑ کے ساتھ۔ اور ایک روایت جو جناب ابوبکر نے بیان کی ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا" مَنْ اَحَبَّنِیْ وَاَحَبَّ ھٰذَیْنِ وَاَبَاھُمَا وَاُمَّھُمَا کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ فِیْ دَرَجَتِیْ"۔" مَنْ اَحَبَّنِیْ" جو مجھ سے محبت کرے" وَاَحَبَّ ھٰذَیْنِ" اور ان دونوں شہزادوں حسنؑ و حسینؑ سے محبت کرے" وَاَبَاھُمَا" اور ان دونوں کے والد بزرگوار سے محبت کرے" وَاُمَّھُمَا" اور ان دونوں کی مادرِ گرامی سے مودّت رکھے تو وہ جنت میں میرے ساتھ درجہ میں ہوگا۔ یہ بھی حسینؑ کی فضیلت کا اعلان ہے، مگر تنہا حسینؑ کا ذکر نہیں ہے حسینؑ کا ذکر ملے بھائی کے ساتھ، مادرِ گرامی کے ساتھ، پدرِ بزرگوار کے ساتھ۔ پیغمبر اسلام

نے یہ اعلان فرمایا ہے اور روایت میں کوئی شک تو ہو نہیں سکتا ہے اس لیے کہ شک ہوتا ہے جب راوی غیر معتبر ہوتا ہے۔ جب راوی معتبر نہیں ہوتا ہے تو روایت ضعیف ہو جاتی ہے لیکن جب راوی ایسا ہو جس کا اعتبار عالم اسلام میں پہچانا ہوا ہے تو اگر اس کے بعد بھی مسلمان اعتبار نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ رسالت کا اعتبار ہے اور نہ خلافت کا اعتبار ہے۔ کہنے والا پیغمبرؐ، روایت کرنے والا ایک ایسا انسان جس کو سب پہچانتے ہیں تو پیغمبر اسلامؐ نے اعلان کیا "کَانَ مَعِیَ فِیْ دَرَجَتِیْ فِی الْجَنَّةِ" جو ان سے محبت کرنے والا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں میرے درجہ میں ہوگا۔ اب پیغمبرؐ کا درجہ کیا ہے اس کو کون بتا سکتا ہے۔ مگر سرکار دو عالمؐ نے اس شرف کا اعلان کیا ہے اپنے شہزادوں کے لیے اور ان کی محبت کے لیے اور اسی کے ساتھ ساتھ زہراؑ اور علیؑ کی محبت کو بھی شامل کر لیا ہے کہ جس کے پاس یہ ساری محبتیں ہیں، تنہا حسینؑ کو گلے لگانے سے کام نہیں چلے گا تنہا حسنؑ سے اظہارِ محبت کرنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ شہزادوں سے محبت کی جائے، علیؑ بن ابی طالبؑ سے محبت کو دل میں جگہ دی جائے جب یہ سارے کمالات جمع ہو جائیں گے تو سرکارِ دو عالمؐ نے جس شرف کا اعلان کیا ہے اس کا استحقاق پیدا ہوگا۔

یہ ہیں وہ کمالات جن کا اعلان پیغمبر اسلامؐ نے حسینؑ کے بارے میں کیا ہے مگر اہلبیتؑ کے ساتھ، عترت کے ساتھ، ان افراد کے ساتھ جن کی مدح میں پروردگارِ عالم نے آیات اور سورے نازل فرمائے ہیں۔

اس کے بعد وہ منزل آتی ہے کہ جہاں پیغمبرؐ نے عظمتِ حسینؑ کا اعلان کیا ہے۔ حسینؑ کے کمالات کا تنہا اعلان کیا ہے اور جب بات آگئی ہے تو ایک فقرہ کہہ کر بات کو آج یہیں پر تمام کرنا چاہتا ہوں اور انشاء اللہ کل مزید وضاحت کروں گا۔

یہ ایک مرحلہ ہے سب کا سنا ہوا ہے، پیغمبر اسلامؐ جا رہے ہیں اور دوشِ پیغمبرؐ پر نواسہ ہے۔ آنے والے کی نظر پڑ گئی اس نے دیکھا پیغمبرؐ اپنے کاندھے پر نواسے

کو لیے جا رہے ہیں لہٰذا پیغمبرؐ کے نواسے کو مخاطب کر کے آنے والے نے آواز دی۔ اللہ نے تم کو کتنی اچھی سواری دی ہے۔ "نِعْمَ الْمَرْکَبُ" تمہارے لیے بہترین سواری کا انتظام پروردگار نے کیا ہے۔ پیغمبرؐ نے جو یہ سُنا تو ٹوک دیا۔ فقط یہی دیکھتے ہو کہ ان کو اللہ نے سواری کیسی دی ہے، یہ کیوں نہیں دیکھتے ہو کہ اللہ نے مجھ کو سوار کیسے دیئے ہیں۔ اب یہیں سے اختلافِ نظر کا بھی اندازہ ہو گیا کہ کہنے والا مرکب کو دیکھنا چاہتا ہے، راکب کو نہیں دیکھنا چاہتا اور نبی نگاہ کو ادھر موڑنا چاہتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ اسلام میں مرکب کا پہچاننا ہنر نہیں ہے راکب کا پہچاننا ہنر ہے۔

یہ وہ کمال ہے جس کو پیغمبرِ اسلام نے اپنی زبان مبارک سے بیان بھی فرمایا ہے اور اپنے اعمال سے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

اور یہ حسینؑ بن علیؑ کا مرتبہ ہے پیغمبرؐ اسلام کی سیرت اور پیغمبرِ اسلام کے کردار کی روشنی۔

میں آخر کلام میں ایک بات گذارش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ حسینؑ کی اپنی سیرت اور اپنا کردار، یہ داستان بہت طویل ہے اور اس کے لیے بڑا وقت درکار ہے۔ لیکن میں واقعہ کی روشنی میں جس کو علمائے اسلام نے اور علمائے اہلسنت نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ہمارے یہاں یہ واقعہ فطرس کے نام سے مشہور ہے اور عام روایات میں صلصائیل کے نام سے ہے یا دردائیل کے نام سے۔ یعنی کوئی ایک فرشتہ تھا جس پر کسی بنا پر پروردگارِ عالم کا عتاب نازل ہو گیا تھا اور اللہ نے اس کو ایک جزیرہ میں ڈال دیا تھا۔ وہ دن بھی آیا جب نبیؐ کے گھر میں نواسہ پیدا ہوا۔

جبرئیلؑ امین ملائکہ کی فوجوں کو لیے ہوئے آ رہے ہیں نبیؐ کی بارگاہ میں مبارکباد پیش کرنے کے لیے۔ جزیرہ سے گذر ہوا۔ اس فرشتہ کو دیکھا جو منزلِ عتاب میں تھا۔ اس نے گھبرا کے پوچھا جبرئیل! کہاں جا رہے ہو اتنے فرشتے آسمان سے زمین کی طرف

آرہے ہیں کیا قیامت آگئی ہے؟۔ کہا قیامت نہیں آئی ہے آخری پیغمبرؐ کے گھر میں نواسہ پیدا ہوا ہے، حکم پروردگار ہے ہم جارہے ہیں مبارکباد دینے کے لیے۔

کہا کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کو بھی لے چلو؟

ظاہر ہے کہ ایک مَلک بلکہ سیدالملائکہ ہیں جبرئیل لیکن اپنے اختیار سے کسی کو راستہ سے لے کر چلے جائیں یہ ان کے بس کا کام نہیں ہے اور کسی کے بس کا کام نہیں ہے خود اسے جس کو اللہ نے معصوم بنایا ہے وہ بھی اگر اپنی مرضی سے کام کرنا شروع کردے تو اس پر بھی عتاب نازل ہوجائے وہ بھی عتاب میں آجائے لہٰذا جبرئیل بھی کوئی کام نہیں کرسکتے جب تک مرضی پروردگار نہ ہو۔ اب اگر جبرئیل کسی کو لے کر چل رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ منشاء الٰہی ہی ہے، مرضئ پروردگار ہی ہے کہ اب مدتِ حیات تمام ہوچکی ہے۔ لہٰذا جبرئیلؑ لے کر چلے۔ سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں آئے۔ آکے تبریک کہنے کے بعد اور مبارکباد دینے کے بعد کہا یارسولؐ اللہ! یہ بندۂ خدا ہے، فرشتہ ہے جو عتاب میں آگیا ہے۔ میں ادھر سے آرہا تھا اس نے گذارش کی پروردگار عالم کی اجازت سے آپ کے پاس لے آیا ہوں اب آپ اس کے لیے دعا کردیں تو یہ عتاب ختم ہوجائے اور اس کو عتاب سے نجات مل جائے۔

اب اہلِ حدیث یعنی روایات نقل کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے کہا ٹھیک ہے اگر لے آئے ہو تو آج لے آئے ہو۔ کہا اس لیے لائے ہیں کہ آج آپ کے گھر میں مسرت کا دن ہے، خوشی کا دن ہے، آپ کی بیٹی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اللہ نے آپ کو نواسہ دیا ہے۔ کہا جب اس کی وجہ سے لائے ہو تو میرے پاس کیوں لائے ہو، دنیا میں وہ آیا ہے اور اس کے آنے کی بنیاد پر لائے ہو تو یہاں کیوں لائے ہو، لے جاؤ اسی کے گہوارے کے پاس۔ جبرئیل لائے اور لا کے گہوارہ کے پاس ڈال دیا اور روایت کا فقرہ ہے کہ آنے والے نے اپنے بازو کو حسینؑ کے جسم سے نہیں حسینؑ کے گہوارہ سے مس کیا اور ایک مرتبہ تازہ بال و پر عطا ہوئے اور جب چلا تو روایات میں ہیں کہ یہ کہہ کر چلا "مَنْ مِثْلِي" اب میرا جیسا کون ہے؟ آنا

عَتِیقُ الْحُسَیْنِ" میں حسینؑ کا آزاد کیا ہوا ہوں۔ میں حسینؑ کا آزاد کردہ ہوں۔ میں نے علماءِ اسلام کی روایت میں یہ فقرہ دیکھا ہے کہ یہ فرشتہ جس کو حسینؑ بن علیؑ کے طفیل میں نئے بال و پر ملے اور پرواز کر کے چلا تو ہمارے یہاں روایت میں یہ فقرہ ہے کہ اس نے کہا میرا جیسا کون ہے کہ میں حسینؑ کا آزاد کردہ ہوں، مجھے حسینؑ نے آزادی دلائی ہے۔ مگر جو میں نے روایت دیکھی ہے علماءِ اسلام کے یہاں اس میں فقط یہ نہیں ہے کہ فرشتے نے یہ کہا کہ میں حسینؑ کا آزاد کردہ ہوں۔ بلکہ علماءِ اسلام نے جو فقرہ نقل کیا ہے کہ یہ فرشتہ جب آسمان پر گیا تو اس دن سے اس کا نام ہوگیا "مَوْلَی الْحُسَیْنِ" حسینؑ کا غلام۔ اب یہ پہچانا جاتا ہے فرشتوں کے درمیان حسینؑ کے غلام کے نام سے یعنی جس کو حسینؑ نے آزادی دلوائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کو اتنا بڑا شرف کسی در سے مل جائے وہ اس کا بندہ بے دام نہ ہو جائے گا تو کیا ہوگا، لہٰذا پروردگارِ عالم نے اس کو یہ شرف دے دیا ہے۔

بس! یہ واقعہ آپ کا سُنا ہوا ہے۔ میں اس کے ذیل میں صرف ایک فقرہ کہہ کر تذکرہ کو تمام کرنا چاہتا ہوں جو آج کی تاریخ کے تذکرے سے مناسبت رکھتا ہے۔

دورِ حاضر میں یہ مسئلہ بہت واضح ہے اور ہر آدمی جانتا ہے۔ آج دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا صاحبِ اختیار، کوئی بڑے سے بڑا حاکم، اس کے سامنے جب کوئی مسئلہ، کوئی مقدمہ آتا ہے اور اس سے گذارش کریں کہ آپ اس معاملہ کو ٹھیک کرا دیں یا اگر آپ مداخلت کریں تو مسئلہ حل ہو جائے گا تو اس کے پاس ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ بیشک میری بھی ایک حیثیت ہے۔ میں صدرِ مملکت ہوں یا میں وزیرِ اعظم ہوں یا بہت بڑا سردار اور بادشاہ ہوں۔ مگر مسئلہ دوسرے ملک کا ہے۔ ایک ملک کا حاکم دوسرے ملک کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ ان کا داخلی معاملہ ہے۔ وہ ان کے اپنے معاملات ہیں ہم سے کیا تعلق ہے یعنی آج دنیا میں یہ بات مسلمات میں ہے اور ہر آدمی جانتا ہے کہ ایک مملکت کے معاملات میں دوسرے ملک کا آدمی دخالت نہیں کیا کرتا ہے اور سب یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کا

داخلی معاملہ ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔

اب اگر کسی انسان پر عتاب نازل ہوتا، اگر زمین کا کوئی مسئلہ ہوتا اور زمین کے کسی آدمی سے گذارش کی جاتی اور وہ اس میں ہاتھ لگاتا اور مسئلہ کو حل کرا دیتا تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی مگر مسئلہ یہاں کا نہیں ہے، مسئلہ آسمانوں کا ہے، معاملہ انسانوں کا نہیں ہے، معاملہ فرشتوں کا ہے۔ آسمان پر رہنے والے فرشتہ پر عتاب ہے تو مسئلہ کو خود آسمان والا طے کرے۔ یہ مسئلہ میں کوئی فرشتہ ہاتھ ڈالے۔ زمین پر رہنے والا انسان آسمان کے مسائل میں کیسے ہاتھ لگائے گا۔ مگر پیغمبرؐ نے گہوارہ حسینؑ تک بھیج دیا اور حسینؑ نے مسئلہ کو حل کر دیا تاکہ ناواقف افراد پہچانیں کہ حسینؑ کے اقتدار کی حدیں زمین تک محدود نہیں ہیں۔ پروردگار عالم نے حسینؑ کو یہاں بھی بولنے کا حق دیا ہے اور وہاں بھی بولنے کا حق دیا ہے۔

یہ ایک جملہ ہے اور دوسرا جملہ جو اس سے زیادہ قیمتی ہے اور اسے یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

ہم میں اور فرشتوں میں ایک فرق ہے ہم گناہ گار ہیں۔ ہم گناہ کرتے ہیں صغیرہ کبیرہ چھوٹے بڑے ہر طرح کے گناہ۔ فرشتہ گناہ نہیں کر سکتا ہے معصوم ہے۔ اب یہ ترک اولیٰ کیا ہوتا ہے اور اس پر کیسے عتاب ہوتا ہے خدا جانے بہر حال یہ گناہ نہیں ہے۔ نہ صغیرہ ہے نہ کبیرہ۔ تو فرشتوں کے یہاں گناہ نہیں ہے ہمارے یہاں گناہ ہے اور دونوں میں فرق ہے کہ جب گناہ ہوتا ہے تو عذاب آتا ہے اور جب گناہ نہیں ہوتا ہے تو عذاب نہیں آسکتا ہے عتاب آسکتا ہے۔ تو ہم پر آج نہیں تو قیامت میں عذاب ہو سکتا ہے۔ فرشتوں پر کبھی عذاب نہیں ہو سکتا ہے صرف عتاب ہو سکتا ہے اس لیے کہ وہ گناہ نہیں کرتے ہیں۔ تو ہمارے لیے، گناہ گاروں کے لیے ہے عذاب۔ ان کے لیے جو گناہ نہیں کرتے ہیں ان کے لیے ہے عتاب۔ عذاب ہوگا آخرت میں، جہنم میں جانے کے بعد۔ وہاں پر اور وہاں پر وہ کسی کے کام آئے گا یا نہیں آئے گا جو یہاں چھوڑ کے گئے ہیں۔ وہاں محشر میں کون کس کے کام آئے گا۔

یہاں کون طے کرے گا کس کو معلوم ہو گا کہ کیا ہونے والا ہے اسی لیے تو بحثیں ہو رہی ہیں کہ کوئی کسی کے کام آئے گا یا نہیں۔ تو عذاب کا مسئلہ ہے قیامت میں وہاں کا حال کسی کو معلوم بھی نہیں ہے مگر عتاب تو یہاں دنیا میں ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ مصلحت قدرت یہ رہی ہو کہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ کوئی انسان اگر عتاب میں یہاں سفارش کر سکتا ہے تو سمجھو کہ جو عتاب میں یہاں سفارش کرے گا وہی وہاں بھی شفاعت کر سکتا ہے۔

دنیا میں عتاب کی سفارش کو مثال بنایا گیا ہے آخرت میں عذاب کی شفاعت کے لیے، اب اس کے بعد بھی اگر کسی کی عقل میں نہ آئے کہ شفاعت کیا ہے اور حق شفاعت کیا ہے اور پروردگار عالم نے یہ حق حسینؑ بن علیؑ کو دیا ہے اس قربانی کے صلے میں جو حسینؑ نے راہِ خدا میں پیش کی ہے۔ وہ قربانی جس کا تذکرہ سال بھر ہوتا رہتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ محرم کے زمانے میں تو اس کوئی علاج نہیں ہے۔ عزیزو! یہی وہ زمانہ ہے جس زمانہ میں حسینؑ بن علیؑ نے راہِ خدا میں اتنی عظیم قربانی پیش کی ہے جس کی مثال نہ اس کے پہلے کی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ اس کے بعد کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

میں نے جہاں سے بیان کو شروع کیا ہے وہ سلسلہ آپ کے ذہن میں رہے۔ اب میں سلسلۂ مصائب میں اسی بات کو مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ جب وہ تاریخ آئی جب حاکم شام کے مرنے کے بعد یزید کو اقتدار ملا اور یزید نے ولید کے نام خط لکھا کہ حسینؑ بن علیؑ کو، عبداللہ بن زبیر کو، عبداللہ بن عمر کو طلب کیا جائے اور ان کے سامنے میری بیعت کا مسئلہ رکھا جائے اور ان سے بیعت لے لی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ یہ یاد رکھنا کہ عبداللہ بن عمر کوئی مسئلہ نہیں ہیں وہ تو بہر حال راستہ پر آجائیں گے اور عبداللہ بن زبیر بھی کوئی مسئلہ نہیں ہیں، مسئلہ اگر ہے تو حسینؑ بن علیؑ کا ہے جن سے بیعت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے، لہٰذا حسینؑ بن علیؑ کے معاملہ پر توجہ دی جائے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ آدھی رات کا وقت تھا تقریباً نصف شب کا وقت جب امام حسینؑ مسجد پیغمبرؐ میں تھے اور عبداللہ بن زبیر بھی مسجد میں موجود تھے کہ ایک مرتبہ حاکمِ مدینہ کا نمائندہ امام حسینؑ کے پاس آیا۔ اب چونکہ میرا موضوع ہے "کردار کو پہچاننا" لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ واقعہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے گذارش کروں تاکہ جو پہلو عام طور سے ذکر مصائب کے ذیل میں نہیں بیان ہوتے ہیں وہ بھی سامنے آئیں تاکہ میرے نوجوان اور میرے بچے ان حقائق سے آشنا ہوں گریہ کب ہوا۔ پہلے ولید نے مروان کو بُلایا۔ مروان کو سب پہچانتے ہیں اس کو بُلانے کے بعد کہا کہ حاکمِ شام یعنی یزید بن معاویہ کی طرف سے یہ پیغام آیا ہے کہ ان افراد کو بُلایا جائے اور ان سے بیعت طلب کی جائے آپ کا کیا خیال ہے۔

مروان کے بارے میں تاریخ میں یہ چار باتیں پائی جاتی ہیں:

ایک تو یہ کہ مروان میں اور ولید میں پہلے جھگڑا چل رہا تھا آپس میں کسی مسئلہ پر اختلاف چل رہا تھا۔ مروان نے دیکھا کہ یہ بہترین موقع ہے ولید سے انتقام لینے کا۔

دوسرا مسئلہ جو مروان کے سامنے ہے کہ مروان اگرچہ اسی خاندان سے ہے مگر وہ یزید کی خلافت سے ناراض ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ معاویہ کے بعد پورے خاندان میں سب سے بزرگ اور سینئر تو میں ہوں میرے ہوتے ہوئے اس نوجوان کو خلیفہ کیسے بنادیا گیا لہٰذا کوئی ایسا کام ہونا چاہیے کہ یزید دنیا میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جائے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مروان اگرچہ خاندان بنی امیہ کا ہے مگر معاویہ سے بھی راضی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ معاویہ نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے جلسے کر کے، اجتماعات کر کے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنا کے مسلمانوں سے بیعت لے لی ہے اور میری بزرگی کا کوئی خیال نہیں کیا ہے لہٰذا اس کے ذہن میں یہ بھی ہے کہ معاویہ سے بھی بدلہ لے لیا جائے کہ معاویہ نے جو یہ چاہا ہے کہ خاندان میں اور اس کی نسل میں خلافت چلی جائے وہ نہ چلنے پائے اور

اس کا راستہ میں جانتا ہوں۔ مروان دشمنِ ولید بھی ہے، دشمنِ یزید بھی ہے، دشمنِ معاویہ بھی ہے اور دشمنِ حسینؑ بن علیؑ تو ہونا ہی چاہیے کہ مروان کا باپ حکم ہے جس کے بارے میں پیغمبرِ اسلام نے یہ فرمایا تھا کہ اس کو مدینہ سے نکال دیا جائے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ بھی ملعون ہے اور جو بھی اس کی نسل میں آنے والا ہے وہ بھی ملعون ہے یعنی پیغمبرؐ نے اپنی حیات میں باپ اور بیٹے دونوں کے ملعون ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور امام حسینؑ نبیؐ ہی کے نواسے کا نام ہے لہٰذا روحِ پیغمبرؐ سے انتقام لینے کا وقت بھی یہی ہے۔

اب جو ولید نے اس مسئلہ کو رکھا تو مروان نے کہا کہ بہت آسان سی بات ہے۔ صبح کا انتظار نہ کرو اس لیے کہ اگر رات بھر میں کہیں یہ خبر نشر ہو گئی کہ حاکم نے انتقال کیا ہے تو ملک میں بغاوت ہو سکتی ہے۔ آپ کی حکومت کو کون مانے گا یا یزید کی حکومت کا کون اقرار کرے گا۔ لہٰذا قبل اس کے کہ خبرِ مرگِ معاویہ عام ہو۔ یزید کی بیعت لے لی جائے اور اگر اتنے بڑے بڑے لوگ بیعت کر لیں گے تو مسئلہ خود ہی ختم ہو جائے گا اس لیے کہ یہی خلافت کے دعویدار ہو سکتے ہیں لہٰذا ابھی ابھی ان سب کو طلب کیا جائے اور اگر بیعت نہ کریں تو راتوں رات ان کا گلا کاٹ دیا دیا جائے اس لیے کہ رات کے وقت کوئی ان کے ساتھ بھی نہیں ہوگا۔ خبر بھی عام نہ ہونے پائے گی اور خبرِ مرگِ معاویہ عام ہونے سے پہلے حسینؑ یا بیعت کریں گے یا قتل ہو جائیں گے اور قتل ہونے کے بعد صبح کو کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ کس نے کس کو مارا۔

ولید نے کہا کہ مطلب؟ یعنی میں حسینؑ کو بلاؤں قتل کرنے کے لیے؟

کہا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ یزید کی حکومت تسلیم ہو جائے تو اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ حسینؑ کو بلا کے شب کے پردے میں رات کے اندھیرے میں قتل کر دیا جائے۔

رکھنا کہ کوئی انسان اس عالم میں خدا کے سامنے جائے گا کہ اس کے ہاتھ خونِ حسینؑ سے رنگین ہوں تو "خسر الدنیا و الآخرۃ" نہ دنیا میں کچھ ہاتھ آنے والا ہے اور نہ آخرت میں ہاتھ آنے والا ہے۔ حسینؑ سردار جوانانِ جنّت ہیں۔ حسینؑ سے لڑکے سوائے جہنم میں جانے کے کیا راستہ ہوگا۔ تو مجھے جہنّم میں ڈالنا چاہتا ہے؟

کہا پھر اب سرانجام پہچان لو۔ مگر تم کو نیک مشورہ دے رہا ہوں۔ پھر اتنا اصرار کیا کہ اس نے آخر میں اپنا نمائندہ بھیج دیا۔ اب مسجدِ پیغمبرؐ میں آنے والے نے خبر پہونچائی۔ ابن زبیر نے کہا کہ فرزندِ رسولؐ! یہ وقت دربار کا نہیں ہے۔ یہ آدھی رات کے وقت بُلانا اس کے معنی ہیں کہ کوئی خطرہ ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ آپ جائیں اور بہتر یہ ہے کہ آپ مدینہ چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔

فرزندِ رسولؐ نے کہا کہ یہی وقت ہے۔ میں جاؤں گا اور حالات کا مقابلہ کروں گا۔ میں کوئی بزدل نہیں ہوں۔ حیدرِ کرار کا بیٹا ہوں، میں حالات کا مقابلہ کروں گا۔ مجھے اس کی نیت بھی معلوم ہے لہٰذا پوری تیاری کے ساتھ جاؤں گا۔

روایت میں یہ فقرہ ہے کہ آئے بیت الشرف میں اور آکے اعلان فرمایا۔ ہاشمی جوانو! اٹھو، اسلحے اٹھاؤ تیار ہو جاؤ اور مسلح ہو کر میرے ساتھ چلو۔

تیس ہاشمی جوان مسلح امام حسینؑ کے ساتھ چلے اور آئے دارالامارہ کے دروازہ پر آپ نے سب کو روک دیا۔ فرمایا کہ مجھے بُلایا گیا ہے میں جاؤں گا۔ تم ٹھہرو اگر تمھیں بُلاؤں یا میری آواز بلند ہو جائے تو میری آواز کے بلند ہونے کو اجازت سمجھنا اور سب دربار میں داخل ہو جانا۔

حسینؑ بن علیؑ بیت الشرف سے چلے اور دارالامارہ میں داخل ہوئے اور ہاشمی جوانوں کو دروازہ پر روک دیا۔

دربار میں داخل ہو کر امام حسینؑ نے جب دیکھا کہ مروان اور ولید دونوں بیٹھے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ یہ منظر دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ کم از کم دو مسلمان ایک جگہ متحد تو ہو گئے، یعنی یہ ایک اشارہ ہے کہ تم دونوں کے آپس کے اختلافات مجھے

معلوم ہیں مگر کوئی ایسا مسئلہ درمیان میں آگیا ہے کہ تم جیسے لوگ لڑنے والے، فساد کرنے والے بھی متحد ہو گئے ہیں۔ یہ تو میں آج عجب منظر دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں ایک جگہ بیٹھے ہو خیریت تو ہے؟

ولید نے کہا کہ ہاں، بڑی عجیب و غریب خبر ہے اور بڑی منحوس خبر ہے اور بڑی سنگین خبر ہے۔

فرمایا کیا ہوا؟

کہا کہ شام کے حاکم نے انتقال کیا ہے اور یقیناً اس کا آپ کو افسوس ہوگا۔

امام حسینؑ نے کہا پھر مجھے کیوں بُلایا گیا ہے؟

کہا اس لیے کہ یزید حاکم ہو گیا ہے اور یزید نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا جائے۔

امام حسینؑ نے کہا کہ یہ بیعت کا کون سا وقت ہے اور یہ مسئلہ بیعت کے طے کرنے کا کون سا وقت ہے۔ آدھی رات کے وقت میں جانتا ہوں کہ حاکم تمھارا میری خفیہ بیعت پر راضی نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ کل دن میں پھر اجلاس بلانا۔ تمام لوگ اکٹھا ہوں گے۔ وہاں گفتگو ہوگی تاکہ یہ طے ہو کہ "اَیُّنَا اَحَقُّ لِلْخِلَافَةِ" خلافت اور بیعت کا واقعی حقدار کون ہے۔ کسے بیعت کرنی چاہیے اور کس کے ہاتھ پر بیعت ہونی چاہیے؟ یہ کل دن میں طے ہوگا۔

ولید نے کہا کہ آپ کی گفتگو بہت معقول ہے، آپ تشریف لے جائیں۔

جیسے ہی امام حسینؑ نے اُٹھنے کا ارادہ کیا، مروان نے کہا کہ ولید رات کے وقت حسینؑ اکیلے مل گئے ہیں اب ان کو بچ کے نکلنے نہ دے ورنہ خون کی ندیاں بہ جائیں گی مگر حسینؑ ہاتھ نہیں آئیں گے۔ بہترین موقع ہے یا یہ بیعت کریں یا انھیں قتل کردے۔

بس یہ سُننا تھا کہ فرزندِ حیدرِ کرّار کو جلال آگیا "اَنْتَ تُهَدِّدُنِیْ بِالْقَتْلِ یَابْنَ الزَّرْقَاءِ" او زنِ نیلگوں چشم کے بچے! تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے کون مجھ قتل

کرے گا۔ "أأنت تقتلني أم هو" تو قتل کرے گا یا یہ۔ کس کی مجال ہے؟

ولید نے کہا، نہیں فرزندِ رسولؐ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اپنے ہاتھ کو آپ کے خون سے رنگین نہیں کرسکتا ہوں، میں اپنی عاقبت خراب نہیں کرسکتا آپ تشریف لے جائیں۔

امام حسینؑ اُٹھ کر چلے گئے۔

یہ واقعہ آپ کا بار بار کا سُنا ہے، مگر اس واقعہ کا جو تتمہ ہے اس کو سُنا کے مصائب کے چند کلمے گذارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرا سلسلۂ بیان مکمل ہو جائے۔

امام حسینؑ بیت الشرف میں واپس آئے۔ صبح کے وقت جب امام حسینؑ گھر سے باہر نکلے تو مدینہ کی گلی میں مروان سے ملاقات ہو گئی۔ جیسے ہی مروان سے ملاقات ہوئی مروان نے پہلا جملہ کہا۔

حسینؑ! رات آپ نے بہت نا عاقبت اندیشی سے کام لیا اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رات میں آپ نے بڑی ناتجربہ کاری کا فیصلہ کیا۔ بہترین موقع تھا کہ چُپکے سے رات کے اندھیرے میں یزید کی بیعت کرلیتے تمام خطرات سے نجات مل جاتی، یزید بھی خوش ہو جاتا کہ حسینؑ نے بیعت کرلی ہے اور جتنے انعامات چاہتے آپ کو مل جاتے۔ آپ نے تو ایسی گفتگو کی کہ جیسے آپ کے پاس سارے زمانہ کا تجربہ ہے۔

امام حسینؑ نے فرمایا، تو مجھ سے کیا کہہ رہا ہے، کس کی بیعت کے بارے میں؟

کہا، یزید کی بیعت کے بارے میں کہتا ہوں۔ برملا کہہ رہا ہوں، اب بھی غنیمت ہے بیعت کرلیجئے۔

رات کے وقت امام حسینؑ نے کہا تھا کہ تیرا حاکم میری خفیہ بیعت پر راضی نہیں ہوگا لہٰذا فیصلہ دربار میں ہونا چاہئے۔

اب جو مروان نے مصلحت بتانا شروع کی اور سمجھانا شروع کیا تو فرزندِ رسولؐ نے کہا "علی الاسلام بعده السلام اذ قد بليت الامة براعٍ مثل يزيد"

کون یزید؟ "شَارِبُ الْخُمُوْرِ لَاعِبُ الْقُمَارِ" ایسا حاکم جو شراب پینے والا، جُوا کھیلنے والا، بندر نچانے والا، محرم عورتوں سے بدکاری کرنے والا۔ ایسا انسان اسلام کا حاکم ہو جائے تو ایسے اسلام پر دور سے سلام۔ اور اے مروان! میرا فیصلہ سُن لے "مِثْلِیْ لَا یُبَایِعُ مِثْلَهٗ اَنَا اَهْلُ بَیْتِ النُّبُوَّةِ" ہم اہلبیتِ نبوت ہیں۔ "مَعْدَنُ الرِّسَالَةِ" ہم رسالت کا معدن ہیں۔ "مِثْلِیْ لَا یُبَایِعُ مِثْلَهٗ" مجھ جیسا بلند کردار انسان خانوادۂ نبوت کی جان، پیغمبرؐ کا بیٹا اور ایسے فاسق و فاجر کی بیعت کر لے یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اب میں اعلان کر رہا ہوں کہ اب دوبارہ کسی جلسہ کی ضرورت نہیں ہے میرا اعلان سُن لے۔

میرا بیان شروع سے ذہن میں رکھیے گا میں کڑیاں ملانا چاہتا ہوں اور میرا بیان مکمل ہو جائے گا۔ ایسا حاکم اگر اُمت کے سر پر مسلط ہو جائے تو ایسے اسلام پر دور سے سلام، اسلام کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں بیعت نہیں کر سکتا۔

مروان نے پھر سمجھانا چاہا۔ کہا حسینؑ میں پھر کہتا ہوں سمجھ لو انجام بہت بُرا ہوگا زندہ نہ رہ سکو گے۔ قتل کر دیئے جاؤ گے۔ فنا ہو جاؤ گے۔ اب بھی غنیمت ہے بیعت کر لو۔

بس یہ سُننا تھا کہ فرزندِ رسولؐ کو جلال آگیا فرمایا۔ دور ہو جا میرے پاس سے، چلا جا، میں تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ تو رِجس ہے اور مرکزِ نجس ہے، تو ہمیں نہیں پہچانتا ہے، تو اپنے کو پہچان لے تو رِجس ہے، نجس ہے اور ہم وہ ہیں کہ جن کی شان میں آیتِ تطہیر نازل ہوئی ہے۔ "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ" رِجس اہلبیتؑ کے قریب نہیں آ سکتا۔ تو ہم سے دور ہو جا اس لیے کہ تو رِجس ہے اور ہم اہلبیتؑ ہیں۔

اب آپ کو اندازہ ہوا کہ رِجس گناہوں کا نام نہیں ہے، رِجس تنہا بُرائیوں کا نام نہیں ہے، رِجس تنہا خباثتوں کا نام نہیں ہے، رِجس تنہا بُرے اعمال کا نام نہیں ہے ایسے افراد جو مجسمۂ رِجس بن جائیں یہ کبھی کبھی اہلبیتؑ کے قریب نہیں آ سکتے ہیں۔

آج جو دنیا اہلبیتؑ سے دور ہٹ رہی ہے۔ یہ الگ ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ یہ سب رِجس ہیں اور رِجس کبھی اہلبیتؑ کے قریب نہیں آسکتا ہے اگر رِجس سے بچنا ہو تو اہلِ بیتؑ کے قریب آجاؤ۔

بس یہی سلسلۂ کلام ہے کہ حسینؑ آیاتِ قرآن میں مرکزِ تطہیر ہیں جس کو خود حسینؑ نے واضح کر دیا ہے۔ الگ ہٹ جا، میرے قریب سے چلا جا اس لیے کہ رِجس میرے قریب نہیں آسکتا ہے اور اس کے بعد جو نتیجہ سامنے آیا اس کے بعد یہ طے ہو گیا کہ اب یہ مدینہ حسینؑ کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔

بس اربابِ عزا! میں چاہتا تھا کہ واقعہ کی تفصیل میرے تمام سننے والوں کے سامنے آجائے تاکہ واقعہ کے خصوصیات اور کردار پہچان لیے جائیں۔ اس کے بعد جب کل میں یزید کے بارے میں گذارش کروں گا تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کیا کردار ہے اور اس کا کیا مقابلہ ہے فرزندِ رسول الثقلینؐ سے۔

بہرحال امام حسینؑ جب دربار کی طرف چلے تو تیس مسلح جوان آپ کے ساتھ تھے۔ اودھر شہزادی زینبؑ نے آواز دی۔ بھیا عباسؑ آقا جا رہے ہیں۔ علی اکبرؑ مولا جا رہے ہیں۔ عون و محمدؑ، بنی ہاشم کے جوانو جاؤ آقا کے ساتھ جاؤ۔ خبردار آقا کو کوئی تکلیف نہ پہونچنے پائے۔ ہاشمی جوان رُکے ہوئے ہیں جیسے ہی امامؑ کی آواز بلند ہوئی ویسے ہی ہاشمی جوان دربار میں داخل ہو گئے۔ آگے آگے تلوار لیے ہوئے عباس علمدارؑ۔ آقا! کس نے گستاخی کی۔ مولا! کس نے گستاخی کی۔ کس نے کیا کہہ دیا کہ آپ کو جلال آگیا۔

کہا بھیا رک جاؤ، عباسؑ یہ تلوار چلانے کا وقت نہیں ہے۔

حسینؑ پلٹ کے آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب بیت الشرف میں قدم رکھا تو جیسے بہن بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔ کہا بھیا خیر تو ہے؟

کہا نہیں اب یہ مدینہ رہنے کے قابل نہیں رہ گیا ہے۔ اب سامانِ سفر تیار کرو۔ اب وطن چھوڑنا پڑے گا۔

اربابِ عزا! جی چاہتا ہے کہ دست ادب جوڑ کر گذارش کروں۔ شہزادی آج

جب بھائی دربار میں جارہا تھا تو آپ نے اتنے جوانانِ بنی ہاشم کو ساتھ کر دیا تھا، اپنے شیروں کو ساتھ کر دیا تھا جو دربار سے سلامتی کے ساتھ مولاؑ کو واپس لائے مگر شہزادی کل کربلا میں عصر کے ہنگام جب بھائی مقتل میں جائے گا تو کسے ساتھ بھیجیں گی۔

نہ قاسم نہ علی اکبر رہے نہ عباس

بہن سامانِ سفر تیار کرو۔

زینبؑ سامانِ سفر کی تیاری میں مصروف ہوئیں۔ فرزند رسول الثقلینؐ آئے نانا کی قبر کے قریب۔

علمائے اسلام نے اس فقرہ کو نقل کیا ہے کہ نانا کی قبر سے لپٹ کے حسینؑ نے رونا شروع کیا۔ روتے روتے ایک مرتبہ آنکھ بند ہوگئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے نبیؐ سامنے آگئے ہیں۔

حسینؑ کہتے ہیں نانا! آپ تو دیکھ رہے ہیں کہ اُمت نے کیا سلوک کیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ قوم نے کیا سلوک کیا ہے اب یہ مدینہ میں رہنے بھی نہیں دیتے ہیں۔ نانا کیا یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے اپنے پاس بُلالیں۔

کہا بیٹا اگر میں تمھیں اپنے پاس بُلالوں تو کربلا کون جائے گا۔ قربانی کون دے گا۔

حسینؑ اگر تم قربان نہ ہوگے تو میرا دین کیسے بچے گا؟

کہا نانا آپ کا حکم بجالاتا ہوں۔

کہا ہاں میرے لال جاؤ۔ کربلا جاؤ۔ مگر بیٹا تنہا نہ جانا، شہزادیوں کو ساتھ لے کر جانا۔

وہاں سے رخصت ہوئے بھائی کی قبر پر آئے۔ بھائی سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد ماں کی لحد پر آئے۔ آکے آواز دی اماں! اپنے لال کا آخری سلام لے لو۔ آپ کا حسینؑ آپ سے رخصت ہونے کے لیے آیا ہے۔ یہ ساری منزلیں طے ہوئیں

رات تمام ہوئی۔ شہزادی نے سامان سفر تیار کیا۔

عبداللہ بن سنان کوفی کہتا ہے کہ میں اسی دن مدینہ وارد ہوا جس دن نواسۂ رسولؐ وطن سے رخصت ہو رہا تھا میں نے یہ منظر دیکھا کہ در و دیوار پر اُداسی کا عالم ہے۔ جس چہرہ کو دیکھو اُداس۔ جس انسان کو دیکھو پریشان۔ میں نے گھبرا کے پوچھا بھائیو کیا عالم تمہارا ہے۔ کہا تمہیں معلوم نہیں کہ نبی کا نواسہ وطن چھوڑ کر جارہا ہے۔ مدینۂ رسولؐ ویران ہو رہا ہے۔ جانِ مدینہ رخصت ہو رہا ہے۔

عبداللہ کہتا ہے کہ میں نے کہا ذرا بتاؤ کہ حسینؑ کا درِ دولت کہاں ہے، میں چل کے دیکھوں گا کہ نبیؐ کا لال کیسے رخصت ہوتا ہے۔ مدینہ والے جانِ مدینہ کو کیسے رخصت کرتے ہیں۔

عبداللہ درِ دولت کے قریب آیا۔ دیکھا کہ ہاشمی جوان تیاریوں میں مصروف ہیں، کچھ ناقے لا کے بٹھائے گئے، ان پر سامانِ سفر بار کیا گیا۔ جب یہ ناقے آگے بڑھ گئے تو وہ ناقے آئے جن پر محملیں ہیں، عماریاں ہیں، کجاوے ہیں، پردہ کا اہتمام و انتظام ہے۔

عبداللہ کہتا ہے کہ میں نے محسوس کیا کہ جیسے درِ دولت پہ لا کے ایک ناقہ بٹھایا گیا۔ ایک معظمہ چادر اوڑھے ہوئے بیت الشرف سے برآمد ہوئیں۔ ناقہ کے قریب آئیں۔ ایک کمسن بچہ آگے بڑھا۔ پردہ محمل کو اُٹھایا معظمہ سوار ہوئیں۔ میں نے پوچھا یہ بچہ کون تھا، اور یہ سوار ہونے والی بی بی کون ہیں؟ کہا کہ یہ یتیمِ حسنؑ قاسم ہے، وہ قاسمؑ کی ماں اُمّ فروہ۔

یہ ناقہ آگے بڑھا۔ ایک دوسرا ناقہ لا کے بٹھایا گیا۔ ایک معظمہ بیت الشرف سے چلیں۔ ایک کڑیل جوان آگے بڑھا۔ پردہ محمل اُٹھایا معظمہ کو سوار کیا۔ میں نے نے پوچھا یہ کون؟ کہا علی اکبرؑ سوار کرنے والے، لیلیٰ سوار ہونے والی۔

اس کے بعد عجیب منظر میں نے دیکھا کہ اب جو ناقہ لا کے بٹھایا گیا اور ایک معظمہ بیت الشرف سے برآمد ہوئیں تو وہ بچہ بھی آگے بڑھا، وہ جوان بھی آگے بڑھا اور ایک جوان اور بھی آگے بڑھا اور بڑے اہتمام کے ساتھ معظمہ کو ناقہ پر بٹھایا گیا۔

میں نے کہا یہ کون؟

کہا علیؑ کی چھوٹی بیٹی اُمِّ کلثومؑ۔

عزیزو! حسینؑ وطن چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ عجب منظر ہے عبداللہ کہتا ہے کہ اب تک میں نے دیکھا کہ ہاشمی جوان تیاریوں میں مصروف ہیں اور سیدانیاں سوار ہو رہی ہیں اور امام حسینؑ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے انتظامات کا جائزہ لے رہے ہیں لیکن ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ اب جو ایک ناقہ لا کے بٹھایا گیا تو حسینؑ کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک جوان نے آگے بڑھ کر پردہ محمل اُٹھایا۔ کڑیل جوان نے نعلین سیدھی کی۔ میں نے پوچھا یہ کون؟ کہا زہراؑ کی بڑی بیٹی زینبؑ سوار ہو رہی ہیں۔

عزادارو! یہ ۲۸ رجب کا مدینہ تھا مگر گیارہویں محرم کو کربلا میں نہ قاسمؑ ہیں نہ علی اکبرؑ ہیں نہ عباسؑ اور زینبؑ۔ بیبیاں سوار ہو گئیں۔ بیمار بھتیجے کو شہزادی نے سوار کر دیا۔ ماں کی کنیز فضہ کو بھی سوار کر دیا۔ اب ایک زینبؑ رہ گئی کبھی پشتِ ناقہ کی بلندی کو دیکھتی ہے، کبھی اپنی بے کسی کو دیکھتی ہے۔ ہائے مجھے کون سوار کرائے گا ایک مرتبہ مقتل کا رُخ کیا مگر روایت کا فقرہ ہے کہ حسینؑ کو نہیں بُلایا، علی اکبر کو نہیں پکارا، اپنے عونؑ و محمدؑ کو آواز نہیں دی بلکہ فرات کا رُخ کیا۔ آواز دی "اخی ابا الفضل" اے بھیا عباسؑ! جب میں مدینہ سے چلی تھی تو تم نے مجھے سوار کرایا تھا اب زینبؑ سوار ہونا چاہتی ہے۔ بھیا آؤ عباس آ کے زینب کو سوار کراؤ۔ بھیا سہارا دو کہ زینبؑ سوار ہو جائے۔ مگر عزیزو! کون آتا۔ بازو تھامنے والا شانے کٹائے فرات کے کنارے سو رہا تھا۔ واعباساہ، واحسیناہ

سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُونَ۔

مجلس ۲

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ
الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ
مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ
وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ ۔
اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفس مطمئن! اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ آ۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

سورۂ مبارکہ فجر کی ان آخری آیات کے ذیل میں "کربلا شناسی" کے عنوان سے جو سلسلۂ بیان کل شروع ہوا ہے آج اس کے دوسرے مرحلہ پر تصویر کا دوسرا رُخ آپ کے سامنے رکھنا ہے۔

کل میں نے یہ عرض کیا تھا کہ واقعۂ کربلا کے سلسلے میں دو نمایاں افراد یا دو نمایاں کردار ہیں جن سے اس واقعہ کی حقیقت کو پہچانا جا سکتا ہے۔

ایک کردار فرزند رسول الثقلینؐ امام حسینؑ کا ہے اور ایک کردار یزیدؔ بن معاویہؔ بن ابی سفیان کا ہے۔

امام حسینؑ کے بارے میں کل میں نے کچھ باتیں آپ کے سامنے گذارش کی تھیں، آج تصویر کا دوسرا رُخ یعنی یزیدؔ کے کردار کے بارے میں ان نظریات اور

خیالات کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے جو دورِ قدیم سے عالم اسلام میں پائے جا رہے ہیں۔

لیکن سلسلۂ بیان کو آگے بڑھانے سے پہلے کل کی گفتگو کو مکمل کرتے ہوئے سرکار دو عالمؐ کے ایک ارشاد گرامی کا مزید حوالہ دینا ہے تاکہ امام حسینؑ کی شخصیت کا یہ پہلو بھی آپ کے سامنے نمایاں ہو جائے۔

امام حسینؑ کا بچپنا ہے سرکار دو عالمؐ مسجد میں موعظہ فرما رہے ہیں۔ صاحب ینابیع المودہ نقل کرتے ہیں کہ اس درمیان میں پیغمبرؐ کا چھوٹا نواسہ مسجد النبیؐ میں داخل ہوا اور اتفاقاً ان کے بیان کے مطابق پیر دامن سے اُلجھ گیا اور حسینؑ خاک پر گرنے لگے۔ پیغمبرؐ نے اپنے کلام کو روک دیا خطبہ کو قطع کر کے منبر سے نیچے تشریف لائے۔ اپنے شہزادے کو گودی میں اُٹھایا اور منبر پر آنے کے بعد فرمایا۔ "اَیُّھَا النَّاسُ ھٰذَا الحُسَینُ فَاعْرِفُوْہُ" لوگو! یہ حسینؑ ہے اسے پہچانو۔ "وَفَضِّلُوْہُ" اور اس کی فضیلت کا اقرار کرو۔ "وَانْصُرُوْہُ" اور وقت پڑ جائے تو اس کی مدد کرنا۔

اور اگر پہچاننا چاہتے ہو تو میں پہچنوانا چاہتا ہوں کہ یہ حسین کون ہے۔ یہ کہہ کر سرکار دو عالمؐ نے فرمایا:

اس حسینؑ کو پہچانو، یہ حسینؑ وہ ہے کہ جس کا جدّ افضل ہے جدّ یوسف بن یعقوب سے۔ "ھٰذَا الحُسَینُ جَدُّہٗ فِی الجَنَّۃِ" یہ حسینؑ وہ ہے جس کا جدّ جنت میں ہے۔ "وَجَدَّتُہٗ فِی الجَنَّۃِ" یہ حسینؑ وہ ہے جس کی دادی بھی جنتی ہے۔ "وَعَمَّتُہٗ فِی الجَنَّۃِ" اور اس کی پھوپھی بھی جنتی ہے۔ "وَخَالُہٗ فِی الجَنَّۃِ" اس کا ماموں بھی جنتی ہے۔ "وَاَبُوْہُ فِی الجَنَّۃِ" اس کا باپ بھی جنتی ہے۔ "وَاُمُّہٗ فِی الجَنَّۃِ" اس کی ماں بھی جنتی ہے۔ "وَمُحِبُّہٗ فِی الجَنَّۃِ" اس کا چاہنے والا بھی جنتی ہے" وَمُحِبُّ مُحِبِّیْہِ فِی الجَنَّۃِ" اور اس کے چاہنے والوں کے چاہنے والے بھی جنتی ہیں۔

سرکارِ دو عالم کا یہ ارشاد گرامی ینابیع المودہ کے حوالے سے جو میں نے پیش کیا ہے وہ صرف اس لیے تاکہ یہ رُخ بھی آپ کی نگاہ میں رہے کہ اب تک ہم نے

امام حسینؑ کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اب تک امام حسینؑ کی عظمت کو سرکارِ دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کی روشنی میں دیکھا ہے۔ عظمتِ حسینؑ کو ان کے ذاتی سیرت و کردار کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اب میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ کے اگر اضافی کمالات کو بھی دیکھیں تو کوئی رشتہ ایسا نہیں ہے جو کمال سے خالی ہو۔ کوئی نسبت ایسی نہیں ہے جو کمال سے خالی ہو۔

میں اپنی زبان میں اس کے بارے میں گذارش کر دوں تاکہ دوسرا رُخ پہچاننے میں آپ کو آسانی ہو جائے۔

حسینؑ کا دادا وہ جو محسنِ اسلام، مربّیٔ پیغمبرِ اسلام۔ جس نے اس وقت پیغمبرؐ کا ساتھ دیا ہے جب کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ ایسے موقع پر جب نبیؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا اور کفار کی طرف سے سرکارؐ کو جادوگر کہا جا رہا تھا۔ سرکارؐ کو دیوانہ کہا جا رہا تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو نبیؐ کو سہارا دینے والا ہوتا۔ تو وہ تنہا حسینؑ کا دادا ہی تھا جس نے نبیؐ کو مخاطب کر کے کہا تھا "قُمْ یَا سَیِّدِیْ" اے میرے سردار اُٹھو، اعلان کرو جب تک میں زندہ ہوں۔ کس کی مجال جو نظر اٹھا کے دیکھ سکے۔ یہ کون ہیں یہ ابوطالبؑ ہیں جو حسینؑ بن علیؑ کے دادا ہیں۔ اس کے بعد اگر حسینؑ کی جدہ ماجدہ اور ان کی دادی کو دیکھنا ہے تو وہ جناب فاطمہؑ بنت اسد ہیں کہ جن کے بارے میں تاریخ اسلام کا مسلّمہ ہے کہ نہ بنت اسد سے پہلے اور نہ بنت اسد کے بعد کوئی خاتون ایسی نہیں پیدا ہوئی ہے جس کی آمد پر خانۂ خدا کی دیوار میں در بنا ہو یہ انفرادی کردار ہے جناب فاطمہؑ بنت اسد کا۔ اور حسینؑ کے نانا کو اگر دیکھنا ہے تو حسینؑ کا نانا وہ کائنات کا سب سے بلند ترین انسان ہے جس کی مثال نہ انبیاء میں ہے نہ مرسلین میں ہے۔ نہ زمین والوں میں ہے نہ آسمان والوں میں ہے۔ اللہ نے اسے سیدالانبیاء بنایا، افضل المرسلین بنایا۔ اس کی جوتیاں شبِ معراج عرشِ اعظم تک پہونچیں۔

اور حسینؑ کی جدّہ ماجدہ حسینؑ کی نانی وہ خدیجۃ الکبریٰ ام ہیں جو اسلام میں پہلی مومنہ خاتون ہیں کہ جن سے پہلے کوئی ایمان لانے والا کم از کم عورتوں میں تو نہیں تھا

اگرچہ مردوں میں بھی نہیں تھا۔ لیکن جو تفریق عالم اسلام میں قائم ہوئی ہے تو کم از کم اتنی بات تو واضح ہے کہ حسینؑ کی جدۂ ماجدہ یعنی ان کی نانی جناب خدیجہؑ سے پہلے ایمان لانے والا سارے عالم میں کوئی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب خدیجہؑ کے بعد جب بزمِ ازواج میں سرکار دو عالمؐ نے خدیجہؑ کا ذکر کیا اور کسی نے یہ گذارش کی کہ حضور اب تو ان کا انتقال ہو چکا ہے، وہ دنیا سے جا چکی ہیں اور ہر شوہر کو حق ہے کہ اپنی مرحومہ زوجہ کو یاد کرے، مگر اس وقت تک جب تک دوسری زوجہ گھر میں نہ آجائے۔ پروردگار عالم نے آپ کو ایسی ایسی ازواج مطہرات عنایت کر دی ہیں تو ایک مر جانے والی ضعیفہ کو یاد کرنے سے کیا فائدہ؟

پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے، میں زوجہ کو نہیں یاد کر رہا ہوں۔ میں مرنے والی زوجہ کو نہیں یاد کر رہا ہوں، میں خدیجہؑ کو یاد کر رہا ہوں۔ اور خدیجہ کا امتیاز یہ ہے کہ " آمَنَتْ بِیْ اِذْ کَفَرَ النَّاسُ " خدیجہؑ اس وقت ایمان لائیں جب سب کافر تھے۔ اب "سب" میں جتنی معنویت پائی جاتی ہو وہ تو پیغمبر اسلام جانتے ہیں۔ یا اس مخاطب کو معلوم ہو گا جس سے پیغمبرؐ نے کہا تھا۔ یہ حسینؑ کی نانی کا کردار ہے۔

حسینؑ کی مادر گرامی جن کے بارے میں پیغمبرؐ نے اعلان کیا ہے " فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِنِّیْ " فاطمہؑ میرا ایک ٹکڑا ہے۔ جس کے بارے میں نبیؐ نے اعلان کیا " اِنَّ اللّٰہَ یَرْضیٰ بِرِضَا فَاطِمَۃَ وَیَغْضِبُ بِغَضَبِ فَاطِمَۃَ " اللہ فاطمہؑ کی رضا سے راضی ہوتا ہے اور فاطمہؑ کے غضب ناک ہونے سے غضب ناک ہوتا ہے جس کے پدر بزرگوار وہ علی بن ابی طالبؑ، وہ تاریخ کی واحد شخصیت ہے۔ تاریخ کا اکیلا کردار ہے جس کے واسطے پروردگار نے بیت العبادہ کو بیت الولادہ بنا دیا اور جس کے لیے خانۂ خدا زچہ خانہ بنایا گیا۔ حسینؑ کا بھائی وہ جس کے بارے میں پیغمبرؐ نے اعلان کیا کہ حسنؑ و حسینؑ دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ حسینؑ کی اولاد کو اگر دیکھیں گے تو ایک کے بعد ایک جو آتا ہے وہ امام وقت ہوتا ہے، وہ قائم امت ہوتا ہے، وہ اسلام

کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ دین کا محافظ ہوتا ہے، وہ قرآن کا مفسر ہوتا ہے۔ حسینؑ کی پوری نسل ائمہ طاہرینؑ کی نسل ہے تو حسینؑ کے جس رشتہ کو دیکھا دادی کو دیکھا، دادا کو دیکھا، نانی کو دیکھا، نانا کو دیکھا، باپ کو دیکھا، ماں کو دیکھا، بھائی کو دیکھا، بہن کو دیکھا، اولاد کو دیکھا۔ ہر رشتہ حسینؑ کا طیب و طاہر، پاک و پاکیزہ، صادق و صدیق۔ ہر رشتہ حسینؑ کا دنیا سے بلند تر رشتہ ہے۔

اس کے مقابلہ میں جب تصویر کا دوسرا رُخ آتا ہے تو جو حسینؑ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ جو حسینؑ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ دادا کون ؟ ابو سفیان جس کے بارے میں مورخین نے واضح لفظوں میں نقل کیا ہے کہ جب خلافت تیسری منزل پر بنی اُمیّہ کے گھر میں پہونچی تو ابو سفیان اپنے چشم و چراغ، اپنے خاندان کی یادگار کو مبارکباد دینے کے لیے آیا اور آنے کے بعد کہتا ہے کہ بیٹا بڑی مشکل سے یہ خلافت گھر میں آئی ہے۔ بڑے دنوں کے بعد یہ خلافت اس خاندان میں آئی ہے۔ یہ ابو سفیان کے الفاظ تاریخ میں ہیں " اَدْرِهَا کَالْکُرَةِ " اب اس خلافت کو گیند کی طرح نچاؤ۔ مگر جب خلافت ناچنے لگے تو محور کا خیال رکھنا، مرکز کا خیال رکھنا، مرکز بنی امیہ کو قرار دینا اور اس کو ایک گیند سمجھ کر نچاتے رہو اور دیکھو اگر حکومت کرنا ہے، اگر خلافت کرنا ہے، اگر خاندانی کردار کو باقی رکھنا ہے تو خبردار یہ نہ دیکھنا کہ انجام کیا ہونے والا ہے، عاقبت کیا ہونے والی ہے۔ اس خلافت کو گیند کی طرح نچاتے رہو، اپنے خاندان کو مرکز بنائے رہو۔ یہ یاد رکھو " فَمَا هُنَاكَ جَنَّةٌ وَلَا نَارٌ " نہ جنت کوئی چیز ہے نہ جہنم کوئی شے ہے۔ یہ تو پیغمبرؐ اسلام کے کچھ الفاظ ہیں جس کے ذریعہ قوم پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ جنت کوئی شے ہے اور نہ جہنم کوئی شے ہے۔ یہ دادا کا کردار ہے۔ توجہ کریں۔ اب دادی کا کردار۔ تو ساری تاریخیں جانتی ہیں کہ جب میدانِ اُحد میں پیغمبرؐ کا چچا راہِ خدا میں قربان ہوا جس کو سرکارِ دوعالمؐ نے اس دور میں سید الشہداء قرار دیا تھا یعنی جناب حمزہؑ اپنے دور میں یقیناً سید الشہداء تھے وہ یزید ہی کی دادی تھی جو میدانِ جنگ میں آئی اور بنی ہاشم سے اپنی پرانی عداوت

کا انتقام لینے کے لیے جناب حمزہؑ کے سینے کو چاک کر کے جناب حمزہؑ کے جگر کو نکال کر اسے چبانا چاہتی تھی یہ اور بات ہے کہ پروردگار عالم نے اس کو اس مہم میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ہندہ کا لقب ہے "آکلۃ الاکباد" جگر کو کھانے والی، جگر خوارہ۔ وہ دادا کا کردار ہے اور یہ دادی کا کردار ہے۔

نانا نانی کے کردار کے بارے میں میں نہیں جانتا اس لیے کہ ماں تھی میسونہ جو خود ہی عیسائی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ عیسائی خاندان میں کون نانا رہا ہوگا، کون نانی رہی ہوگی۔ میں تو نہیں جانتا ہوں اس کردار کے بارے میں۔ اتنا جانتا ہوں کہ جس کی گودی میں پلا، جس کی آغوش میں رہا اور جس ماحول میں تربیت ہوئی ہے وہ قطعاً غیر اسلامی تھا اس لیے کہ پیدائش کے بعد اسے حوالے کر دیا گیا ننھیال والوں کے۔ اور ننھیال والوں نے بادیہ میں صحرا میں لے جا کر اپنے قبیلہ میں اس کی پرورش کی۔ تو ننھیال چونکہ عیسائی ہے لہٰذا نانا کتنا ہی باکمال رہا ہوگا پھر عیسائی ہی رہا ہوگا نانی کتنی ہی اونچی رہی ہوگی کوئی عیسائی ہی رہی ہوگی۔ جب ماں ہی کا کردار معلوم ہے تو نانا نانی کے کردار کو کیا تلاش کرنا ہے اور آگے بڑھ کر باپ کے بارے میں دیکھیں۔

تو میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خود امام حسینؑ کی جو گفتگو کل میں نے آپ کے سامنے نقل کی ہے کہ دربارِ ولید سے آنے کے بعد صبح کو امام حسینؑ مدینۃ الرسولؐ میں اپنے گھر سے باہر نکلے اور راستے میں مروان سے ملاقات ہو گئی اور مروان نے پھر دوبارہ امام حسینؑ کو مشورہ دیا کہ اب بھی میں آپ کو سمجھاتا ہوں صلاح و عافیت اسی میں ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیں اور یزید کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیں تو امام حسینؑ نے فرمایا تھا کہ تو کیا کہہ رہا ہے، تجھے نہیں معلوم ہے کہ میرے جدِ بزرگوار نے یہ اعلان کیا تھا کہ "اِنَّ الْخِلَافَۃَ مُحَرَّمَۃٌ عَلٰی آلِ اَبِیْ سُفْیَانَ وَعَلَی الطُّلَقَاءِ وَ اَبْنَاءِ الطُّلَقَاءِ" خلافت آل ابو سفیان کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ آزاد کردہ غلاموں کا حق نہیں ہے۔ آزاد کردہ غلاموں کی اولاد کا بھی حق نہیں ہے۔ یہ پیغمبرؐ نے اعلان کیا تھا اور

یہی نہیں پیغمبرؐ نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس حاکم کو جب کبھی منبر پر دیکھنا تو اسے قتل کر دینا۔ افسوس یہ ہے کہ مدینہ والوں نے میرے جد بزرگوار کے منبر پر اسے دیکھا مگر کسی نے میرے جد بزرگوار کے احکام پر عمل نہیں کیا۔ اس عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ آج یزید حاکم اسلامی ہو گیا ہے۔ پیغمبر اسلام کے ارشاد کو ٹھکرا دینے کا نتیجہ ہے کہ آج عالم اسلام کا مقدر یزید کے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔

اسی لیے امام حسینؑ نے اپنا تاریخی اعلان کیا تھا "عَلَى الْإِسْلَامِ بَعْدَهُ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلُ يَزِيدَ" اسلام کو آخری سلام کہ امت پر یہ بلا نازل ہوئی ہے اور امت مبتلا ہو گئی ہے ایک ایسے حاکم میں جو یزید جیسا حاکم ہے ایسا "شَارِبُ الْخَمْرِ" ایسا "لَاعِبُ الْقِمَارِ" ایسا بدکردار انسان اگر امت کا حاکم ہو جائے تو ایسے اسلام پر سلام۔

یہ امام حسینؑ نے خود یزید کے باپ کے بارے میں اپنے جد بزرگوار کا ارشاد نقل کیا ہے کہ پیغمبرؐ نہیں چاہتے تھے کہ میرے منبر پر ایسے افراد دکھائی دیں پیغمبرؐ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت اسلامی ایسے گھرانے میں چلی جائے جو آزاد کردہ غلاموں کا گھرانہ ہے۔

آیئے دونوں کے اب رشتے ملایئے:

اِدھر حسینؑ کا دادا جس نے نبی سے وعدۂ نصرت کیا تو نبیؐ نے اسلام کا اعلان کیا۔ اُدھر یزید کا دادا جو اعلان کرتا ہے کہ خلافت کو گیند کی طرح نچاؤ نہ جنت کوئی شے ہے نہ جہنم۔

اِدھر حسینؑ کی جدۂ ماجدہ جن کے لیے دیوار کعبہ میں در بنا اُدھر یزید کی دادی جو حمزہؑ کا جگر چبانا چاہتی تھی۔

اِدھر حسینؑ کا نانا جو خاتم النبیین ہے اُدھر عیسائیت کا پروردہ۔

اِدھر حسینؑ کی نانی جو خدیجۃ الکبریٰؑ ہیں اسلام کی پہلی محسن اور سب سے پہلی ایمان لانے والی ہیں اُدھر یزید کی نانی ہے جو عیسائی خاندان کی ایک عورت ہے۔

اِدھر حسینؑ کی مادرِ گرامی ہیں جو جگر پارۂ پیغمبرؐ ہیں، اُدھر یزیدؔ کی ماں ہے جو میسونہ نصرانیہ ہے۔

اِدھر حسینؑ کا گھرانہ ہے اُدھر یزید کا گھرانہ ہے۔

حیرت ہے اتنے نمایاں فرق کو دیکھنے کے بعد بھی نااہل مصنفین اور نالائق مورخین یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دو شہزادوں کی لڑائی تھی کیا بادشاہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یعنی جیسا بادشاہ پیغمبرؐ ویسا ہی بادشاہ کوئی عیسائی۔

جیسا صاحب کردار ابوطالبؑ ویسا ہی صاحبِ کردار ابوسفیان۔

جیسا گھرانہ یہ ویسا ہی گھرانہ وہ۔ اتنا نمایاں فرق دیکھنے کے بعد تو میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ کے گھرانے کے مقابلہ میں اگر کوئی گھرانہ لایا گیا تو اسی وقت لایا جائے گا جب اسلام نہ رہ جائے، اس لیے کہ حسینؑ کے خاندان کی بنیاد پیغمبرِ اسلام ہیں، دخترِ پیغمبرِ اسلام ہے۔ اب اگر پیغمبرؐ کے مقابلہ میں کوئی آیا تو سب رہ جائیں گے مگر اسلام باقی نہ رہ جائے گا۔

یہ وہ رشتے ہیں جن کے بارے میں خود سرکارِ دو عالمؐ نے ارشاد فرمایا تھا جس کا حوالہ میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے۔ میں یہ اس لئے گذارش کر رہا ہوں تاکہ یہ اضافی اوصاف جو نسبتوں سے پیدا ہوتے ہیں، جو قرابتوں سے پیدا ہوتے ہیں یہ بھی آپ کی نگاہ کے سامنے رہیں اور آپ کو یہ اندازہ رہے کہ حسینؑ کس بلند کردار اور کس عظیم رشتہ والے انسان کا نام ہے اور یزیدؔ کا اپنا ذاتی کردار جو ہے وہ آپ کی نگاہ کے سامنے ہے اس کے بارے میں اب ایک لفظ اور گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ علمائے اسلام کے درمیان جب کردارِ یزیدؔ اور اعمالِ یزیدؔ کی بحث آتی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ادھر آخری صدیوں میں ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں جو یزیدؔ کی حمایت کے ذمہ دار ہو گئے اور انھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ یزیدؔ کو ان سارے معاملات سے پاک دامن بنا دیا جائے اور یزیدؔ کے دامن پر کوئی دھبہ نہ رہنے دیا جائے۔

ورنہ عزیزو! آپ یہیں سے بات کی نزاکت اور اہمیت کو محسوس کریں کہ ہر مورخ، محدث، ہر نمک خوار، ہر ضمیر فروش سارا زور اس بات پر لگائے ہوئے ہے

کہ یزید کے کردار کو پاکیزہ ثابت کر دیا جائے یعنی یزید کے دامن پر کوئی دھبہ نہ رہ جائے اس لیے کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ یزید کا ہاتھ قتلِ حسینؑ میں تھا۔

کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ یزید نے قتلِ حسینؑ کے بارے میں کوئی حکم دیا تھا۔

کوئی کہتا ہے یہ بات ہی غلط ہے کہ یزید کو قتلِ حسینؑ کی اطلاع تھی۔

کوئی کہتا ہے یہ بات ہی غلط ہے کہ یزید کو خبر بھی ہو سکی کہ حسینؑ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔

نہ یزید نے قتلِ حسینؑ کا حکم دیا۔ نہ یزید کے دامن پر خونِ حسین کا کوئی دھبہ ہے۔ نہ یزید نے فرزندِ رسولؐ کو قتل کیا ہے۔ نہ یزید کو کوئی اطلاع تھی۔ اتنی صفائیاں جو آج پیش کی جا رہی ہیں آپ سنتے رہتے ہیں، لیکن جو لفظ میں کہنا چاہتا ہوں اسے یاد رکھیے گا۔

اگر کوئی آدمی میرے بارے میں کہے ارے آپ کو معلوم ہے یہ کون ہیں، یہ تو نمازِ شب بھی پڑھتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی کسی سے میرے بارے میں میرے سامنے کہے ان کو آپ نہیں جانتے ہیں یہ تو پانچ وقت کی نماز کے علاوہ نمازِ شب بھی پڑھتے ہیں۔ اور میں کہوں استغفراللہ تو اس کا مطلب کیا ہے کہ نمازِ شب بھی کوئی عیب ہے۔ نہیں توجہ کر رہے ہیں؟۔ اگر میں کہوں استغفراللہ تو اس کے معنی کیا ہیں کہ میں نمازِ شب کو بھی کوئی عیب سمجھتا ہوں جبھی تو چاہتا ہوں کہ میری طرف منسوب نہ ہونے پائے۔ لیکن اگر کسی نے کہا یہ تو نمازِ شب بھی پڑھتے ہیں اور میں نے کہا الحمد للہ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ شب میری نظر میں ہنر ہے۔ اگر کسی کو اللہ توفیق دیدے پھر اگر کوئی میرے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ تو جوری بھی کرتے ہیں، تو میں کہوں گا استغفراللہ۔ کوئی کہے یہ تو نالائق بھی ہیں، میں کہوں گا استغفراللہ۔ کوئی کہے انھوں نے یہ بُرا کام کیا ہے، میں کہوں گا استغفراللہ۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ یہ تو نماز بھی پڑھتے ہیں، تو میں کیا کہوں گا؟ الحمد للہ۔ کوئی کہے روزہ بھی رکھتے ہیں، میں کہوں گا

الحمد للہ۔ اس کے معنی کیا ہیں کہ جس کام کو انسان جرم سمجھتا ہے اس سے دامن کو پاک ثابت کرتا ہے اور جس کام کو ہنر سمجھتا ہے اسے کو بہر حال اپنی طرف منسوب کرنا چاہتا ہے۔

یہ سارے مورخین، یہ سارے اہلِ قلم جو زور لگائے ہوئے ہیں کہ قتلِ حسینؑ کی نسبت یزید کی طرف نہ ہونے پائے۔ یہ در پردہ اقرار کر رہے ہیں کہ قتلِ حسینؑ کوئی جُرم ہے ورنہ اگر جُرم نہ ہوتا تو ہنر کو منسوب کرتے، دامن کو پاک بنانے کی فکر نہ کرتے۔

اگر یہ انھیں احساس تھا کہ یزید حاکم اسلامی ہے، خلیفۃ المسلمین ہے، امیر المومنین ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ جو ایسا ہوگا تو جو اس کے مقابلہ میں قیام کرے گا اسے قتل ہونا ہی چاہئے تب تو یہ اعلان ہونا چاہئے تھا کہ ہاں ہاں ہم نے قتل کیا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے قانون سے بغاوت کی ہے، انھوں نے قانون کے خلاف اقدام کیا ہے مگر یہ صفائی دینا خود اس بات کی علامت ہے کہ سب کو احساس ہے کہ یہ کوئی غلط کام تھا جو ہو گیا۔

اور آج والوں کو نہیں خود یزید کو بھی احساس تھا کہ جب یزید کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو اُس نے کہا مجھ سے کیا تعلق۔ میں نے تو فقط یہ کہا تھا کہ حسینؑ سے بیعت لی جائے۔ یہ میں نے کہاں کہا تھا کہ اگر بیعت نہ کریں تو قتل کر دیا جائے۔ یہ ابن زیاد کا اپنا ذاتی عمل ہے۔ میں نے بیعت کا مطالبہ کیا تھا اس نے بیعت نہ کرنے پر قتل کر دیا۔ یہ اس کی اپنی نالائقی ہے، مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا قتلِ حسینؑ کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔

قتلِ حسینؑ کا ذمہ دار کون ہے؟ اس لفظ کو پہچانیں۔ یزید نے کیا کہا قتلِ حسینؑ کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ ذمہ دار کون ہے؟ ابن زیاد بھی نہیں کہتا۔ میں یہی پہچنوانا چاہتا ہوں کہ اس نے کہا ابن مرجانہ ذمہ دار ہے یعنی عبید اللہ بن زیاد۔ عبید اللہ کی نسبت یزید نے بھی باپ کی طرف نہیں دی ہے۔ مرجانہ اس کی ماں کا نام ہے یزید کی ...

میسونہ اور ابن زیاد کی ماں کا نام مرجانہ اس لیے اس نے کہا کہ لعن اللہ ابن مرجانہ خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے اس نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا۔ ورنہ میں نے تو بیعت کا مطالبہ کیا تھا، میں نے قتل کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ کیا کہا خدا لعنت کرے۔ کس پر؟ ابن مرجانہ پر۔ یعنی باپ کا بیٹا نہیں ماں کا بیٹا۔ آپ غور نہیں کر رہے ہیں میں کیا گذارش کر رہا ہوں؟۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہاں تک آپ کے ذہنوں کو لے جانا چاہتا ہوں۔ یعنی باپ کی طرف بات کو منسوب نہیں کیا۔ منسوب کیا ماں کی طرف۔ خدا لعنت کرے ابن مرجانہ پر کہ اس نے بیعت نہ کرنے پر حسینؑ کو قتل کر دیا اور میرے سر پہ بلا، یہ مصیبت آگئی ورنہ میں نے تو قتل کے واسطے نہیں کہا تھا۔ اب آپ نے پہچانا۔ یہ ہے ابن میسونہ، وہ ہے ابن مرجانہ اور اب دونوں کی تاریخ حیات بھی نوٹ کر لیں شاید میرے بچوں کو یا میرے جوانوں کو یا سننے والوں کو نہ معلوم ہو۔ یزید پیدا ہوا ہے ۲۵ ہجری میں یا ۲۶ ہجری میں بہ اختلاف تاریخ یعنی واقعۂ کربلا میں یزید کی عمر ہے ۳۵ سال یا ۳۴ سال اور ابن زیاد عبید اللہ بن زیاد یہ پیدا ہوا اس کے بہت بعد یعنی ۳۹ یا ۴۰ ہجری میں تو واقعۂ کربلا میں ابن زیاد کی عمر کتنی ہے کل بیس اکیس سال۔

میں بلا کسی تبصرے کے آپ کو تاریخی حقائق سے باخبر کرنا چاہتا ہوں اس سے زیادہ میرا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ اب یہاں پر ایک رُخ آگیا ہے۔ واقعہ اور لفظ تو آپ نے بارہا سُنا ہے مگر جو بات میں گذارش کرنا چاہتا ہوں اسے آپ نوٹ کر لیں۔ یہ کام آنے والی بات ہی جب مسئلہ یہ ہوگیا کہ حسینؑ کے قتل میں کن کا ہاتھ ہے اور یزید نے چاہا کہ اس مصیبت کو اپنے سے الگ رکھا جائے تو کہا کہ ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا ابن مرجانہ کا بُرا کرے کہ اُس نے مجھے اس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے ورنہ میں نے قتل کے واسطے نہیں کہا تھا میں نے تو بیعت کے لیے کہا تھا۔ الفاظ کیا ہیں خدا لعنت کرے ابن مرجانہ پر کہ حسینؑ کے بیعت نہ کرنے کی شکل میں اس نے حسینؑ کو قتل کر دیا یہ کون کہہ رہا ہے؟

ایک بڑے طبقہ کا یا چھوٹے طبقہ کا یا چند مفسرین کا یا چند محدثین کا یا چند مورخین کا یا چند ضمیر فروش اہلِ قلم کا خلیفۃ المسلمین، مسلمانوں کے چند افراد کا حاکم یہ کہتا ہے کہ خدا لعنت کرے ابن مرجانہ پر۔ کیوں لعنت کرے کیا اس نے چوری کی ہے، کوئی بدکاری کی ہے، کسی کے گھر ڈالا ہے، کیا کیا ہے اس نے، کیوں لعنت کرے؟ کہا میں نے بیعت کے لیے کہا تھا اس نے قتل کیوں کر دیا۔

تو عزیزو! اتنی بات تو واضح ہو گئی کہ جو بھی حسینؑ کا قاتل ہے وہ، ہم حسینیوں ہی کی نظر میں نہیں یزید کی نظر میں بھی قابلِ لعنت ہے۔

اب اس سے زیادہ ہمیں بحث بھی نہیں کرنا ہے اگرچہ علماء نے اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے اور جب اس کردار پر بحث کرنے کا وقت آیا تو ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے فتنۃ الکبریٰ میں اس مسئلہ کو بڑی آسانی سے حل کر دیا۔ پہلے طٰہٰ حسین نے ان تمام اقوال کو نقل کیا جو یزید کی حمایت کرنے والے ہیں اور ہر ایک زور اسی پر ہے کہ کچھ نہ کہو اس لیے کہ اس نے قتلِ حسینؑ کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ وہ حسینؑ کا قاتل بھی نہیں ہے۔ اسے اطلاع بھی نہیں ہوئی تھی۔ ابن مرجانہ نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد کتنی سچی بات کہی ہے کہ ٹھیک ہے یہ مجھ سے سینئر علماء ہیں، یہ مجھ سے پہلے والے محدثین ہیں، یہ مجھ سے پہلے والے مورخین ہیں۔ یہ حالات کو بہتر جانتے ہوں گے تو یزید قاتل نہیں ہے۔ میں نے مان لیا۔ یزید نے قتل کا حکم نہیں دیا میں نے مان لیا۔ یزید کو اطلاع بھی نہیں تھی۔ میں نے مان لیا یزید کی مرضی کے خلاف ابن زیاد نے یہ اقدام کیا یہ بھی ہم نے مان لیا۔ لیکن دنیا کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی حکومت کا گورنر سرکار کی مرضی کے خلاف کوئی اتنا بڑا اقدام کر بیٹھے، اتنا بڑا جرم کر بیٹھے جو حکومت کے لیے باعث بدنامی ہو تو پہلا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ اسے معزول کر دیا جائے۔ مجھے تاریخ میں کہیں دکھا دو۔ طٰہٰ حسین کہتے ہیں یزید کے طرفدارو! تاریخ میں مجھے کہیں دکھلا دو۔ لعنت تو کر دی مگر اس کے بعد بھی نہ برخاست ہوتے دیکھا، نہ معزول ہوتے دیکھا، نہ اسے نکالتے دیکھا، نہ اسے نکلتے دیکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے اطلاع نہیں تھی تو جب اطلاع ہو گئی اس کے بعد بھی ...

برقرار رہا۔ کوئی بھی حکومت مجرم کو اسی وقت عہدہ پر برقرار رکھتی ہے جب مجرم کے جرم سے راضی ہوتی ہے۔

طہٰ حسین کہتے ہیں کہ جیسے حسینؑ کا قاتل مجرم ہے ویسے ہی قتل حسینؑ سے خوش ہونے والا بھی مجرم ہی کہا جائے گا۔ یہ تو طہٰ حسین نے بات کہی ہم نے پڑھ لیا اور آپ کو سنا دی۔ لیکن یہاں پر ایک بات اور واضح ہوگئی کہ جب کسی حکومت کا کوئی نمائندہ کسی بھی انسان کو قتل کردے اور آپ کو اندازہ کرنا ہو کہ اس میں حکومت کا ہاتھ ہے یا نہیں تو دیکھئے کہ قاتل کے ساتھ حکومت کا برتاؤ کیا ہوتا ہے۔ اگر فوراً معزول کردیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قتل سے حکومت راضی نہیں ہے اور اگر کسی بھی بہانے سے رکھ لیا جائے چاہے حال کے خیال سے، چاہے مستقبل کے خیال سے تو یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ جتنا قاتل کا ہاتھ ہے اتنا ہی سرکار کا بھی ہاتھ ہے۔

طہٰ حسین نے یہ فیصلہ کیا اور علامہ تفتازانی نے بھی کہہ دیا کہ کیا بحث کرتے ہو۔ یزید پر لعنت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یہ تو بعد کے مسائل ہیں یہ کوئی بحث نہیں ہے۔ بحث اس پر کرو کہ مسلمان ہے بھی یا نہیں، اس لیے کہ پیغمبرِ اسلام نے حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں اور اپنے اہلبیتؑ کے بارے میں یہ اعلان کردیا ہے کہ ان سے جنگ مجھ سے جنگ ہے اور ان سے صلح مجھ سے صلح ہے۔ پھر حسینؑ کے بارے میں صاف فرمایا کہ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ تو جس کے بارے میں پیغمبرؐ کہیں کہ میں اس سے ہوں جو اس کا قاتل ہوگا آپ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ اچھا کہا جائے یا بُرا کہا جائے۔ یہ طے کرو پہلے کہ یہ مسلمان بھی ہے یا نہیں ہے؟ یعنی کبھی رہا ہوگا مگر اتنا بڑا جرم کرنے کے بعد یہ مسلمان کہے جانے کے قابل بھی نہیں ہے اور میں بیسویں صدی میں تو اور واضح کہہ سکتا ہوں کہ آج کے فلسفہ کے مطابق جو نبیؐ سے آکے مل گئے، جو نبیؐ کے پاس آکے بیٹھ گئے، جنھوں نے نبیؐ کا کلمہ پڑھ لیا اگر ان سے اختلاف کرنا اسلام سے باہر نکال دیتا ہے، اگر ان کی عصمت و شخصیت

سال کا کارنامہ اس میں خانۂ خدا کا جو انجام ہوا ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے تو یزید کا سہ سالہ یا چار سالہ دورِ حکومت ان تین کارناموں کا نام ہے۔ پہلا کارنامہ فرزندِ رسولؐ کا قتل۔ دوسرا کارنامہ مدینۂ رسولؐ کی بربادی، تیسرا کارنامہ حرم خدا اور خانۂ خدا کی بربادی۔

میں نے لفظوں کو مورخ کی زبان سے دوہرایا ہے۔ مگر میں اپنے سننے والوں کو اپنی زبان میں سمجھانا چاہتا ہوں۔ یہ تو مورخ کی زبان ہے جسے آپ نے سن لیا اور کتاب میں مل جائے گا۔ اب ذرا صورت حال کو پہچانیں۔ اقتدار کا پہلا کارنامہ فرزندِ رسولؐ کا قتل، دوسرا کارنامہ حرم پیغمبرؐ کی بربادی، تیسرا کارنامہ حرم خدا کی بربادی۔ ترتیب دیکھ رہے ہیں آپ؟ اس ترتیبِ عمل کو نگاہ میں رکھئے گا۔ پہلے فرزندِ رسولؐ، اس کے بعد رسولؐ، اس کے بعد خدا۔

اب اسی کو اُلٹ کے سوچیں کہ جو آج فرزندِ رسولؐ کا نہ ہوگا جب اس کو مزید اقتدار دکھلانے کا موقع ملے گا تو پھر رسول کا بھی نہ ہوگا اور جب کل رسولؐ کا نہ ہوگا تو پرسوں خدا کا بھی نہ ہوگا۔ تو اگر اللہ والا بننا ہے تو پہلے نبی والا بننا پڑے گا اور اگر نبی والا بننا ہے تو پہلے عترتِ پیغمبرؐ کا احترام کرنا ہوگا۔

بس عزیزانِ محترم! زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا ہوں یہ تو میں نے تاریخ کا ایک نقشہ آپ کے سامنے عرض کیا تاکہ جن لوگوں کو یہ حقائق نہیں معلوم ہیں وہ بھی جان لیں اور کتابوں میں پڑھیں۔ مطالعہ کریں انھیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ واقعہ کربلا کون سا واقعہ ہے۔ کیسی بڑی مصیبت عالم اسلام کے سر آئی تھی ـــ جس مصیبت سے بچانے کے لیے فرزندِ بانیٔ اسلام، فرزندِ رسولِ اکرمؐ نے اتنا بڑا قیام کیا اس قیام کے بارے میں میں آئندہ اپنے معروضات آپ کے سامنے گذارش کروں گا آج بات کو اسی آخری مرحلہ پر تمام کرنا چاہتا ہوں۔

آئیے آخر وقت میں اور آخری مرحلہ میں یہ دیکھا جائے کہ جس وقت یزید کے سامنے یہ کارنامہ آیا چاہے پہلے اس نے حکم دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر تاریخ کے مسلمات میں ہے کہ ابن زیاد نے مارا ہو یا ابن سعد نے قتل کیا ہو یا شمر نے قتل کیا ہو مگر حسینؑ بن علیؑ

اور اہلِ حرمِ حسینؑ دربارِ یزید تک آئے۔ اہلِ حرم کو بھی لایا گیا اور سرِ امام حسینؑ کو بھی لایا گیا یعنی اگر پہلے اطلاع نہ تھی اب تو اطلاع ہو گئی کہ نبی کا لال قتل ہو گیا۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ حسینؑ کے اہلِ حرم لائے گئے ہیں۔ تو انھیں دربار میں کیوں پیش کیا گیا۔ انھیں قید خانے میں کیوں رکھا گیا۔ انھیں بار بار کیوں ستایا گیا۔ اگر حاکم کی کوئی مرضی شامل نہیں ہے تو ایسا برتاؤ سرِ حسینؑ کے ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔ جس کے لیے احتجاج کرنے والے دس اسی وقت پیدا ہو گئے۔ میں نے عرض کیا کہ موضوعات بہت تفصیلی ہیں۔ میں تو صرف خط کے رکھنا چاہتا ہوں آپ کے سامنے۔ تاکہ جو میرے سُننے والے ہیں وہ ان حقائق کو پہچانیں۔

شہادتِ حسینؑ کے بعد جب سرِ امام حسینؑ حاکمِ وقت یزید کے سامنے پیش ہوا اور اہلِ حرم کو لایا گیا تو دس ردِّ عمل اسی وقت سامنے آئے۔

پہلا ردِّ عمل یہ ہے کہ روم کے بادشاہ کا سفیر دربارِ یزیدؔ میں موجود ہے اس نے دیکھا کہ سرِ حسینؑ سامنے رکھا ہوا ہے اور حاکم اس سرِ حسینؑ سے بے ادبی کر رہا ہے تو اس نے کہا کہ کیا میں پوچھ سکتا ہوں یہ کس کا سر ہے؟

بتانے والے نے بتایا کہ یہ حسینؑ کا سر ہے۔

کہا کون حسینؑ۔ وہی حسینؑ جس کو حسینؑ بن فاطمہؑ کہا جاتا ہے؟

کہا ہاں وہی حسینؑ۔

کہا اسی فاطمہؑ کا بیٹا جو نبیؐ کی بیٹی ہے؟

کہا ہاں اسی فاطمہؑ کا بیٹا جو نبیؐ کی بیٹی ہے۔

کہا کس قدر شرم کی بات ہے کہ جناب عیسیٰؑ جس جانور پر سوار ہوتے تھے اس جانور کے سُم کا ایک حصہ آج تک ہمارے یہاں کی عبادت گاہ میں پایا جاتا ہے اور ہماری ساری قوم اس کی زیارت کے لیے آتی ہے۔ یہ جناب عیسیٰؑ کی کوئی یادگار نہیں ہے خرِ عیسیٰؑ کی یادگار ہی نہیں کی سواری کی یادگار ہے اور ساری قوم اس کی زیارت کرنے کے لیے آتی ہے۔ کہاں دورِ عیسیٰؑ اور کہاں یہ دور۔

کہاں عیسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی سواری۔

اور کہاں اس کا سُم اور کہاں یہ زیارت اور کہاں تم مسلمانوں کی بے غیرتی کہ حسینؑ اور نبیؐ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ نبیؐ ہی کی بیٹی کے بیٹے کا نام حسینؑ ہے اور تم نے اپنے نبیؐ کی بیٹی کے بیٹے کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے۔ سفیر روم بھی احتجاج کر رہا ہے کہ جو ہوا ہے وہ غلط ہوا ہے اور جو کرنے والا ہے وہ مجرم ہے وہ ظالم ہے۔

دوسرا ردِ عمل جو سامنے آیا یہ یہودیوں کا نمائندہ ہے۔ کہتا ہے کہ ہم داؤدؑ کی ستر ویں پشت میں ہیں اور ہماری قوم ہمارا احترام کرتی ہے۔ کس قدر بے غیرت ہو تم مسلمان کہ یہ تمہارے پیغمبرؐ کی بیٹی کا بیٹا ہے اس کو تم نے قتل کیا ہے اور اس کے بعد خوشیاں منا رہے ہو، مسرت کا اظہار کر رہے ہو۔

تیسرا ردِ عمل یہ ہے کہ ایک نبیؐ کا صحابی بھی دربار میں ہے جب اس نے دیکھا کہ حسینؑ کے لب و دندان کو چھڑی لگائی جا رہی ہے اور بے ادبی کی جا رہی ہے تو پکار اٹھا۔ یزیدؔ اب مجھ سے یہ بے ادبی برداشت نہیں ہو سکتی ہے اپنی چھڑی کو ہٹا لے۔ میں نے ان لبوں کے بارے میں پیغمبرؐ کو دیکھا ہے کہ انہیں بوسہ دے رہے ہیں۔

یہ احتجاج صحابیٔ رسولؐ کی طرف سے ہے۔

اس کے بعد ایک احتجاج دربارِ یزیدؔ میں خود دربار کی طرف سے ہے اور اس کے بعد جب دربار برخاست ہو چکا تو قیصر روم نے خط لکھا یزید کو کہ مجھے یہ اطلاع ملی ہے اپنے سفیر کے ذریعہ کہ تم نے اپنے نبیؐ کے نواسے کو، اپنے نبیؐ کی بیٹی کے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ تم نے اپنے پیغمبرؐ کو اتنی جلدی بھلا دیا ہے اور پیغمبرؐ کی ذریت کو تہ تیغ کر دیا ہے۔

اس کے بعد جب عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ میں یزیدؔ نے ابن عباس سے کمک کا مطالبہ کیا تو ابن عباس نے کہا، یزیدؔ تجھے حیا نہیں آتی ہے کہ تو نے کل حسینؑ بن علیؑ کو قتل کیا اور آج تو مجھ سے مدد مانگتا ہے کہ میں ایسے ظالموں کی مدد کروں جو خاندانِ رسالت

کو برباد کر دینا چاہتے ہیں، جو خانوادۂ نبوت کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں، جو پیغمبرؐ کی اولاد کو زندہ نہ چھوڑنا چاہیں یہ وہ شخصیتیں ہیں کہ جن کو عالمِ اسلام نے پہچانا ہے۔

جب دربارِ یزیدؔ میں سرِ حسینؑ لایا گیا تو روایت کا فقرہ ہے کہ یزیدؔ نے نشۂ حکومت میں چور ہو کر اور بکمال مسرت کا اظہار کرنے کے لیے سرِ حسینؑ کو گھر کے اندر بھیج دیا جیسا کہ بعض مغرور بادشاہوں اور حاکموں کا طریقہ ہوتا ہے کہ گھر والوں کو خوش خبری سُنائی جائے تو گھر والے زیادہ خوش ہوں گے اس لیے کہ عورتوں کا مزاج بہرحال مردوں کے مقابلہ میں کسی نہ کسی انداز سے مختلف ہوتا ہے۔ یزیدؔ نے سرِ امام حسینؑ کو اپنے گھر کے اندر اپنے حرم میں بھیج دیا تاکہ گھر والوں کو معلوم ہو جائے کہ مجھے فتح نصیب ہوئی ہے اور جو میرے مقابلہ میں اُٹھا تھا اسے ہم نے قتل کرا دیا ہے اور یہ اس کا سر آ گیا ہے۔

روایت کا فقرہ ہے کہ یزیدؔ کی ایک بیٹی ہے عاتکہ۔ باہر والوں کا ذکر نہیں ہے، یہ حسینؑ اور حسینؑ کے چاہنے والوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ یزیدؔ کی بیٹی نے جیسے ہی سرِ حسینؑ کو دیکھا، اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور کہا "ھٰذَا ابْنُ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ" یہ رسولؐ اللہ کی بیٹی کا بیٹا ہے۔ ارے یہ کیا غضب کیا گیا۔ نبیؐ کی بیٹی کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا۔

مجھے تو نہیں معلوم تھا، کیا دنیا میں اتنا بڑا بھی ستم ہو سکتا ہے کہ فرزندِ رسولؐ کو قتل کر دیا جائے۔ یہ برتاؤ سرِ حسینؑ کے ساتھ کس نے کیا ہے؟

یہ ردِ عمل یزیدؔ کی بیٹی کا سامنے آیا۔

اور جب اہلِ حرم کو لا کر دربار میں کھڑا کیا گیا اور یزیدؔ نے اہلِ حرم کی توہین شروع کی تو یزیدؔ کی زوجہ ہند چادر پھینک کے دربار میں آ گئی۔ یزیدؔ نے جب یہ منظر دیکھا تو آگے بڑھا اور اپنی رِدا اپنے دوش سے اُتار کر ہند کے سر پر ڈال دی۔ یہ تو نے کیا غضب کیا بغیر پردہ کے، بغیر چادر کے دربار میں نکل آئی؟

ہند نے کہا ظالم، تجھے حیا نہیں آتی ہے۔ میرے پردے کا تجھے خیال ہے اور یہ نبیؐ کی بیٹیاں ہیں، یہ زہراؑ کی لاڈلیاں ہیں، ان کے پردہ کا خیال نہیں ہے۔ ان کی چادریں چھین لی گئیں اور انھیں سرِ دربار لا کر یوں کھڑا کیا گیا ہے۔

وہ یزیدؔ کی بیٹی کا ردِ عمل تھا اور یہ یزیدؔ کی زوجہ کا ردِ عمل ہے۔

اور آخری ردِ عمل یزیدؔ کے بعد یزیدؔ کے بیٹے معاویہ بن یزید کا ہے۔

یزیدؔ کے باپ کا نام بھی معاویہ ہے اور یزید کے بیٹے کا نام بھی معاویہ ہے۔

یزیدؔ کا بیٹا معاویہ بن یزید جب اسے حکومت ملی تو اس نے جو پہلا خطبۂ خلافت پڑھا اس میں اعلان کیا کہ "قَدْ نَازَعَ فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ" میرے دادا نے اس مسئلہ میں اس سے اختلاف کیا۔ "مَنْ کَانَ اَوْلٰی بِہٖ مِنْہُ" جو اس خلافت کا اس سے کہیں زیادہ حقدار تھا۔ میرے دادا نے اس مسئلہ خلافت میں اس سے اختلاف کیا جو اس مسئلہ خلافت میں اس سے کہیں زیادہ حقدار تھا اور میرے باپ نے بھی اس سے حق چھینا ہے کہ جس کا حق تھا۔ اب میں غصبی تخت پر نہیں بیٹھنا چاہتا۔ وہ حکومت کرکے دنیا سے چلے گئے۔ کیا لعنتوں کا حقدار میں ہی بننا چاہتا ہوں۔ میں ایسے تخت کو نہیں چاہتا۔

ملا ہوا تخت، ملا ہوا تاج، ملا ہوا اقتدار یزید کے بیٹے نے ٹھکرا دیا۔ حضرت پیام اعظمی نے سچ کہا ہے:

شرما کے خود ہی ہٹ گیا بیٹا یزید کا\
اتنا ذلیل تو نے کیا تخت شام کو

کل اقتدار کے پیچھے، تخت و تاج کے پیچھے لوگ جان دے رہے تھے اور آج یزید کا بیٹا الگ ہو رہا ہے۔

اب آپ کو اندازہ ہوا۔ صحابہ کو دیکھا یزیدؔ کے عمل سے اختلاف کرتے ہوئے۔ غیروں کو دیکھا اختلاف کرتے ہوئے۔ بیٹی کو دیکھا بُرا کہتے ہوئے۔ زوجہ کو دیکھا اختلاف کرتے ہوئے۔ بیٹے کو دیکھا اختلاف کرتے ہوئے۔ ایک ایسا کردار جس سے نہ اپنے راضی نہ غیر راضی۔ نہ اصحاب راضی نہ تابعین راضی۔ نہ بیٹی راضی نہ زوجہ راضی نہ بیٹا راضی نہ مسلمان راضی۔ نہ عیسائی راضی نہ یہودی راضی۔ اور ایک ایسا کردار جس کو خدا آواز دے "مری بارگاہ میں پلٹ آ، تو ہم سے راضی ہم تجھ سے راضی۔"

اس کے بعد بھی یہ کہا جائے دو برابر کے کردار ٹکرا رہے تھے۔ دو برابر کی شخصیتیں مقابلہ کر رہی تھیں۔ العیاذ باللہ، کہاں نبیؐ کا لال، زہراؑ کا لاڈلا، علیؑ کا لختِ جگر اور کہاں یزید۔

دونوں کردار میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیے۔ اب خاتمۂ کلام میں امام حسینؑ کا وہ تاریخی فقرہ جس میں آپ نے یہ اعلان کیا کہ "مِثْلِی لَایُبَایِعُ مِثْلَہٗ" مجھ جیسا صاحب کردار ایسے انسان کی بیعت نہیں کر سکتا۔ میں اس راہ میں ہر مصیبت کے لیے تیار ہوں۔ ہر آفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر میں اپنا سر جھکا دوں یزید کے سامنے، یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں اپنے دین کی بربادی اور تباہی کو برداشت کروں یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں ہر قربانی دے سکتا ہوں مگر نانا کے دین کو برباد نہ ہونے دوں گا۔ اس لیے کہ یہی میرے نانا کی تعلیم ہے۔

حسینؑ اسی عزم کے ساتھ، اسی ارادے کے ساتھ مدینۂ رسولؐ سے نکلے ۲۸ رجب کو۔ اور چند روز کے بعد امام حسینؑ مکہ میں وارد ہوئے۔ یہ حرم الٰہی ہے۔ یہاں تو ہر ایک کو پناہ مل جاتی ہے۔ یہ حرم خدا ہے یہاں تو جائے امن ہے ہر ایک کو پناہ مل سکتی ہے۔ اس کے بعد جب اہل کوفہ کے خطوط آئے تو امام حسینؑ نے جناب مسلمؑ کو بھیج دیا یہاں تک کہ ۸ ذی الحجہ کی تاریخ آئی اور حالات اتنے تبدیل ہو گئے کہ لباس احرام میں خنجر چھپا کے لائے گئے کہ حسینؑ بن علیؑ کو طواف خانۂ خدا کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکے کہ کس نے حسینؑ کو مارا ہے اور کس نے حسینؑ کو قتل کیا ہے۔ فرزند رسولؐ نے یہ صورت حال دیکھی تو حج کو عمرہ سے تبدیل کیا اور جب ساری دنیا آ رہی تھی خانۂ خدا کی طرف تو حسینؑ عمرہ کر کے جا رہے تھے۔ میں انشاء اللہ اس تفصیل کو آپ کے سامنے گذارش کروں گا، آج جو تذکرہ عرض کرنا ہے اسے چند لفظوں میں گذارش کر کے مجلس کو تمام کرنا چاہتا ہوں۔

دنیا آ رہی ہے اور نبیؐ کا نواسہ جا رہا ہے۔ ہر انسان گھبرا گھبرا کے پوچھ رہا ہے۔ لوگ تو آ رہے ہیں، ساری دنیا تو آ رہی ہے آخر نبیؐ کا نواسہ کیوں جا رہا ہے اور حسینؑ

چاہتے ہیں کہ لوگ اس ظلم کی طرف متوجہ ہو جائیں کہ اگر صورت حال اتنی سنگین نہ ہو گئی ہوتی تو نبیؐ کا نواسہ جس نے اپنی زندگی میں پچیس مرتبہ پیدل حج کیا ہے وہ مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مگر امام حسینؑ نے کہا کہ میں مکہ کو چھوڑ دینا، حج کو عمرہ میں بدل دینا گوارہ کر لوں گا مگر حرمِ خدا کی حرمت برباد ہو جائے، سرزمین حرم میرے خون سے رنگین ہو جائے اسے میں گوارا نہیں کر سکتا۔

لہٰذا امام حسینؑ اب چلنا چاہتے ہیں۔

اربابِ عزا! اس مقام پر بھی تین ردعمل دیکھے گئے۔

ایک ردعمل تھا حسینؑ کے بھائی کا کہ جو گذارش کرتے ہیں فرزندِ رسولؐ آپ کہاں جا رہے ہیں اگر آپ نے عراق کا ارادہ کیا ہے تو عراق والوں کا کردار آپ کو معلوم ہے۔ انھوں نے آپ کے بابا کے ساتھ وفا نہیں کی تو آپ کے ساتھ کیا وفا کریں گے۔ آپ کے بھائی کے ساتھ وفا نہیں کی تو آپ سے کیسے وفا کریں گے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

فرزندِ رسولؐ نے فرمایا کہ اچھا اگر آپ کا یہ مشورہ ہے تو میں آپ کے مشورہ پر غور کروں گا اور صبح جب محمد حنفیہ کو خبر ملی کہ حسینؑ کا قافلہ تیار ہو رہا ہے اور حسینؑ جانا چاہتے ہیں تو آئے گھبرائے ہوئے اور کہا فرزندِ رسولؐ رات تو آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کے مشورہ پر غور کروں گا اور اس وقت آپ کا قافلہ تیار ہو گیا ہے اور آپ جانا چاہتے ہیں؟

فرمایا ہاں میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا مگر میں کیا غور کرتا جب میری آنکھ لگی تو نانا میرے سامنے آئے۔ میں نے کہا نانا! اب آپ بتائیں کہ میری ذمہ داری کیا ہے، اب آپ فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ تو میرے نانا نے فرمایا کہ حسینؑ کربلا جاؤ "شَاءَ اللّٰهُ اَنْ یَّرَاكَ قَتِیْلًا" مشیتِ پروردگار یہ ہے کہ تم خاک و خون میں ڈوب جاؤ تاکہ میرا دین بچ جائے اس لیے میرا جانا ضروری ہو گیا ہے۔ قافلہ تیار ہے، سیدانیاں محملوں میں، عماریوں میں بیٹھ چکی ہیں۔ قافلہ آگے بڑھنا چاہتا ہے کہ ایک

مرتبہ علیؑ کا عزیز ترین شاگرد ابن عباس آگے بڑھا۔ عرض کرتے ہیں فرزندِ رسولؐ کیا طے کیا؟

کہا ابن عباس اب کیا پوچھ رہے ہو، قافلہ تیار ہے۔ بیبیاں عماریوں میں سوار ہو چکی ہیں۔ اب یہ قافلہ جانے والا ہے۔

کہا کیوں اب ٹھہرنے کا کوئی امکان نہیں ہے؟

کہا نہیں اب تو مجھے جانا ہے۔

کہاں جا رہے ہیں؟

عراق جا رہا ہوں۔

عراق میں کہاں جائیں گے؟

کہا کربلا جا رہا ہوں۔

اے کربلا کیوں جا رہے ہیں؟

کہا نانا کا حکم ہے جاؤ حسینؑ جان قربان کرو تاکہ میرے دین کو زندگی مل جائے۔ دین باقی رہ جائے۔ یہ سُننا تھا کہ ابن عباس نے عجب فقرہ کہا:

فرزندِ رسولؐ! جب آپ جانتے ہیں کہ آپ قربان ہونے جا رہے ہیں، جب آپ جانتے ہیں کہ آپ گلا کٹانے جا رہے ہیں "فما معنی حملك هٰذه النسوة" تو ان بیبیوں کو کیوں لیے جا رہے ہیں۔ ان عورتوں کو کیوں لیے جا رہے ہیں؟ سنو گے عزیزو! بس یہ سُننا تھا کہ حسینؑ تو کہہ کر چُپ ہو گئے کہ ابن عباس یہ میرا ساتھ نہ چھوڑیں گی۔ ابن عباس یہ بیدانیاں مجھے تنہا نہ جانے دیں گی۔ مگر ایک مرتبہ پردۂ محمل سے آواز آئی:

ابن عباس! خاموش خبردار کچھ نہ کہنا۔ کیا چاہتے ہو بہن بھائی سے جُدا ہو جائے۔ کیا چاہتے ہو بہن اور بھائی میں جُدائی ہو جائے یہ ناممکن ہے جب تک زینبؑ زندہ رہے گی اپنے ماں جائے کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔

اجر کہہ علی اللہ۔ قافلہ مکہ سے چلا بہن بھائی کے ساتھ رہی، قافلہ ...

کو دارد سرزمین کربلا ہوا، بہن بھائی کے ساتھ ہے۔ وقت گذرتا رہا ہر مصیبت میں زینبؑ حسینؑ کے ساتھ ہے۔ عاشور محرم آیا ہر قدم پر زینبؑ حسینؑ کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ہر مرحلہ پر بہن بھائی کا دل سنبھالے ہوئے ہے لیکن ایک وقت آیا جب حسینؑ نے آکر آواز دی زینب میرا آخری سلام۔

بس عزادارو! مجلس تمام ہو رہی ہے۔ اب بہن اور بھائی میں جدائی کا وقت آگیا۔ بہن میرا آخری سلام۔ مجھے رخصت کرو۔ بہن نے رخصت تو کر دیا مگر جب بھائی درِ خیمہ پر آیا تب بہن نے چادر سنبھالی اور درِ خیمہ تک آئی۔ بھیا گھبرایئے گا نہیں ابھی تو میں زندہ ہوں۔ یہ کہہ کر بازو تھاما۔ ماں جائے کو گھوڑے پر سوار کیا۔ کہا بھیا جاؤ خدا کے حوالے کیا۔ حسینؑ مقتل میں آئے مگر زینبؑ کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ جب دیکھا کہ ماں جایا نظر نہیں آتا تو ایک مرتبہ زینبؑ ایک بلندی پر آئیں۔ وہ منظر دیکھا کہ خدا کسی بہن کو نہ دکھلائے۔ بہن نے دیکھا کہ بھائی کا سر سجدہ میں ہے اور شمر خنجر لیے سرہانے کھڑا ہے۔ ایک مرتبہ آواز دی او پسرِ سعد! ارے میرا ماں جایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔

لو عزادارو! آخری مرحلہ تک بہن نے اپنے آخری وعدہ کو پورا کیا مگر میں جو آخری جملہ کہنا چاہتا ہوں اور جہاں بیان کو تمام کرنا ہے کہ جب حسینؑ وطن کو چھوڑ کر چل رہے تھے تو بہن تو ساتھ چلی مگر وہ نانی جو حسینؑ سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی اس کو حسینؑ نے سمجھایا کہ نانا اماں مصلحتِ پروردگار ہے کہ آپ وطن میں رہیں۔ میں جاؤں گا۔

ارے بیٹا جب تم قربان ہونے جا رہے ہو، بیٹا جب تم عراق اور کربلا جا رہے ہو تو نانی کو کیسے معلوم ہوگا کہ تم پر کیا گذر گئی۔ کیسے مجھے معلوم ہوگا کہ تم کس عالم میں ہو؟

حسینؑ نے کہا نانی، میں آپ کے حوالے خاکِ کربلا کیے جاتا ہوں۔ ہاتھ بڑھایا اور ایک مشتِ خاک اُٹھا کے جناب اُمِ سلمہ کے حوالے کر دی۔ کہا اس مشتِ خاک کو اپنے پاس رکھیے اور برابر دیکھیے گا کہ جب تک یہ خاک، خاک رہے آپ سمجھیں کہ آپ کا حسینؑ سلامت ہے، اور جب یہ خاک خون میں تبدیل ہو جائے تو سمجھے گا کہ آپ کا حسینؑ دنیا میں نہیں ہے۔

لو اربابِ عزا، عاشور کا دن آیا۔ اُمّ سلمہ بستر پر ہیں۔ آنکھ لگ گئی۔ پیغمبرؐ کو خواب میں دیکھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے، گریبان چاک، آستین اُلٹے ہوئے، گھبرا کے کہا، خدا کے حبیب! یہ آپ کا کیا عالم ہے؟

کہا اُمّ سلمہ، تم سو رہی ہو، میں لُٹ گیا، میرا گھر اُجڑ گیا۔ ارے میں کربلا سے آرہا ہوں۔ میرا حسینؑ مارا گیا۔

بس عزادارو! یہ سُننا تھا کہ گھبرا کے اُٹھیں، اب جو شیشے کو دیکھا تو کیا دیکھا کہ خون تازہ جوش مار رہا ہے۔

فریاد کی "واحسیناہ"۔

مدینہ کی بیبیاں جمع ہو گئیں۔ اُمّ المؤمنین! یہ نہ کہیے حسینؑ سفر میں ہیں کوئی اس طرح نہیں روتا ہے۔ خدا حسینؑ کو سلامت رکھے۔

کہا اب کیا دُعا کر رہی ہو۔ اب میرا حسینؑ کہاں رہ گیا۔

کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

کہا پیغمبرؐ نے مجھے بتایا ہے کہ میرا حسینؑ مارا گیا۔ یہ کہہ کر قبرِ پیغمبرؐ کے سرہانے آئیں۔

نہ سُن سکو گے روایت کا فقرہ۔

قبرِ پیغمبرؐ کے سرہانے آئیں۔ کہا اے خدا کے حبیبؐ! میں آپ کو آپ کے حسینؑ کا پُرسہ دینے آئی ہوں۔ یہ کہہ کر کہا واحسیناہ۔ قبرِ پیغمبرؐ لرزنے لگی۔

اے اُمّ سلمہ! میں کھڑا دیکھ رہا تھا جب میرا حسینؑ ذبح ہو رہا تھا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مجلس ۳

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ٥ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَہْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِہِمْ اَجْمَعِیْنَ ٥

اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفس مطمئن! پلٹ آ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

سورۂ مبارکہ فجر کی ان آخری آیات کریمہ کے ذیل میں "کربلا شناسی" کے عنوان سے جو سلسلۂ کلام تین دن پہلے شروع ہوا تھا اور جس کی تیسری کڑی آج آپ کے سامنے گذارش کرنا ہے وہ مسئلہ ہے "اسباب قیام" حسینؑ بن علیؑ کا۔ تفصیلات کو گذارش کرنے سے پہلے اپنے سامعین کے لیے چند الفاظ کی وضاحت کر دینا ضروری ہے تاکہ وہ کربلا کی حقیقت سے آشنا ہو سکیں۔

ہماری اصطلاح اور ہماری زبان میں کسی حکومت سے مقابلہ کرنے کے لیے اور اس کے مقابلہ پر اُٹھنے کے لیے مختلف قسم کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

اسی مقابلہ کو کبھی لفظ خروج سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ فلاں انسان نے فلاں حکومت سے خروج کیا ہے۔

اسی مقابلہ کو کبھی انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ فلاں نے حکومت کے مقابلہ میں انقلاب برپا کیا ہے اور دور حاضر میں اسی مقابلہ کے لیے بہترین لفظ دہشت گردی ہے۔

یعنی جب کسی حاکم کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ہمارے مقابلہ میں اُٹھنے والے ہماری حقیقت کو بے نقاب کر دیں گے تو ان کے قیام کے کامیاب ہونے سے پہلے انھیں یہ خطاب دے دیا جائے کہ یہ دہشت گرد ہیں۔ یہ دہشت گردی کرنے والے ہیں تاکہ عوام الناس ان کے قیام کی طرف اور ان کے انقلاب کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں اور ان کے بیان کو ناقابلِ سماعت قرار دے دیا جائے اور وہ ہمارے جن عیوب کا پردہ چاک کر رہے ہیں وہ عیوب پس پردہ ہی رہ جائیں اور کوئی ان کی حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے۔

یہ وہ مختلف تعبیرات ہیں جو ہمارے سامنے وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔ میں ان تفصیلات میں زیادہ وقت نہیں صرف کر سکتا لیکن بہر حال حقیقت کربلا کو سمجھانے کے لیے اپنے تمام سامعین کے لیے یہ لفظ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ پہلے آپ یہ پہچانیں کہ فرزند رسول الثقلینؑ نے اپنے دور کی حکومت کے مقابلہ میں جو آواز بلند کی ہے اس آواز کو خروج کہا جائے یا اس آواز کو قیام کہا جائے۔ اس آواز کو بغاوت کہا جائے یا اس آواز کو انقلاب کہا جائے؟

جس وقت امام حسینؑ نے یزیدیت کے خلاف آواز بلند کی ہے اس وقت یزید نے امام حسینؑ کے احتجاج کو جو نام دیا ہے وہ آپ سب جانتے ہیں کہ سارے شام میں اس بات کا بروپگنڈہ ہو رہا تھا کہ ایک خارجی نے حاکم وقت کے خلاف خروج کیا تھا اور ایسے انسان کا جو انجام ہوتا ہے وہی فرزندِ رسولؐ کا انجام ہوا۔

یعنی کل کی حکومت نے امام حسینؑ کے اقدام کا نام خروج رکھا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ کل بھی اور آج بھی تقریباً ہر انسان جب اس لفظ کو استعمال کرتا ہے تو اس کے ذیل میں یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ چونکہ حکومت برحق ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں جو بھی

اقدام ہوگا اسے خروج کا نام دیا جائے گا اور آج بھی یہ لفظ جہاں استعمال ہوتا ہے اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اگر حاکم حق بجانب ہے تو اس کے مقابلہ میں اُٹھنے والے کے قیام اور اقدام کو خروج سے تعبیر کیا جائے۔

اسی لیے میں آپ سے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں جب جناب مختار کے حالات نقل کیے جاتے ہیں تو عام طور سے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے خروج مختار۔ اس لفظ کو کل جن لوگوں نے جن مصلحتوں کے تحت استعمال کیا ہو۔ کل جناب مختار کے اقدام کے بارے میں یہ لفظ خروج جن مصلحتوں کے تحت استعمال کیا گیا ہو وہ میں نہیں جانتا۔ لیکن آج یہ لفظ خروج جس اعتبار سے استعمال کیا جاتا ہے اس اعتبار سے مختار کے قیام کو کسی قیمت پر خروج نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا خروج اس اقدام کو کہتی ہے جو کسی حق بجانب حکومت کے مقابلہ میں ہوتا ہے، لیکن جہاں باطل ہی باطل نظر آتا ہو، جہاں ظالم ہی ظالم اور غاصب ہی غاصب دکھائی دیتے ہوں ان کے خلاف انتقام کا نعرہ بلند کرنے والا ایک حق بجانب اقدام کرنے والا ہوگا اور اس کے اقدام کو کسی قیمت پر خروج نہیں کہا جا سکتا ہے۔

کل ایک دور تھا جب امام حسینؑ نے اقدام کیا تو ان کے اقدام کا نام خروج پڑا اور جب خونِ حسینؑ کے نام پر مختار نے قیام کیا تب ان کے اقدام کو اسی لیے خروج کہا گیا تاکہ دنیا کو یہ سمجھایا جائے کہ نہ وہ اقدام صحیح تھا جو یزید کے مقابلہ میں امام حسینؑ نے کیا تھا اور نہ یہ اقدام صحیح ہے جو قاتلانِ حسینؑ کے مقابلہ میں مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کر رہے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ ہے جس کو بغاوت اور انقلاب کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی طاقت کسی برسرِ اقتدار حکومت کے مقابلہ میں قیام کرتی ہے اور کوئی شخص حکومت وقت کے مقابلہ میں آواز بلند کرتا ہے تو اس اقدام کو دو نام بیک وقت ملتے ہیں۔

جو اقدام کرنے والے ہیں وہ اپنی آواز کو انقلاب کہتے ہیں، اور جو تخت و تاج پر قبضہ کرنے والے ہیں وہ اس آواز کو بغاوت کہتے ہیں۔

یہ الفاظ آپ سُنتے رہتے ہیں کبھی آپ نے ایسا نہ دیکھا ہوگا کہ جو مقابلہ میں اقدام کرنے والا ہو وہ اپنے اقدام کو بغاوت کہہ دے اس کا تو نعرہ ہی ہوتا ہے "انقلاب زندہ باد" جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اقدام کو انقلاب کہنا چاہتا ہے۔

اور یہ بھی ناممکن ہے کہ جو اقتدار پر قبضہ کیے ہوئے ہیں وہ اس آواز کو انقلاب کا نام دیدے اس لیے کہ اگر اس کا نام انقلاب ہوگیا تو اپنی حیثیت کیا رہ جائے گی، اپنی حقیقت کیا رہ جائے گی۔ لہٰذا یہ اپنے تخت و تاج کو حق بجانب بتانے کے لیے اسے بغاوت کہتا ہے اور جب تک یہ ٹکراؤ برقرار رہتا ہے۔ جب تک حکومت میں اور مقابل میں یہ ٹکراؤ جاری رہتا ہے یہ طے ہی نہیں ہوتا ہے کہ اُن کا نام صحیح ہے یا اِن کا نام صحیح ہے۔ ایک ہی حرکت کو، ایک ہی عمل کو اُدھر سے بغاوت کہا جاتا ہے اور اِدھر سے انقلاب کہا جاتا ہے اور یہ طے نہیں ہو پاتا کہ واقعاً اس کا نام انقلاب ہے یا اس کا نام بغاوت ہے۔

فیصلہ کب ہوتا ہے جب معرکہ تمام ہو جاتا ہے کہ اگر اقدام ناکام ہو جاتا ہے تو اسی اقدام کو بغاوت کہہ دیا جاتا ہے اور اگر اقدام کامیاب ہو جاتا ہے تو اسی اقدام کو انقلاب کہہ دیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملکوں میں بغاوت بار بار ہوتی ہے اور انقلاب ایک ہی دفعہ ہوتا ہے۔

ایک آواز اٹھی کامیاب نہ ہو سکی اسے بغاوت کہا گیا۔ دوسری آواز اٹھی کامیاب نہ ہو سکی اسے بغاوت کہا گیا۔ تیسری آواز اٹھی کامیابی نہ ملی اسے بغاوت کہا گیا۔ مگر جس دن تختہ اُلٹ گیا اب کوئی بغاوت نہیں کہتا اس لیے کہ کہنے والے چلے گئے۔ جو اس اقدام کو بغاوت کہنے والے تھے وہ تخت سے اُتر گئے۔ ان کا اقتدار ختم ہوگیا۔ اب کون کہنے والا ہے۔ اب تو دوسرے برسرِ اقتدار آگئے ہیں لہٰذا وہ اپنے اقدام کو جو نام دیں گے وہی نام ہو جائے گا۔ اب آنے والوں نے اعلان کیا "الحمد للہ" ہمارا انقلاب کامیاب ہوگیا۔ اب کوئی نہیں کہتا کہ ہماری بغاوت کامیاب ہوگئی

بغاوت سمجھتے ہوتے تو اقدام ہی کیوں کرتے۔ اگر اپنے عمل کو بغاوت کا نام دیا ہوتا تو اٹھتے ہی کیوں۔ اس لیے کہ بغاوت تو عام طور سے حق بجانب برسر اقتدار کے خلاف ہوتی ہے، لہٰذا وہ اپنے کام کو روز اول سے انقلابی تحریک کہہ رہے تھے جب تک کامیاب نہیں ہوئے جو تخت پر بیٹھا ہوا تھا وہ انھیں باغی قرار دے رہا تھا جس دن کامیاب ہو گئے انھوں نے اپنے اقدام کو انقلاب کا نام دے دیا اور اب بغاوت کہنے والا کوئی نہیں ہے۔

یہاں تک آنے کے بعد ایک جملہ کہہ کر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ آخر اس کے معنی کیا ہیں کہ جب اقتدار کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو اقتدار والے بغاوت کہتے ہیں، خروج کہتے ہیں اور اٹھنے والے انقلاب کہتے ہیں، احتجاج کہتے ہیں۔ اور جب بات تمام ہو جاتی ہے تو اگر آواز کو دبا دیا گیا تو بغاوت ناکام ہو گئی اور اگر اقتدار تخت چھوڑ کر الگ ہو گیا تو انقلاب کامیاب ہو گیا۔

یزید نے انتہائی ہوشیاری سے چاہا تھا کہ یہ اعلان کر دے کہ ایک باغی نے بغاوت کی تھی، ایک خارجی نے خروج کیا تھا تاکہ دنیا سمجھے کہ حسینؑ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ورنہ اگر کامیاب ہو گئے ہوتے تو پھر اس کا نام خروج نہ ہوگا۔ اگر کامیاب ہو گئے ہوتے تو اس کا نام بغاوت نہ ہوتا۔ یہ نام اسی لیے دیا گیا تھا کہ شامیوں کو، کوفیوں کو اور اس وقت کے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا جائے کہ اقتدار اپنے مقام پر باقی ہے اور حسینؑ جو اقدام کرنا چاہتے تھے وہ اقدام ناکام ہو گیا ہے اسی لیے حسینؑ کے اقدام کو خروج کہا گیا اور ان کے اقدام کو بغاوت کا نام دیا گیا۔

مگر فیصلہ یہ کرنا ہے کہ حسینؑ جب اٹھے تھے تو وہ واقعاً خروج تھا یا انقلاب تھا۔

امام حسینؑ نے پہلے دن جب انکار بیعت یزید کیا تو یہ آواز دی کہ مجھ جیسا انسان یزید کی بیعت نہیں کر سکتا ہے۔ یہ تخت حکومت اسلام پر بیٹھا ہے اور شراب پیتا ہے۔ تخت حکومت اسلام پر بیٹھا ہے اور بدکاری کرتا ہے۔ تخت حکومت اسلام پر بیٹھا ہے اور وحی خدا کا مذاق اڑاتا ہے۔ تخت حکومت اسلام پر بیٹھا ہے اور وحی خدا کو بے بنیاد قرار دے رہا

ہے۔ تنزیلِ الٰہی کا انکار کر رہا ہے۔

یہ جتنی باتیں اور جتنے خصوصیات امام حسینؑ نے یزیدی اقتدار کے بیان کیے اگر اسلام میں یہ خصوصیات باقی رہ گئے تو خارجی کا خروج ناکام ہوگیا۔ یعنی اگر آج بھی اسلام میں جُوا ہے۔ اگر آج بھی اسلام میں محرمات جائز ہیں تو خارجی کا خروج ناکام ہوگیا۔ اور صاحبِ اقتدار کا اقتدار باقی رہ گیا۔ لیکن اگر آج مسلمان ہمت نہیں کرتا کہ شراب کو جزوِ اسلام بنائے۔ بدکاری کو داخلِ اسلام قرار دے۔ محرماتِ پیغمبرؐ کو حلال بنائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انقلاب کربلا کامیاب ہوگیا اور اقتدارِ یزید بے نقاب ہوگیا۔

اسی لیے میں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے اور ایک درمیانی لفظ منتخب کیا ہے یعنی قیامِ حسینؑ بن علیؑ۔

امام حسینؑ نے ایسے حالات میں کیوں قیام کیا؟

اس کے بارے میں ہر فرقہ کے اور ہر جماعت کے علماء نے اور صاحبانِ نظر نے بحث کی ہے کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا؟

اس سوال کے پیچھے دو سوالات اور ہیں۔ ان دو سوالات پر بھی آپ نگاہ رکھیں گے۔ یہ سوال کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا یہ سوال پہلی دلیل ہے کہ اوروں نے نہیں کیا۔ میری بات ضائع نہ ہونے پائے۔

امام حسینؑ کے بارے میں یہ سوال کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا، کیوں اقدام کیا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ امام حسینؑ کے علاوہ اور جتنے ذمہ دارِ دین و مذہب بنے ہوئے تھے چاہے ذاتی طور پر، چاہے وراثتی اعتبار سے کسی اور نے قیام نہیں کیا ورنہ اگر اور بھی قیام کرنے والے ہوتے تو پھر یہی سوال کیوں ہے کہ امام حسینؑ نے قیام کیوں کیا۔ یہ بھی سوال ہوتا کہ عبداللہ بن زبیر نے کیوں قیام کیا۔ یہ بھی سوال ہوتا کہ فلاں فلاں نے کیوں قیام کیا۔ فلاں باپ نے بیٹے اور فلاں انسان نے کیوں قیام کیا۔ یہ سوال نہ ہونا خود اس بات کی علامت ہے کہ اس دور میں یزید کے خلاف بولنے والا ایک ہی انسان تھا دوسرا کوئی انسان نہیں تھا۔

یہ سوال کی پہلی بنیاد ہے اور دوسری بنیاد یہ ہے کہ یہ سوال جو ہوا کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا۔ اس سوال کے پیچھے مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حالات کیا تھے۔ حالات تو سب جانتے ہیں، حالات سب کو معلوم ہیں، کہ حالات کیا تھے، دین کا عالم کیا تھا، مذہب کا عالم کیا تھا، عوام کا عالم کیا تھا، اس کی تفصیل میں ابھی آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔ یہ ساری ہمدردی جو پیدا ہوئی ہے کہ امام حسینؑ نے ایسے بدترین حالات میں اتنی شدید مخالفت کے باوجود کیوں قیام کیا۔ اس ہمدردی کی بنیاد یہ ہے کہ امام حسینؑ کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ ان حالات میں جو انسان بھی قیام کرے گا، جو انسان بھی اقدام کرے گا وہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ ساری پریشانی اور ساری ہمدردی عالم اسلام میں اتنی ہی ہے کہ امام حسینؑ جانتے تھے کہ حالات ایسے ہیں کہ یزید کا اقتدار کامیاب ہو گیا ہے۔ لوگ اسے خلیفۃ المسلمین ماننے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ دین فروشی عام ہو گئی ہے۔ سکوں کے سیلاب میں ایمان بہے جا رہے ہیں تو ایسے موقع پر کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ امام حسینؑ بھی اسی راستے پر چلے جاتے جس راستے پر لوگ جا رہے تھے اور کم از کم اس دور میں رہنے کے اعتبار سے امام حسینؑ یہ منظر تو دیکھ رہے تھے کہ جدھر ساری دنیا جا رہی ہے اگر ہم اس کے ساتھ نہ جائیں گے تو ہمارا انجام کیا ہو گا۔ نہ ہم رہ جائیں گے نہ گھر رہ جائے۔ نہ اولاد رہ جائے گی نہ اصحاب رہ جائیں گے نہ انصار رہ جائیں گے۔ سب قربان ہو جائیں گے۔ تو ایسے حالات میں امام حسینؑ کو نہیں اُٹھنا چاہیے تھا۔

ہر ایک کو فکر ہے امام حسینؑ کی زندگی کی۔ کاش میری بات آپ پر واضح ہو جائے جتنے ہمدردی کرنے والے ہیں سب کو ایک ہی خیال ہے کہ اگر نہ اٹھے ہوتے تو زندہ رہتے شاید یہ خیال ہے کہ ہزار سال زندہ رہتے، دو ہزار سال زندہ رہتے۔ پتہ نہیں کب تک زندہ رہتے۔

وہ جو کائنات کا سب سے عظیم ترین انسان تھا جو حسینؑ کے جد بزرگوار تھے وہ تو ۶۳ سال کے آگے زندہ نہ رہے۔ اگر امام حسینؑ نہ بھی اُٹھتے تو کتنے سو برس زندہ رہتے، کتنے ہزار سال زندہ رہتے۔ ایک نظام قدرت ہے جو دنیا میں آیا ہے اسے دنیا سے جانا

ہے۔ مگر ہمدردی کرنے والوں کے ذہن میں ایک ہی خیال ہے کہ اگر امام حسینؑ نہ اُٹھتے تو جان بچ جاتی۔ زندگی رہ جاتی۔ اس دنیا میں رہتے۔ آرام رہتا۔ سکون رہتا۔ کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ یعنی ہر ہمدردی کرنے والے کو ایک خیال ہے کہ امام حسینؑ کی زندگی رہ جائے۔ کوئی امام حسینؑ سے پوچھے کہ آپ نے کیوں قیام کیا۔ کہا میرے اور ان کے سوچنے کا فرق یہی ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ میں رہ جاؤں اور میں چاہتا ہوں کہ نانا کا دین رہ جائے۔ یہ میری زندگی کی فکر میں ہیں اور میں دینِ خدا کی زندگی کی فکر میں ہوں۔ یہ چاہتے ہیں کہ میری جان بچ جائے اور میں چاہتا ہوں کہ ایمان بچ جائے۔ یہ دونوں فکریں الگ الگ ہیں اور یہ ایک پورا سلسلہ ہے جس کے عرض کرنے کا آج موقع نہیں ہے۔ آج میں اس پوری بحث کو مختصر انداز سے سہی لیکن گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

امام حسینؑ کے قیام کے بارے میں یہ سوالات جو اٹھے تو دس طرح کی تاویلیں کی گئیں یعنی دس خیالات سامنے آئے ہیں علاوہ ان مہمل خیالات کے جو وقتی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں کہ جب لوگوں نے اشتراکیت اور کمیونزم کو آگے بڑھانا چاہا تو کہا کہ امام حسینؑ نے خود بھی قیام کیا تھا کہ عوام کو روٹی کپڑا نہیں مل رہا تھا۔ یہ تو وہ سطحی فکر ہے جو حالات کی پیداوار ہے جس کے پیچھے نہ کوئی بنیاد ہے، نہ اس کی کوئی واقعیت ہے۔ لیکن وہ باتیں جو صاحبانِ فکر نے اور اسلام کے پڑھنے والوں نے تاریخ کے جاننے والوں نے بیان کی ہیں امام حسینؑ کے قیام کے بارے میں وہ دس اسباب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے وہ اسباب بھی رکھوں اور ان کا تجزیہ بھی تاکہ آپ کے علاوہ بھی جو سننے والے ہیں وہ واقعہ کربلا کی بنیادوں کو محسوس کر سکیں۔

پہلی بات بعض صاحبان نظر اور بعض اہل قلم نے یہ کہی کہ آپ لوگ اس واقعہ کو اتنی کیوں اہمیت دیتے ہیں کہ دو طاقتیں تھیں باطل اور حق، اسلام اور کفر، ایمان اور نفاق اور ان میں ٹکراؤ ہوا۔

یہ کچھ نہیں تھا یہ تو ایک اتفاقی واقعہ تھا۔

دورِ حاضر میں اس خیال کو مختلف انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی

ہے کہ امام حسینؑ اپنے راستے جا رہے تھے اور اُدھر کا لشکر اپنے راستہ جا رہا تھا۔ راستہ میں اتفاق سے دونوں میں ٹکراؤ ہو گیا۔ کچھ بات آگے بڑھ گئی اور مقابلہ ہو گیا قصہ ختم ہو گیا۔

راستہ میں ایکسیڈنٹ کیسے ہوتے ہیں۔ اُن کی گاڑی اُدھر سے آ رہی ہے اِن کی گاڑی اِدھر سے آ رہی ہے۔ قاعدے سے اُن کو اُدھر جانا چاہئے اِن کو اِدھر جانا چاہئے انھوں نے بھی طے کر لیا کہ اِدھر ہی سے جائیں گے۔ انھوں نے بھی طے کر لیا کہ اِدھر ہی سے جائیں گے آخر میں دونوں گاڑیوں میں ٹکراؤ ہو گیا۔

یعنی یہ سمجھے کہ کربلا کا واقعہ جیسے دو گاڑیوں کا ایکسیڈنٹ ہے۔ یہ وہ نادان انسان ہیں، یہ وہ جاہل انسان ہیں جنھوں نے کربلا کو دیکھا، کربلا کے سارے پس منظر کو بھلا کے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف کربلا ہے نہ مکہ کوئی شے ہے نہ مدینہ کوئی شے ہے نہ کوفہ کوئی چیز ہے نہ شام کوئی چیز ہے۔ دو لشکر زمین سے پیدا ہوئے یا آسمان سے اُترے تھے اور وہیں ٹکراؤ ہو گیا۔

یہ تو ایسا جاہل انسان کہہ سکتا ہے جس نے اسلام کی تاریخ میں کچھ پڑھا ہی نہ ہو۔ جو نہ مکہ جانتا ہو نہ مدینہ جانتا ہو، نہ کوفہ و شام کو جانتا ہو، اس نے فقط کربلا کا واقعہ ایک دن ایک دوپہر میں دیکھا ہو۔

ایسے جاہل انسان کی گفتگو قابلِ بحث بھی نہیں ہو سکتی۔

دوسرا مسئلہ جس کو اشتراکی ذہن والوں نے ذرا سنجیدہ بنا کر پیش کیا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ جب ٹکراؤ ہوتا ہے تو ہمیشہ اونچے اور نیچے طبقات میں ہوتا ہے جو اشتراکیت کا فیصلہ ہے۔ ایک طبقہ سرمایہ داروں کا اور ایک طبقہ فقیروں کا۔ ظاہر ہے کہ نہ فقیروں کا طبقہ سرمایہ داروں کو برداشت کرتا ہے اور نہ سرمایہ دار یہ چاہتے ہیں کہ فقیر سر اُٹھا سکیں۔ تو دنیا میں جب بھی کوئی ٹکراؤ ہوتا ہے، کوئی مقابلہ ہوتا ہے تو ہمیشہ اونچے اور نیچے طبقات میں ہوتا ہے۔ ایک طرف سرمایہ دار ایک طرف غریب فقیر مزدور۔ یہ دونوں ٹکرا جایا کرتے ہیں۔ اُس

دور میں بھی یہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک طرف دولتمندوں کا، سرمایہ داروں کا طبقہ تھا اور ایک طرف غریب مفلس عوام تھے جو مزدوروں پر ظلم کرنا شروع کیا اور مزدوروں کی حمایت میں کوئی آواز اٹھانے والا نہ ملا تو امام حسینؑ نے ان کو سہارا دے دیا۔

گویا امام حسینؑ مزدوروں کے نمائندے تھے اور یزید سرمایہ داروں کا نمائندہ تھا۔ مزدور اور سرمایہ دار میں ہر جگہ لڑائی ہوتی ہے لہٰذا وہاں بھی ایک ٹکراؤ ہو گیا اور ظاہر ہے کہ ٹکراؤ کے بعد بالآخر کوئی نہ کوئی تو منظر عام پر آ ہی جائے گا اور کوئی نہ کوئی منظر عام سے ہٹ جائے گا۔

یہ وہ نادان افراد ہیں جنھوں نے واقعۂ کربلا کو دو طبقات کے ٹکراؤ کا نام دینا چاہا ہے کہ ایک طرف سرمایہ داروں کا طبقہ ہے، اونچے لوگ، پیسے والے، دولت والے اور ایک طرف غریب مزدور، مفلس عوام۔ لہٰذا ایسے مقابلے تاریخ میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور جب ایسا کوئی مقابلہ ہو گا تو عام طور سے ہوتا یہی ہے کہ مزدور دب جاتے ہیں اور سرمایہ دار اپنے اقتدار کی گرفت کو مضبوط کر لیتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سرمایہ داروں کا تختہ الٹ جاتا ہے اور مزدور برسراقتدار آجاتے ہیں مگر یہ ٹکراؤ ویسا ہی ہے جیسے دنیا میں ہر ٹکراؤ طبقات کے درمیان ہوتا ہے۔ مگر عزیزو! یہ تمام کہنے والے اس حقیقت سے غافل ہو گئے کہ دنیا میں جب مزدور اور سرمایہ دار کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ بھی دو پہلوانوں کی کشتی نہیں ہوتی ہے۔ دو بہادروں کی لڑائی نہیں ہوتی ہے۔ وہ بھی دو نظریات کی جنگ ہوتی ہے۔ وہ بھی دو نظریات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ سرمایہ دار یہ سمجھتا ہے کہ مزدور کا خون چوس لینا ہمارا حق ہے اور مزدور یہ سوچتا ہے کہ جب ساری پیداوار ہماری محنت کا نتیجہ ہے تو اس ظالم کو قبضہ کرنے کا حق کیا ہے۔

اگر آپ نے ان نظریات کو پڑھا ہے یا جن لوگوں نے پڑھا ہے وہ ان حقائق کو جانتے ہیں کہ یہ ٹکراؤ طاقتوں کی لڑائی نہیں ہے، دو پہلوانوں کی کشتی نہیں

ہے۔ یہ بھی دو نظریات ہیں۔ ایک طرف سرمایہ دار ہوتے ہیں جن کا منشا یہ ہوتا ہے کہ کارخانے میں کام کرنے والے، فیکٹری میں محنت کرنے والے جتنی پیداوار بڑھائیں، جتنا پروڈکشن کریں وہ اگرچہ انہی کی محنت کا نتیجہ ہے لیکن جتنا بھی آجائے اس میں سے دو چار پیسے دے کر انھیں رخصت کر دیا جائے اور باقی پر ہم قبضہ کر لیں تاکہ ہم سرمایہ دار کہے جائیں اور یہ مزدور کہے جائیں۔ اور مزدور کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ جب ساری پیداوار اور سارا سرمایہ ہماری محنت کا نتیجہ ہے تو پیداوار ہماری ہے یہ قبضہ کرنے والا کون ہے۔ ہماری محنت سے پیدا ہونے والا سرمایہ ہم مزدوروں پر تقسیم ہونا چاہیے۔ اگر یہ انتظام کرنے والا ہے تو بقدر انتظام دولت اس کو دیدی جائے باقی ہمارا سرمایہ ہمارے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ تو یہ بھی دو نظریات کا ٹکراؤ ہوتا ہے، ایک نظریہ سرمایہ داری کے حق میں ہوتا ہے اور ایک نظریہ مزدور کے حق میں ہوتا ہے۔ تو اگر یہ دنیا یہ کہنا چاہتی ہے کہ دو طبقات ٹکرا رہے تھے تو بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام میں جو طبقہ سرمایہ دار بنا وہ کیسے بنا اور اسلام میں جس طبقہ کو مزدور کہا گیا وہ کیسے بنا۔ یعنی اسلام میں سرمایہ دار حق بجانب ہوتا ہے یا مزدور حق بجانب ہوتا ہے۔ اگر اسلام نے سرمایہ داری کو جائز قرار دیا ہے تو اقتدار حق بجانب تھا اور اس آواز کو نہیں اٹھنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر اسلام نے روز اول یہ اعلان کر دیا تھا کہ ــــــ مزدور کا پسینہ خشک نہ ہونے پائے اور اس کی اُجرت اسے دیدی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیر اسلام کی نمائندگی کر رہا تھا جو سرمایہ دار بنا ہوا تھا اور وہ اسلام کا علمبردار تھا جو ایسے تخت و تاج کو مٹا دینا چاہتا تھا۔

عزیزان محترم! اب میں بات کو مجلس کے ذوق سے قریب تر کرنے کے لیے ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں آپ پہچان لیں گے کہ اسلام کس کی حمایت کرتا ہے اور اس کا ذاتی نظریہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اللہ نے اپنے حبیبؐ کو اس کائنات کا اختیار دیا۔ دنیا کا اختیار،

آخرت کا اختیار، پیغمبرؐ اسلام کے پاس کیا نہیں تھا۔ وہ انسان جس کو ایک رات میں پروردگار عرش اعظم تک لے جائے اور ساری کائنات اس کے قدموں کے نیچے آجائے۔ اس سے بڑا دولت والا کون ہو سکتا ہے، اس سے بڑا سرمایہ کس کے پاس ہوگا، اس سے زیادہ مال کس کے پاس ہوگا۔ دنیا کا سارا سرمایہ اس کے قبضے میں، آخرت اس کے ہاتھوں میں۔ جبرئیلؑ امین نے خزائن عرش کی کنجیاں اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیں تو دولت کے اعتبار سے نبیؐ سے بڑا دولت والا کوئی نہیں۔ مال کے اعتبار سے نبیؐ سے بڑا مال دار کوئی نہیں۔ اقتدار کے اعتبار سے سرکارؐ سے بڑا اقتدار والا کوئی نہیں ہے۔ مگر یہ تاریخ پڑھنے والے اور قرآن کی تلاوت کرنے والے جانتے ہیں کہ اتنا بڑا اقتدار رکھنے والے پیغمبرؐ نے قوم کے سامنے اپنے کو سرمایہ دار بنا کے پیش نہیں کیا بلکہ جب رسالت کی اُجرت مانگی تو اپنے کو مزدور بنا کے پیش کیا ہے اس لیے کہ اُجرت مزدور مانگتا ہے سرمایہ دار نہیں مانگتا ہے۔

البتہ مزدور اس معنی میں نہیں جس معنی میں ہم لفظ کو استعمال کرتے ہیں بلکہ محنت کرنے والا، زحمت برداشت کرنے والا، مشقتوں کا سامنا کرنے والا، اتنی محنت کہ قوم نے خود آکے کہا حضور آپ نے بڑی زحمت برداشت کی ہے اس کی اُجرت لے لیجئے ورنہ قاعدے سے کہنا چاہئے تھا کہ نذرانہ لے لیجئے اس لیے کہ سرمایہ داروں کو نذرانہ دیا جاتا ہے اُجرت نہیں دی جاتی ہے۔ دولت مندوں کے سامنے تحفہ پیش کیا جاتا ہے اُجرت نہیں دی جاتی ہے۔ یہ اُجرت کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ نبیؐ دنیا کے سامنے ایک محنت کش انسان کی شکل میں آنا چاہتے ہیں کہ ہم نے زحمت برداشت کی ہے۔ ہم نے محنت کا سامنا کیا ہے۔ ہم غیروں کے مال پر قبضہ کر کے کسی انسان کو دولت مند یا سرمایہ دار نہیں بننے دیں گے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کا افتخار وہ کردار نہیں ہے جس نے دولت اکٹھا کر کے اپنے کو سرمایہ دار بنا لیا تھا۔ ہماری تاریخ کا افتخار وہ کردار ہے کہ جس کے پاس دورِ قدیم سے اگر بچا ہوا سرمایہ ہے بھی تو نبیؐ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ اسلام میں دولت مند کی قیمت نہیں ہے اس خدیجہ کی قیمت

ہے جس نے دولت کو راہِ خدا میں لٹا دیا۔

لہٰذا اسے دنیا کے عام نظریات کے اعتبار سے طبقاتوں کی جنگ قرار دینا واقعہ کربلا کی ان اساسوں اور بنیادوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے جن بنیادوں پر یہ واقعہ قائم ہوا تھا۔

تیسرا مسئلہ۔ بعض لوگوں نے کہا کہ امام حسینؑ اس لیے اُٹھے تھے کہ شہادت میں ثواب بہت ہے یعنی مسئلہ مختصر ہو گیا۔ پیغمبرؐ اسلام کی زبان سے، قرآن مجید کی زبان سے، حسینؑ بن علیؑ یہ بات سُن چکے تھے کہ شہادت میں اجر بہت ہے۔ شہید زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ شہید کو مرنے کے بعد بھی روزی ملتی رہتی ہے۔ شہید اللہ کی بارگاہ میں مقرب ہوتا ہے تو چونکہ شہادت میں ثواب زیادہ ہے لہٰذا امام حسینؑ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ زندہ نہیں رہوں گا مگر شہید تو ہو جاؤں، ثواب تو مل جائے گا۔

غور کیا آپ نے؟ یعنی نہ اس کے پیچھے کوئی اسلام ہے نہ کوئی کفر۔ نہ کوئی مجاہدہ ہے نہ کوئی انقلاب۔ کچھ نہیں۔ ایک ثواب شہادت کے حاصل کرنے کے لیے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے کہ راہِ خدا میں شہید ہونے والے مُردہ نہیں ہوتے۔ راہِ خدا میں مر جانے والوں کو حیاتِ جاودانی ملتی ہے۔ راہِ خدا میں قتل ہو جانے والوں کو رزق بے حساب ملتا ہے۔ ان پیغامات کو دیکھ کر امام حسینؑ اُٹھ کھڑے ہوئے ثوابِ شہادت لینے کے لیے۔ مگر عزیزو! اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک جملہ کہوں۔

ٹھیک ہے یوں ہی سہی، اگر مورخ یہی کہہ کر خوش ہو جاتا ہے کہ امام حسینؑ نے آیات میں دیکھا، روایات میں دیکھا کہ شہادت میں ثواب بہت ہے۔ لہٰذا اس ثواب کی خاطر اُٹھ کھڑے ہوئے تو کیا یہ قرآن تنہا حسینؑ نے پڑھا تھا۔ کیا یہ آیتیں الگ سے امام حسینؑ پر نازل ہو گئی تھیں۔ ارے اسی قرآن کی آیتیں تو ہیں جو حسینؑ کو چھوڑ کر بھی امت کے لیے کافی ہے۔ یہ اسی قرآن کی آیتیں ہیں جو ہر مسلمان پڑھ رہا تھا۔ جس کی تلاوت ہر گھر میں ہو رہی تھی۔ تو اُن آیتوں کو پڑھنے کے بعد شوقِ شہادت حسینؑ میں پیدا ہوا تو باقی مسلمانوں میں کیوں نہیں پیدا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن

پڑھنا ہر ایک کے بس کا کام ہے، سمجھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور اگر سمجھ لین بھی ہر ایک کے بس میں ہو تو عمل کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔

یہ حسینؑ کا امتیاز تھا کہ قرآن پڑھا بھی، قرآن سمجھے بھی، اور قرآن کو اپنے کردار میں مجسم بھی بنا دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ثواب شہادت راہ خدا میں مسلمان کو قربانی پر آمادہ کرتا ہے مگر انسان خالی ثواب کے لیے بے مقصد اٹھ کھڑا ہو تو اسے شہادت بھی نہیں کہتے ہیں۔ شوق شہادت شوق خودکشی نہیں ہے۔ شوق شہادت کسی مقصد کی راہ میں قربانی کا نام ہے۔ اگر مقصد کے لیے قربانی دے گا اور اگر خالی مرنے کے لیے قربان ہو جائے گا تو اسے خودکشی کہا جائے گا، شہادت نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا اگر امام حسینؑ شوق شہادت میں اٹھے ہیں تو شوق شہادت طے کرنے سے پہلے اس مقصد کو دیکھنا ہوگا کہ جس پر قربان ہونے والے کو شہید کہا جاتا ہے لہٰذا پھر بات ابھی باقی رہ گئی۔

چوتھا مسئلہ۔ بعض لوگوں نے کہا یہ امام حسینؑ کا الگ سے ایک فریضہ تھا کہ راہِ خدا میں قربان ہو جائیں۔ یعنی جیسے ہر انسان کے کچھ مخصوص فرائض ہوتے ہیں۔ ہر انسان کے کچھ مخصوص وظائف اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اسی طرح امام حسینؑ کا ایک وظیفہ اور ان کی ایک ذمہ داری یہ تھی کہ وہ راہِ خدا میں قربان ہو جائیں۔ جو حسینؑ جانتے تھے، حسین کا خدا جانتا تھا، حسینؑ کا نانا جانتا تھا اور انھیں بتا دیا تھا کہ بیٹا یہ سب کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ تم راہِ خدا میں قربان ہو جاؤ لہٰذا اس فریضہ کو ادا کرنے کے لیے امام حسینؑ اٹھ کھڑے ہوئے۔

یعنی نانا نے یہ تو بتایا کہ یہ تمھارا فریضہ ہے کہ جان دے دینا لیکن یہ نہ بتایا کہ کب اور کیوں؟

غور کر رہے ہیں آپ؟۔ یہ تو بتایا کہ یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ تم جان دیدینا مگر کب [illegible]

ان بنیادوں کو پہلے تلاش کرو کہ جن کے بارے میں پیغمبرؐ نے کہا تھا کہ بیٹا جب ایسا وقت آجائے، جب ایسا موقع آجائے تو جان قربان کر دینا۔

آپ نے مسئلہ شہادت کو سطحی بنا دیا ہے لیکن آپ اس بنیاد کو تلاش کریں جس بنیاد کا حوالہ خدا نے دیا تھا، یا نبیؐ نے دیا تھا۔ کہ ایسا موقع آجائے تو دینِ خدا کی راہ میں قربان ہونا ہے۔

اس کے بعد ایک نظریہ اور ہے کہ امام حسینؑ جب یزید کو دیکھتے تھے اور اپنے کو دیکھتے تھے تو دیکھتے تھے کہ یزید ایسا خبیث انسان، ایسا خسیس انسان، ایسا ذلیل انسان صاحبِ اقتدار ہو گیا اور مجھ جیسا شریف النفس انسان، مجھ جیسا صاحبِ کمال، صاحب شرف، صاحبِ عزت انسان اقتدار سے محروم رہ گیا کہ اسے محکوم بنایا جا رہا ہے اور ایسے خبیث اور ذلیل انسان حاکم بن گئے ہیں تو حسینؑ کی شرافت نفس نے گوارا نہیں کیا کہ تخت اسلامی پر ایسے خبیث انسان کو دیکھیں اور انھوں نے قیام کر دیا۔

غور کیا آپ نے؟ یعنی لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ دو نفسوں کی نفسانیت تھی۔ اُس نفس کا تقاضا یہ تھا کہ ایسے کے اقتدار کو برداشت نہ کرو یعنی بجائے دین و مذہب کے اسے نفسانیت کی جنگ بنا دیا جائے کہ اس کی نفسانیت کا تقاضا وہ تھا اور ان کے نفس کا تقاضا یہ تھا لہٰذا وہ قبضہ کرنا چاہتا تھا اور یہ اس کے قبضہ کو ہٹا دینا چاہتے تھے۔

ارباب نظریہ وہ انسان ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی میں کوئی کام نفس سے ہٹ کر نہیں کیا۔ چونکہ اپنی ساری زندگی کو نفس میں ڈوبا ہوا دیکھا ہے لہٰذا یہ چاہتے ہیں کہ فرزند رسول الثقلین کے اقدام کو بھی نفسانیت کا نتیجہ بنا دیا جائے۔ حالانکہ میں ابھی گزارش کروں گا کہ اگر بات نفس ہی تک آجائے، اگر یہی کہا جائے کہ وہ اُس نفس کا تقاضا تھا اور یہ اِس نفس کا تقاضا ہے۔ تو اتنا ماننا پڑے گا کہ وہ نفس کچھ اور ہے اور یہ نفس کچھ اور ہے۔ وہ نفس اگر اقتدار چاہتا

نفس اگر اقتدار کو برداشت نہیں کرتا ہے تو بربنائے نفسانیت نہیں ہے، اس کی بنیاد کچھ اور ہے۔ اور اس کو میں نہ کہوں گا ابن سعد سے پوچھو کہ دونوں نفسوں کا فرق کیا ہے۔ آخری گفتگو جب صلح کی امام حسینؑ کی ابن سعد سے تمام ہو گئی اور ابن سعد نے یہ دیکھ لیا کہ حسینؑ بیعت کرنے والے نہیں ہیں تو ابن سعد نے ابن زیاد کو آخری خط لکھا جس کے بعد شمر آیا اور وہ آخری مرحلہ بھی سامنے آ گیا۔ تو ابن سعد نے خط لکھا، کیا لکھا "اِنَّ الْحُسَيْنَ لَا يُبَايِعُ"۔ اے حاکم ہم بات چیت کر کے، کوشش کر کے تھک چکے ہیں، حسینؑ بیعت نہیں کریں گے۔ بعض تاریخوں میں یہ لفظ ہے کہ ابن سعد نے لکھا "اِنَّ الْحُسَيْنَ لَا يُبَايِعُ" حسینؑ بیعت نہیں کریں گے۔ اور بعض لفظیں بدل کر لکھتے ہیں "اِنَّ الْحُسَيْنَ لَا يَسْتَسْلِمُ" حسین تسلیم نہیں ہو سکتے۔ حسینؑ اپنے کو حکومت کے حوالے نہیں کر سکتے۔ کیوں؟ نفسانیت کی بنیاد پر؟ کسی ضد کی بنا پر؟ کسی انا کی بنا پر؟ کیوں؟ ابن سعد کہتا ہے "اِنَّ بَيْنَ جَنْبَيْهِ نَفْسُ اَبِيْهِ" اے حاکم ہوشیار ہو جا اب کوشش بیکار ہے، حسینؑ بیعت نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ حسینؑ کے دونوں پہلوؤں کے درمیان ان کے باپ کا نفس ہے۔ حسینؑ کے پہلو میں علیؑ کا دل ہے۔ میں کہوں گا ابن سعد! یہ تو کیا لکھ رہا ہے۔ کچھ تو ہوش کی دوا کر۔ اگر پہلو میں علیؑ کا دل ہے تب تو بیعت کر ہی لیں گے۔ یہ تو نے کیا لکھ دیا یہ اس لیے بیعت نہیں کریں گے کہ ان کے پہلو میں علیؑ کا دل ہے۔ ارے علیؑ کی تاریخ تو کتابوں میں موجود ہے۔ علیؑ کے بارے میں تو کتابوں میں آج تک موجود ہے اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں کہ بالآخر علیؑ نے اقتدار کی بیعت کر لی تو لکھنا چاہیے کہ اب مطمئن ہو جا یہ بیعت کر لیں گے اس لیے کہ ان کے پہلو میں باپ ہی کا دل تو ہے مگر ابن سعد کا یہ کہنا آج اور کل دونوں کا فیصلہ کر رہا ہے۔ یعنی آج پہچان لے کہ حسینؑ بیعت نہ کریں گے اور ماضی کو بھی پہچان لے کہ حسینؑ کے باپ نے کسی کی بیعت نہیں کی ہے۔

لہٰذا حسینؑ کا نفس، نفس یزید سے مختلف ہے۔ وہ نفس اور ہے اور یہ وہ نفس ہے جس کو ابن سعد نے علیؑ کا نفس قرار

ہو جاتا ہے اور آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ جب نفسِ حسینؑ کو پہچان لیا کر جن کا قاتل، جن کا دشمن یہ کہتا ہے کہ یہ نفسِ حسینؑ، نفسِ علی ہے تو اب ایک جملہ اور آگے بڑھ جائیے۔ نفسِ علیؑ کو پہچان لیجیے۔ توجہ کر رہے ہیں یا میں لفظیں بدل دوں۔ کہ اگر نفسِ حسینؑ کو پہچاننا ہے تو کربلا کی رات کو دیکھو، اور اگر نفسِ علیؑ کو پہچاننا ہے تو ہجرت کی رات دیکھو۔ یہ وہ نفس ہے کہ جب بکا تو رضائے الٰہی لے کر بکا۔ تو جس نے اپنے نفس کا سودا رضائے خدا سے کیا ہو اس میں انانیت تلاش کر رہے ہو۔ یہ اسی نفس کا نتیجہ تھا کہ خدا نے آواز دی پلٹ آ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔

بات بہت تفصیلی ہے اور ساری باتوں کے عرض کرنے کا موقع بھی نہیں ہے لہٰذا خاتمۂ کلام میں دو لفظیں اور گذار کر دوں تاکہ بات کسی نہ کسی رُخ سے مکمل ہو جائے۔

ایک خیال یہ ہے کہ حسینؑ بن علیؑ ہر مسلمان کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری رکھتے تھے۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جہاں اچھائیوں پر عمل نہ ہو رہا ہو اچھائیوں پر عمل کرانے کی کوشش کرے۔ جہاں بُرائیاں ہو رہی ہوں وہاں برائیوں کو روکے، ان کا سدِّ باب کرے۔ یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اب کوئی کرتا ہے کوئی نہیں کرتا ہے۔ جیسے ہمارا معاشرہ ہے کہ مسلمان سب ہیں، مومن سب ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب سب پر ہے۔ مگر کرنا چاہیے مولانا کو اور وہ بھی محرم کی مجلسوں میں نہیں۔ اس لیے کہ اس میں ہم بھی آتے ہیں۔ بہت سے مومنین کو یہ پریشانی ہے کہ آپ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ہے تو سارا سال پڑا ہوا ہے۔ جب ہم نہ آتے ہوں تب کہیے۔ واجبات کیا ہیں، جب ہم نہ آتے ہوں تب کہیے۔ محرمات کیا ہیں یعنی ہم کو تارک واجب رہنے دیجیے۔ ہم کو حرام کاری کرنے دیجیے۔ آپ کچھ نہ بولیے گا جب ہم نہ آئیں تو کہہ لیجیے گا۔

توجہ کی آپ نے واجب سب پر ہے مگر کرنا چاہیے ایک کو۔ وہ بھی ہم سے پوچھ کے کب، کب نہیں۔

یہی بات امام حسینؑ کے بارے میں کہی گئی کہ امام حسینؑ ایک مسلمان تھے اور

مسلمان پر واجب تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ یہ کام نہیں ہو رہا ہے تو انھوں نے طے کیا کہ باقی لوگ اپنے فرائض پر عمل کریں یا نہ کریں مگر میں سچا مسلمان ہوں۔ میرا کام ہے لہٰذا میں اٹھ گیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے۔ مگر عزیزو! یہاں بھی ایک بات یاد رکھیں گے۔ بیشک امام حسینؑ نے خود بھی یہ کہا ہے کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہاں ایک دقیق مسئلہ ہے اور شاید میں آج بات کو یہیں پر تمام کردوں گا اگر موقع ہوا تو کل مزید وضاحت کروں گا۔

سب جانتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلامی واجبات میں ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے اس کے شرائط ہیں اور شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر آپ کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ ہو، وہمی خطرہ نہیں۔ ورنہ اگر وہمی خطرہ جواز بن جائے گا تو ہر مومن اپنے کو خطرہ میں سمجھے گا۔

ارے بھائی اگر بیوی سے پردے کے لیے کہیں گے تو وہی ناراض ہو جائے گی۔ اس سے بڑا خطرہ کیا ہے۔ یہ خطرہ تو سوائے مولانا کے کوئی مول نہیں لے سکتا۔ کسی شوہر صاحب میں، کسی باپ صاحب میں یہ ہمت نہیں ہے اس مصیبت کے لیے اللہ نے مجھ ہی کو پیدا کیا ہے تو میں ہر بلا کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خیر ان موضوعات کو نہیں چھیڑوں گا ورنہ بہت سے لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ "اللہ ہی ناراض رہے وہی کافی ہے بعض مومنین کے لیے۔" خیر

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ امر بالمعروف کے لیے شرط ہے کہ اگر ضرر ہے، خطرہ ہے، نقصان ہے تو امر بالمعروف آپ پر واجب نہیں ہے۔ تو اگر امام حسینؑ فقط امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اٹھے تھے تو جب انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ جان کا خطرہ ہے۔ جب انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ گھر کے اجڑ جانے کا خطرہ ہے۔ اولاد کے قتل ہو جانے کا خطرہ ہے، اصحاب کے مر جانے کا خطرہ ہے تو خاموش ہو گئے ہوتے۔ اس لیے کہ اس کے آگے امر و نہی کی حد ہی نہیں ہے لیکن امام حسینؑ ...

تھے کہ میں قربانی کے لیے جارہا ہوں۔ میں شہادت کے لیے جارہا ہوں۔ میں جان دے دوں گا اس راہ میں۔ تو اگر مسئلہ خالی امر و نہی کا ہے تو امر و نہی کی راہ میں جان نہیں دی جاتی ہے۔ امر و نہی کی راہ میں زندگی قربان نہیں کی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسئلہ کچھ اس سے بالاتر ہے۔ مگر اتنی سی بات میں واضح کردوں تو کافی ہے مسئلہ اس سے بالاتر ہے اور وہ یہ ہے کہ امر و نہی یعنی معروف کا حکم اور منکر سے روکنا اس کے مقابلہ میں ایک شے اور بھی ہے اور اس چیز کو پہنچوانے کے لیے میں اپنے تمام سننے والوں کے لیے ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمارا عمل خطرہ میں ہے یا ہمارا عمل خطرہ میں نہیں ہے ہم خطرہ میں ہیں۔ مثلاً اگر ہم نماز نہیں پڑھتے تو لاکھ نماز پڑھنے والے الحمد للہ موجود ہیں ہم جہنم میں چلے جائیں گے نماز تو کہیں نہیں جائے گی مسجد تو آباد رہے گی۔ اگر ہم روزہ نہیں رکھتے تو ہم خطرہ میں ہیں روزہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر ہم حج بیت اللہ کے لیے نہ جائیں تو ہم کو خطرہ ہوگا حج کو کیا خطرہ ہے۔ اگر ہم زکوٰۃ نہ دیں تو ہماری عاقبت خطرہ میں پڑ جائے گی زکوٰۃ کو کیا خطرہ ہے۔ توجہ کر رہے ہیں؟ تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا ذاتی عمل خطرہ میں ہوتا ہے یا انسان خطرہ میں ہوتا ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اصل قانون خطرہ میں ہوتا ہے۔ یعنی اگر سو مسلمان شراب پینے لگیں تو اسلام کو کیا خطرہ ہے۔ لیکن اگر ایک ایسا مسلمان شراب پینے لگے جو اسلام کا ذمہ دار ہو تو اب مسلمان خطرہ میں نہیں اب اسلام خطرہ میں ہے کہ سب کہیں گے اگر اسلام میں شراب نہ ہوتی تو حاکمِ اسلام کیسے پیتا۔ اگر مسلمان بدکردار ہوجائے تو مسلمان خطرہ میں ہے اسلام خطرہ میں نہیں ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کا عالم، مسلمانوں کا حاکم بدکار ہوجائے تو لوگوں کو سوچنے کا موقع ملے گا کہ اگر مذہب میں بدکاری نہ ہوتی تو یہ کیسے بدکاری کرتا یعنی اب مذہب خطرہ میں ہے۔

توجہ کر رہے ہیں آپ؟ امر و نہی کی جگہیں وہ ہیں کہ جہاں انسان کا الگ الگ انفرادی عمل، میری نماز، میرا روزہ، میری برائی، ان کا حرام، ان کا واجب، اگر انسان کے

الگ الگ اعمال خطرہ میں ہیں تو ہر ایک پر فرض ہے ہدایت کرے، جب تک خطرہ نہ ہو اس لیے کرو۔ جہنم میں جا رہے ہیں تو آپ کیوں مر رہے ہیں، سمجھائیے نہیں مانتے نہ مانیں۔ جہنم میں جائیں۔ آپ اپنی جان نہ دیجئے۔ لیکن اگر اصل دین خطرہ میں ہو، اگر اصل نماز خطرہ میں ہو، اگر اصل روزہ خطرہ میں ہو، اگر شریعت خطرہ میں ہو، اگر قرآن خطرہ میں ہو، تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جہاں جان خطرہ میں ہو وہاں چپ رہ جاؤ۔

انفرادی اعمال میں امر و نہی اگر خطرہ نہ ہو تو کرو۔ اگر خطرہ ہو تو نہ کرو۔ لیکن اگر دین خطرہ میں پڑ جائے تو کسی کی زندگی دین سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔ کسی کی حیات دین سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہوگا کہ جان قربان کر دے مگر دین کو قربان نہ ہونے دے۔ جان دیدے مگر اسلام کو فنا نہ ہونے دے۔

حسینؑ بن علیؑ جس دَور میں اُٹھے ہیں وہ دَور امر و نہی کا دور نہیں تھا اس سے گذر کے وہ منزل آگئی تھی کہ جہاں شراب تخت خلافت تک آگئی تھی۔ جہاں بدکاری حاکم اسلام تک پہونچ گئی تھی۔ حسینؑ جانتے تھے کہ اس کے بعد اب دنیا کو یہ سوچنے کا حق پیدا ہو جائے گا کہ اسلام میں اب شاید شراب ہی جائز ہو گئی ہے۔ اسلام میں بدکاری بھی جائز ہو گئی ہے۔ چونکہ اب اسلام خطرہ میں پڑ گیا ہے لہٰذا میرا فرض ہے کہ اُٹھوں۔ اگر مسئلہ امر و نہی کا ہوتا تو جان کو خطرہ میں دیکھ کر رُک جاتا مگر مسئلہ بقائے دین کا ہے۔ اب دو ہی راستے ہیں، یا میں رہوں گا یا دین رہے گا۔ اگر جان بچا لوں گا تو اسلام مٹ جائے گا اور اگر اسلام کو بچانا ہے تو اپنے کو مٹا دینا ہے اور دین الٰہی کو بچا لینا ہے۔

بس عزیزانِ محترم! یہی وہ بات تھی جس کو امام حسینؑ نے ایک لفظ میں کہا تھا کہ میں اٹھا ہوں کیوں؟ "اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّۃِ جَدِّیْ" میں اپنے نانا کی اُمت میں اصلاح چاہتا ہوں۔ اصلاح ایک اتنا وسیع لفظ ہے جس میں اخلاقیات، اجتماعیات، اقتصادیات، سیاسیات، حکومت، عوام، سارے مسائل آجاتے ہیں یعنی اتنا نقشہ بگڑ چکا ہے کہ حسینؑ اٹھے ہیں اصلاح کرنے کے واسطے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات رہ جائے جو دین خدا کے خلاف ...

لہٰذا میں ہر قربانی کا عزم وارادہ لے کر اٹھا ہوں۔ میں اپنے نانا کی اُمّت میں اصلاح چاہتا ہوں۔ اور حسینؑ نے اسی لفظ سے اس مسئلہ کا جواب بھی دے دیا کہ اگر اُمّت میں فساد پیدا ہو گیا اور اصلاح کی ضرورت ہے تو آپ ہی کیوں؟ غور کیجئے میں نے کیا کہا۔ اگر اُمّت میں فساد پیدا ہو گیا تو سارے مسلمان فساد کو جانتے ہیں ایک آپ ہی کیوں؟ تو حسینؑ نے کہا "خرجت لطلب الاصلاح فی امۃ جدی"۔ میں اپنے نانا کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ اب تمہیں اندازہ ہو گیا کہ اگر دین اور کسی کے نانا کا ہوتا۔ اگر دین کسی اور کے باپ دادا کا بھی ہوتا تو شاید وہ بھی قیام کرتا۔ مگر جب دین صرف میرے گھر کا ہے تو اب میں نہ بچاؤں گا تو کون بچائے گا۔

اور جب امام حسینؑ اصلاح کے لیے اُٹھے تو امام حسینؑ نے چاہا کہ فساد کے جتنے راستے ہیں انھیں بند کیا جائے۔ فساد کے جتنے امکانات ہیں ان پر پہرے بٹھائے جائیں۔ فساد کے امکانات بہت ہیں جو اُمّت میں پیدا ہو گئے تھے۔ جن کی کچھ تفصیل میں نے آپ کے سامنے گذشتہ مجلس میں گذارش کی تھی جو متوجہ ہیں وہ اس پر غور کریں گے۔ منجملہ اور فسادات کے ایک طبقاتی امتیاز بھی تھا۔ عرب اور عجم اور۔ منجملہ اور امتیازات کے آزاد اور غلام اور۔ منجملہ اور امتیازات کے سیاہ اور سفید اور۔ یہ سب فسادات ہیں کہ وہ اسلام جو اتنا وسیع اور آفاقی پیغام لے کر آیا تھا اس کے ماننے والے گورے اور کالے کا فرق کرتے ہیں۔ اس کے ماننے والے عرب اور عجم کا فرق کرتے ہیں۔ اس کے ماننے والے قبیلوں کا فرق کرتے ہیں اس کے ماننے والے غلام اور آزاد کا فرق کرتے ہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ اصلاح کروں یعنی جتنے تفرقے پیدا ہو گئے ہیں سب کو مٹا دوں۔ صرف جان ہی دینا ہوتی تو خالی بنی ہاشم کو لے آتا، قربان ہی ہونا ہوتا تو اپنے گھر والوں ہی کو لے آتا مگر اب جو میں لے آیا تو بہتر ہی ہیں۔ مگر ان میں عرب بھی ہیں عجم بھی ہیں۔ ان میں گورے بھی ہیں کالے بھی ہیں۔ آزاد بھی ہیں غلام بھی ہیں۔ ان میں مختلف قبائل کے ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ تفرقے پیدا کر کے فساد تم نے پیدا کیا

ہے اور اکٹھا کر کے اصلاح میں کرنا چاہتا ہوں۔

اسی لیے حسینؑ بن علیؑ کا کردار آواز دے رہا تھا کہ میں نے تفرقوں کو مٹا دیا ہے۔

اکبرؑ کا جہاں سر ہے وہیں جون کا سر ہے
شبیرؑ کا زانو ہے مساوات کی دنیا

جہاں تھوڑی دیر پہلے جون کا سر رکھا وہیں تھوڑی دیر بعد اپنے کڑیل جوان بیٹے کا سر رکھا ہے تا کہ دنیا پہچان لے کہ اسلام میں ایمان دیکھا جاتا ہے، اسلام میں کردار دیکھا جاتا ہے۔ جہاں بنی ہاشم کے شریف ترین انسان کا سر ہے وہیں ایک غلام کا بھی سر ہے اور اگر گورے کالے کا فرق پہچاننا چاہتے ہو کہ دنیا نے گورے کالے کا امتیاز قائم کیا تو میں نے چاہا کربلا میں اس امتیاز کو بھی مٹا دیا جائے۔ میرا چاہنے والا یہی تو کہہ رہا تھا کہ مولا، کیا مجھے اذن جہاد اس لیے نہیں ملتا کہ میرا رنگ سیاہ ہے۔

مولا، کیا مجھے اس لیے اجازت نہیں ملتی کہ میں حبش کا رہنے والا ہوں۔ کیا اس لیے اجازت نہیں ملتی کہ میرے پسینہ سے بو آتی ہے۔ جون نے ان تین لفظوں میں سارے تفرقوں کا ذکر کر دیا۔ سارے امتیازات کا ذکر کر دیا۔ مولا اگر میرا جذبہ صادق ہے، مولا اگر میری محبت سچی ہے تو تو یہی کر اپنا یہ خون آپ کے خون سے ملا دوں۔ اپنا یہ خون آپ کے خون میں شامل کر دوں۔

خدا جانتا ہے کہ جون نے جو کہا تھا اللہ نے اس غلام حبشی کی بات کی لاج رکھ لی۔ کربلا میں جہاں اشراف، جہاں بڑی نسل والے، جہاں اونچے قبیلہ والے، جہاں بنی ہاشم قربان ہو رہے تھے وہاں ایک دو نہیں، متعدد غلام ہیں جنھوں نے راہ خدا میں قربانی دی ہے اور متعدد کنیزیں ہیں جنھوں نے کربلا کے بعد کوفہ و شام تک سیدانیوں کیساتھ رہ کر عجب عجب قربانیاں پیش کی ہیں اور سیدانیوں کو قدم قدم پر بچایا ہے۔

سارے تذکروں کا محل نہیں ہے، میں فقط چار لفظیں گذارش کروں گا اور پانچ سات منٹ کے اندر بیان تمام کر دوں گا اور انشاء اللہ آپ بہت مثاب ہوں گے۔

ایک غلام جو غلام ترکی ہے عرب بھی نہیں ہے، امام حسینؑ کی خدمت میں آیا ہے

فرزند رسولؐ اجازت دیجئے۔ نام کیا ہے واضح۔ مولا اجازت دیجئے۔ فرزند رسولؐ نے اجازت دی۔ نہ سُن سکو گے عزیزو۔ کہاں دنیا نے یہ کردار دیکھا یا سُنا ہوگا۔ اجازت دیجئے آپ کی راہ میں اور دین کی راہ میں قربان ہو جاؤں۔

امام حسینؑ نے اجازت دی۔ غلام میدان میں آیا، جہاد کرتا رہا۔ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگا۔ آواز دی "یَا مَوْلَاہُ اَدْرِکْنِیْ" مولا! غلام کی خبر لیجئے۔ امام حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ ابھی تو سارے بنی ہاشم زندہ ہیں۔

اس غلام نوازی کی کوئی مثال ملے گی؟ ابھی تو سارے بنی ہاشم زندہ ہیں۔ ابھی تو اصحاب باقی ہیں۔ ابھی تو انصار باقی ہیں۔ حسینؑ نے کسی کو سرہانے بھیج دیا ہوتا۔ کہا نہیں میرا چاہنے والا گھوڑے سے گرا ہے، مجھے پکارا ہے میں اس کے سرہانے جاؤں گا۔ آئے امام حسینؑ اور غلام ترکی کے سرہانے آ کر بیٹھے۔ روایت کا فقرہ ہے کہ غلام اتنا زخمی ہو گیا تھا کہ خاکِ کربلا تک پہونچتے پہونچتے بیہوش ہو گیا تھا۔ اب جو حسینؑ قریب آئے تو دیکھا غلام، چاہنے والا، فداکار، غش کے عالم میں پڑا ہوا ہے۔

ایک لفظ کہوں، برداشت نہ کر سکو گے عزیزو۔ خدانخواستہ اگر ہمارے سامنے کوئی آدمی بیہوش ہو جائے تو اس کو ہوش میں لانے کا کیا طریقہ ہوگا۔ اگر کوئی غش کھا جائے تو اس کو ہوش میں لانے کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے کہ پانی چھڑک دیا جائے آنکھیں کھل جائیں گی۔ مگر ہائے حسینؑ کی بیکسی۔ جس کے چھ مہینہ کے بچے کو پانی نہ ملے وہ کیسے غلام کو ہوش میں لائے۔ تاریخ کا فقرہ ہے کہ حسینؑ نے اپنا رُخسار غلام کے رُخسار پر رکھا اور آنسو بہانا شروع کیا۔ آنسوؤں کی گرمی کو محسوس کیا اور غلام نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا فرزند رسولؐ کا رخسار اپنے رُخسار پر ہے۔ تڑپ کر کہا اے مولا یہ کیا کر رہے ہیں، آقا یہ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں آپ کا رُخسار اور کہاں یہ غلام۔

کہا نہیں تو نے راہ خدا میں قربانی دی ہے یہ تیرا حق ہے۔

فرزند رسولؐ تیرے غم میں آنسو بہا رہا ہے یہ ایک غلام تھا جو حسینؑ پر قربان ہوا۔

دوسرا غلام جس کا نام اسلم ہے، جو خود امام حسینؑ کا غلام ہے۔ وہ بھی جب آیا قربانی کے واسطے اور اس نے جو امام حسینؑ کو بلایا تو حسینؑ اس کے بھی سرہانے آئے اور اسی انداز سے وہ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا کہ غلاموں کو یہ احساس نہ ہونے پائے اور تاریخ کو یہ خیال نہ پیدا ہونے پائے کہ حسینؑ نے کسی طرح کا کوئی امتیاز رکھا ہے ان غلاموں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں۔

اور خاتمہ میں دو جملے اور سنو عزیزو!

ایک غلام، مشہور نام ہے ابوذر کا غلام جس کو جون کہا جاتا ہے، جس کے جملے میں نے آپ کے سامنے نقل کیے۔ جب حسین تھوڑی دیر خاموش رہے تو جون نے کہا آقا کیا اس لیے اجازت نہیں ملتی کہ میرا رنگ سیاہ ہے، میرے پسینہ سے بو آتی ہے، میرا خون اس قابل نہیں ہے کہ اس راہ میں بہ جائے؟

حسینؑ نے کہا جون یہ نہ کہو اسلام میں ان باتوں کی کوئی جگہ نہیں ہے میں تم کو اس لیے نہیں بھیجنا چاہتا کہ میں نے تم کو عابدؑ بیمار کی تیمارداری کے لیے بچایا ہے۔ سنو سنو عزیزو! میں نے اپنے بیمار بیٹے کی خدمت کے لیے تم کو بچا کے رکھا ہے، تمہیں کیسے اجازت دوں؟

کہا مولا، پھر اتنی اجازت دیجیے کہ میں بیمار سے رخصت ہو کر آؤں۔ آئے جون بیمار کربلا کے خیمہ کے قریب۔ آکر کھڑے ہوئے اور آواز دی۔ فرزند رسولؐ بیمار امام نے آنکھیں کھولیں۔ جون خیر تو ہے کیوں آئے؟

کہا میں نے مولا سے اذن جہاد مانگا تھا۔ میں میدان میں جانا چاہتا تھا فرماتے ہیں کہ انھوں نے مجھے آپ کی خدمت کے لیے معین کیا ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ میں آپ کی خدمت کروں یا آپ کے بابا پر قربان ہو جاؤں۔

بس یہ سُننا تھا کہ بیمار کربلا نے آواز دی۔ اے جون! اگر تم ہی قربان ہو جاؤ اور بابا سے کچھ دیر یہ مصیبت ٹل جائے تو اس سے بہتر کیا ہوگا مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ میرے بابا پر قربان ہو جاؤ

بس یہ سُننا تھا آئے مولا کی خدمت میں۔ کہا آقا وہاں سے اجازت لے کر آیا۔ اب تو اجازت دیجئے۔

امام حسینؑ نے اجازت دی۔ جون کو تیار کیا۔ رخصت کیا۔ میدان میں آئے۔ جہاد کیا۔ متعدد دشمنوں کو فی النار کیا۔ یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر جب گھوڑے سے گرنے لگے تو فرزندِ رسولؐ کو پکارا۔

بس آخری جملہ ہے عزیزو!

جون نے کیا کہا تھا، مولا کیا میرا خون اس قابل نہیں ہے۔ حسینؑ کی محبت نے اور جون کے جذبے نے کیا عالم دکھلایا۔ مولا کیا یہ خون اس قابل نہیں ہے۔

امام حسینؑ نے آواز سُنی اور دوڑ کے میدان میں آئے۔ سر اُٹھایا۔ اپنے زانو پر رکھا۔ باتیں ہو رہی ہیں۔

اے جون کچھ کہنا چاہتے ہو؟

کچھ نہیں آقا۔ اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ راضی ہیں۔ میں تو قربان ہو گیا۔

حسینؑ نے کہا، جون میں راضی میرا خدا راضی۔

یہ تو کربلا میں منظر دیکھا اس کے بعد جو اُم سلمہ نے دیکھا کہ نبیؐ آئے ہیں تو دیکھا کہ ایک شیشہ میں تازہ خون جوش مار رہا ہے کہا خدا کے حبیبؐ یہ کیا؟

کہا اے اُم سلمہ! ہم صبح سے حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کا خون جمع کر رہا ہوں۔ اے جون جہاں نبیؐ کے لال کا خون تھا اسی شیشہ میں تیرا خون بھی شامل ہو گیا۔ یہ حسینؑ کا کرم تھا کہ اللہ نے تیری قربانی کو قبول کر لیا۔

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۴

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اَهْلِ
بَیْتِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی اَعْدَائِهِمْ
اَجْمَعِیْنَ ۝

اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفسِ مطمئن پلٹ آ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔"

سورۂ مبارکہ فجر کی ان آخری آیات کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ بیان "کربلا شناسی" کے عنوان سے شروع ہوا تھا آج اس کا چوتھا مرحلہ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے کہ فرزند رسول الثقلینؑ نے مدینۃ الرسولؐ کو کیوں ترک کیا اور عراق کا رُخ کیوں کیا؟ مسئلہ کی وضاحت سے پہلے کل کی گفتگو میں جو بعض باتیں باقی رہ گئی تھیں اُن کا مکمل کر دینا ضروری ہے۔

کل میں نے آپ کے سامنے اسباب قیام حسینؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو آخری بات خود امام حسینؑ کی زبان سے پیش کی تھی کہ جب فرزند رسولؐ نے مدینہ چھوڑنا چاہا تو اپنے بھائی جناب محمد حنفیہ کے نام ایک وصیّت نامہ لکھا۔ وصیّت نامہ کے الفاظ جو مؤرخین نے نقل کیے ہیں فرماتے ہیں "وَاللّٰهِ انی لم اخرج اشرًا ولا بطرًا ولا مفسدًا ولا ظالمًا

کسی غرور اور تکبر کی بنیاد پر ہے۔ نہ میں سرزمین خدا میں فساد برپا کرنا چاہتا ہوں اور نہ بندگانِ خدا پر ظلم کرنا چاہتا ہوں" اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّةِ جَدِّیْ" میں صرف اس لیے وطن چھوڑ کر نکل رہا ہوں کہ میں اپنے جد کی اُمّت میں اصلاح چاہتا ہوں۔ "اُرِیْدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهٰی عَنِ الْمُنْکَرِ" میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دوں اور انھیں برائیوں سے روکوں۔ "وَاَسِیْرَ بِسِیْرَةِ جَدِّیْ وَاَبِیْ" اور چاہتا ہوں کہ وہ راستہ، وہ سیرت اپناؤں جو میرے جد اور میرے باپ کی سیرت ہے۔ "فَمَنْ قَبِلَنِیْ بِقَبُوْلِ الْحَقِّ" اس کے بعد جو بھی انسان حق کو قبول کرنا چاہے تو حق واقعاً اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو قبول کیا جائے اور اگر کوئی انسان نہیں قبول کرنا چاہتا تو میری طرف سے بہر حال حجت تمام ہو گئی۔

ان کلمات میں جو بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ فرزندِ رسولؐ نے اپنا مقصد بھی بیان کیا ہے اور طریقۂ کار بھی بیان کیا ہے۔

مقصد ہے اُمّتِ پیغمبرؐ کی اصلاح۔!

طریقۂ کار ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، نیکیوں کا حکم دینا چاہتا ہوں اور برائیوں سے روکنا چاہتا ہوں اور اسی راستہ سے اپنے جد کی اُمّت میں اصلاح پیدا کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ اُمّت میں فساد پیدا ہو گیا ہے اور اصلاح کرنے کی ذمہ داری جتنی مجھ پر عائد ہوتی ہے اتنی کسی اور پر عائد نہیں ہوتی ہے اس لیے کہ دین میرے جد کا دین ہے، یہ اسلام میرے نانا کا لایا ہوا ہے۔ تو اگر نانا اس کو لے کر آئے ہیں تو نواسے پر اس کی حفاظت کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

یہاں تک کل میں نے آپ کے سامنے گذارش کی تھی اور آج ایک لفظ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب فرزندِ رسولؐ نے یہ اعلان کیا کہ میں اپنے نانا کی اُمّت میں اصلاح چاہتا ہوں تو طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں اس راستہ پر چلوں گا، وہ طریقہ اختیار کروں گا "اَسِیْرُ بِسِیْرَةِ جَدِّیْ وَاَبِیْ" میں اس سیرت پر عمل کروں گا جو

امام حسینؑ کے یہ الفاظ جو آج بھی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ جو انسان اُمتِ پیغمبرؐ کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ایسی سیرت اپنائے جو نبیؐ کی سیرت ہے۔ وہ سیرت اپنائے جو علیؑ کی سیرت ہے۔ ورنہ اُمتِ پیغمبرؐ میں اصلاح کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر آپ کو تاریخ اسلام کے حقائق معلوم ہیں اور آپ کی نگاہ میں ہیں تو یہ بات یاد رکھیے گا کہ امام حسینؑ نے چلتے چلتے اس بات کو واضح کر دیا کہ اُمت کی اصلاح کے لیے دو ہی سیرتیں ہیں۔ ایک نبیؐ کی سیرت ہے اور میرے باپ علیؑ کی سیرت ہے، اس کے علاوہ کوئی اور سیرت اصلاح اُمت کا ذریعہ نہیں ہے۔ یعنی آج تم پہچان لو جب میں نبیؐ اور علیؑ کے علاوہ کسی سیرت کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اصلاح امت کے لیے اسے اپنایا جائے تو میرا باپ کسی سیرت کو کیسے اپنا سکتا تھا۔

میں اس سابق کردار کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اصلاح اُمت کے لیے یا نبیؐ کا کردار کام آئے گا یا علیؑ کا کردار کام آئے گا۔ اس لیے کہ اصلاح کا آغاز توحید پروردگار سے ہوتا ہے تو اصلاح وہی کرے گا جس کا سر کبھی باطل کے سامنے نہ جھکا ہو۔

یہ پہلا مسئلہ ہے جس کی وضاحت اپنے وصیت نامہ میں خود فرزند رسولؐ نے کر دی کہ میں اُٹھا ہوں اصلاح کے لیے۔

اس اصلاح کی حقیقت کو پہچاننے کے لیے دو تین باتوں پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اُمت میں جب فساد پیدا ہوتا ہے تو فساد کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

کبھی فساد عوام میں پیدا ہوتا ہے اور کبھی فساد حکام میں پیدا ہوتا ہے۔

جو فساد عوام میں پیدا ہوتا ہے اس کی اصلاح کا طریقہ اور ہوتا ہے اور جو فساد حکام میں پیدا ہوتا ہے اس کی اصلاح کا طریقہ کار اور ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر خدا نکردہ میں نماز چھوڑ...

نہ کوئی تخت درکار ہے نہ کوئی تاج درکار ہے۔ نہ کوئی اقتدار چاہیئے نہ کوئی حکومت چاہیئے۔ آپ کی زبان میں اگر اثر ہے تو آپ مجھے مطمئن کر دیں میں نمازی ہو جاؤں گا۔

ایک انسان خدا نکردہ شرابی ہے۔ ہم نے شراب کی برائیاں سمجھا دیں۔ وہ شراب چھوڑ کر الگ ہو گیا، پارسا ہو گیا، متقی ہو گیا، پرہیزگار ہو گیا۔ اس کا کوئی تعلق نہ اقتدار سے ہے نہ حکومت سے ہے۔ اس لیے کہ جب عوام گمراہ ہوتے ہیں تو اپنے نفس کی خرابی کی بنیاد پر جتنے بھی بُرے ہو جائیں ان کو نہ کوئی طاقت سپورٹ کرتی ہے، نہ کوئی خزانہ کام کرتا ہے۔ نہ اُن کے پاس کوئی تخت کام کرتا ہے نہ کوئی تاج کام کرتا ہے۔ عوام کا نفس پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ بندۂ خدا ہوتے ہیں اور جب نفس خراب ہو جاتا ہے تو بندۂ شیطان ہو جاتے ہیں۔

لیکن حاکم جب خراب ہوتا ہے تو تنہا نفس کی خرابی کام نہیں کرتی ہے بلکہ نفس کی خرابی کو اقتدار سہارا دیتا ہے تو حاکم خراب ہوتا ہے۔

یہ حقیقت آپ کو معلوم ہے اور برابر آپ سنتے رہتے ہیں کہ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" عوام کا طریقۂ کار ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جو سلاطین کا طریقہ ہے وہی عوام کا طریقہ ہے، جو حکام کرتے ہیں وہی عوام کرتے ہیں اس لیے کہ ہر آدمی کو ایک ہی فکر ہوتی ہے کہ ہمارا حاکم ہم سے کیسے راضی ہو جائے۔ اگر حاکم پیروں پر کھڑا ہوتا ہے تو سارے عوام چاہتے ہیں کہ پیروں پر کھڑے رہیں۔ اگر کوئی ایسا دیوانہ پیدا ہو جائے جو سر کے بل کھڑا ہو تو آپ یقین کریں اگر سارے درباری سر کے بل نہ کھڑے ہو جائیں تو میرا ذمہ۔ اس لیے کہ بہرحال جتنی دیر یہ حاکم ہے اسے خوش تو رکھنا ہی ہے۔ تو جیسے یہ چاہے گا ویسے ہی کرنا ہوگا۔ تو عوام کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی راستے کو اپنانا چاہتے ہیں جو حکام کا طریقہ ہوتا ہے۔ حاکم اچھا ہوتا ہے تو عوام نیک ہو جاتے ہیں۔ حاکم بدکردار ہو جاتا ہے تو بدکرداری خود بخود عوام میں سرایت کرنے لگتی ہے۔ چاہے وہ خود بُرے نہ ہوں مگر اس کی مروّت میں بُرائی کرنا پڑتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان مسائل پر کوئی تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکتی

ہیں اور جس نے دورِ یزید کو پڑھا ہے یا جس نے حکومتوں کے ادوار دیکھے ہیں وہ ان حقائق کو خوب جانتا ہے۔

تو عوام کی بُرائی میں تنہا نفس کا فساد کام کرتا ہے اور حکام کی بُرائی میں نفس کا فساد اور وہ سارے وسائل کام کرتے ہیں جن وسائل کی بنا پر حاکم فاسد ہوتا ہے اور عوام کو فاسد بنایا کرتا ہے، ورنہ کھلی ہوئی بات ہے اگر یزید بے اقتدار ہوتا تو یزید بے اقتدار کافر ہو سکتا ہے، فاسق ہو سکتا ہے، شرابی ہو سکتا ہے، بدکردار ہو سکتا ہے مگر اس کا کردار عوام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا کردار عوام کو متاثر نہیں کر سکتا ہے بلکہ اگر عوام نیک ہیں تو کہیں گے کہ یہ کیسا مسلمان ہے کہ کلمہ بھی پڑھتا ہے اور شراب بھی پیتا ہے۔ کلمہ بھی پڑھتا ہے اور بدکردار بھی ہے۔ لیکن وہی انسان اگر صاحب اقتدار ہو جائے تو اقتدار تو خود ہی ایک ایسی شے ہے جو ہزاروں عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے اور ہزاروں عیب کو ہنر بنا دیتی ہے۔

آپ جانتے ہیں اور صبح و شام کے انقلابات دیکھتے رہتے ہیں۔ آج یہ تخت پر بیٹھ گیا تو ہر اخبار اس کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ پہلی سُرخی اسی کے نام کی ہے۔ اور جیسے ہی تخت سے اُتر گیا سارے اخبارات کا لہجہ بدل گیا۔ سارے مقررین کا لہجہ بدل گیا۔ سارے انسانوں کا لہجہ بدل گیا۔ اب سب نئے آنے والے کی تعریف کر رہے ہیں اور جانے والے کی بُرائیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکال رہے ہیں۔ دس سال پہلے کیا کیا تھا۔ پانچ سال پہلے کیا کیا تھا۔ پندرہ سال پہلے کیا کیا تھا۔ دو سال پہلے کیا کیا تھا اور کل تک کوئی نہیں کہتا تھا کہ کل کیا کیا تھا۔ یعنی اگر تخت پر بیٹھا رہ جائے تو کل کا عیب نظر نہیں آتا ہے۔ اور اگر تخت سے اُتر جائے تو پچھلے پچیس سال پُرانا عیب بھی نظر آنے لگتا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتدار عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اقتدار عیب کو ہنر بنا دیتا ہے اور اگر اقتدار بنام اسلام ہو تو جس کے ہاتھ میں آجائے گا جو عمل کرے گا اسی کا نام اسلام ہو گا۔ آج ہمارے سر پر جو سب سے بڑی مصیبت ہے وہ یہی ہے کہ دنیائے اسلام میں ایسے ایسے افراد پائے جاتے ہیں جن کا کردار صحیح نہیں

عوام انہی کے کردار کو سہارا بنائے ہوئے ہیں۔ اسلام فہمی کے لیے۔ ہم لاکھ سمجھایا کریں کہ اپنی آنکھوں سے کام لو۔ اللہ نے کس دن کے لیے آنکھیں دی ہیں۔ اپنے کانوں سے کام لو۔ اپنی عقل سے کام لو۔ اُن کے پاس ایک ہی جواب ہے ہم کیا کریں جو فرمادیا وہی کرنا ہے۔

بھئی اگر انھوں نے وہ فرمادیا جو تمہاری آنکھوں کے خلاف ہے تو ابھی اندھے تو نہیں ہو گئے ہو۔ اگر وہ فرمادیا جو تمہاری عقل کے خلاف ہے تو ابھی مجنوں اور دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو۔ مگر یہ مزاج اقتدار ہے کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آجائے اس کی باتیں مذہب بن جاتی ہیں۔ دین بن جاتی ہیں۔ تہذیب بن جاتی ہیں، شرافت بن جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہم نے تو تجربہ کیا ہے کہ اگر حاکم برسر اقتدار آنے کے بعد پانی کے بجائے پیشاب پینے لگے تو ایسے رذیل افراد بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو صاحبانِ عقل و ہوش ہونے کے بعد بھی یہی کاروبار کرتے ہیں۔ اب تو دنیا کو اندازہ ہو گیا کہ اقتدار کتنے عیب کو ہنر بناتا ہے۔

میں تو عالم کفر ہی کی مثال دے سکتا ہوں کہ اس کے آگے حد ادب ہے۔

تو یہ تجربات تاریخ کے چودھویں صدی میں یا بیسویں صدی میں ہماری نگاہ کے سامنے ہیں تو ہم کیا کہیں اس کے پہلے جو جاہلیت کا دور تھا یا جاہلیت سے قریب تر دور تھا۔ اس دور کی ذہنیت کیا تھی، اس کا مزاج کیا تھا ان کے تذکروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالات آپ کی نگاہ کے سامنے ہیں۔

تو عوامی فساد نفس کی بُرائی سے پیدا ہوتا ہے اسی لیے افراد تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اقتدار کا فساد، اس کے پیچھے خزانے ہیں۔ اقتدار ہے۔ حکومت ہے۔ تخت ہے، تاج ہے۔ یہ فساد اتنا قوی ہوتا ہے کہ اس کے روکنے کے لیے تقریر کافی نہیں ہوتی ہے۔ موعظہ کافی نہیں ہوتا ہے۔ اس کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ جس خزانے کے بل بوتے پر جی رہا ہے اس کے قبضہ سے لے لیا جائے۔ جس تاج کے اندر وہ دماغ ہے جو فاسد ہو گیا ہے اس تاج کو اُتار دیا جائے تاکہ [illegible]

بنا پر وہ فساد پیدا ہوا ہے وہ تخت پیروں کے نیچے سے کھینچ لیا جائے تاکہ زمین پر پاؤں تو پڑیں۔

توجہ کر رہے ہیں آپ۔ عوامی فساد چونکہ نفس کے فساد سے پیدا ہوتا ہے تو نفس کی اصلاح ہی اصلاح کے لیے کافی ہے۔ لیکن اقتدار کا فساد طاقت سے، خزانے سے، دولت سے، حکومت سے پیدا ہوتا ہے تو جب تک اس طاقت کو چھینا نہیں جائے گا اس وقت تک اصلاح کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ فرزندِ رسولؐ نے ایک لفظ کہا کہ میرے نانا کی اُمت میں فساد پیدا ہو گیا ہے، میں اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ فساد دو مرحلوں پر ہے، عوامی فساد اور اس سے زیادہ حکامی فساد اس لیے کہ دورِ یزید کے عوام اتنے فاسد نہیں ہیں جتنا فاسد خود یزید ہے۔ لہٰذا اب جو قیام ہوگا اس قیام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جتنا نفس میں فساد پیدا ہوا اسے تقریروں سے درست کیا جائے، خطبوں سے صحیح کیا جائے، بیانات سے صحیح کیا جائے، آیات و روایات سے صحیح کیا جائے۔ اور جتنا فساد اقتدار کے سہارے پیدا ہوا ہے جب تک اس اقتدار کو بے نقاب نہ کیا جائے گا جب تک اس اقتدار کو ذلیل نہ کیا جائے گا اس وقت تک اُمتِ پیغمبرؐ کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

اسی لیے میں نے ایک جملہ کہا تھا کہ امام حسینؑ اگرچہ قتل ہو گئے، امام حسینؑ کا گھرانہ اگرچہ زندہ نہیں رہ سکا مگر جس اقتدار کو امام حسینؑ نگاہ میں رکھے ہوئے تھے کہ یہ بنیادِ فساد ہے اس کو امام حسینؑ نے ایک دوپہر میں اتنا بے نقاب کر دیا کہ ملتا ہوا اقتدار بھی یزید کے بیٹے نے چھوڑ دیا اور ملی ہوئی حکومت کو یزید کے بیٹے نے نظر انداز کر دیا۔ اب تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ امام حسین کے قیام کا فائدہ کیا ہوا؟ نہیں میں نے پہلے دن عرض کیا تھا کہ بہت سے مسائل ہیں جن کی تفصیل کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن آپ کی نگاہ کے سامنے ہیں اقتدار تو ایک ایسی بلا ہے کہ اگر انسان خواب بھی دیکھ لے کہ مجھ کو مل سکتا ہے تو آخر دم تک جان دیئے بغیر نہ رہے گا۔ کتنے ہم نے تاریخی کردار دیکھے ہیں کہ جنھوں نے اقتدار کا خواب دیکھ لیا۔ اچھے خاصے شریف تھے کیسے ہو گئے۔ آپ کو معلوم ہے جب تک زبیر کا نام اس حیثیت سے مشہور نہیں ہوا تھا کہ

امیرالمومنینؑ کا بندہ بے دام تھا۔ رشتہ دار بھی ہے، قرابت دار بھی ہے۔ امیرالمومنینؑ کے پیچھے پیچھے ہے۔

لیکن جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ نہیں ہم نے غلط سوچا۔ ہم کیوں غلامی کریں گے۔ نوکری کریں گے۔ ہم تو چھ میں کے ایک ہیں۔ ہم تو خود ہی سمجھدار لوگوں کی نگاہ میں قابلِ اقتدار ہیں۔ ویسے ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ جو سب سے بڑا مد مقابل بن کے آیا وہ وہی انسان تھا جو کل علیؑ کا بندہ بے دام بنا ہوا تھا۔ یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتدار ایک ایسی شے ہے کہ اگر انسان کو وہم بھی ہو جائے چاہے واقعاً کسی قابل نہ ہو کر مجھے مل سکتا ہے تو انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ چاہے کتنی ہی خراب حکومت ہو۔ لیکن اگر ملنے کا خیال پیدا ہو جائے تو ہم آپ بھی بغیر اس کے پیچھے جان دیئے نہیں رہ سکتے ہیں چہ جائیکہ ملتا ہوا اقتدار قبضہ میں آجائے اور باپ کی جگہ پر بیٹے کو بٹھا دیا جائے اور بیٹھنے کے بعد وہ اعلان کر دے کہ میرے دادا نے اس سے مقابلہ کیا جو اُس سے بہتر تھا اور میرے باپ نے اس سے جنگ کی جو اُس سے بہتر تھا وہ اپنے مظالم کی سزا بھگت رہے ہیں میں کیوں اس مصیبت میں پڑوں گا۔ میں کسی غاصبانہ تخت پر بیٹھنے والا نہیں۔ میں کوئی ظالمانہ اقتدار لینے والا نہیں۔ ملا ہوا اقتدار جب یزید جیسے انسان کا بیٹا ٹھکرا دے تب انسان سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور بڑی فتح حاصل کی ہے جو سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی۔

فرزندِ یزید اور خلافت سے ہو بیزار
تو نے اموی خون کی تاثیر بدل دی

تو ایسا فساد جو عوام سے حکام تک عام ہو جائے اس کی اصلاح کے لیے دونوں کام ضروری ہیں کہ عوام کو نصیحت بھی کی جائے، موعظہ بھی کیا جائے اور اس حکومت کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا جائے جس حکومت کی بنیاد پر یہ فساد پھیلایا جا رہا ہے، جس حکومت کی بنیاد پر یہ برائیاں عام کی جا رہی ہیں۔

کتنا حیرت انگیز ماحول ہے کہ جہاں تختِ خلافتِ پیغمبرؐ پر بیٹھنے والا حاکم شام

تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور آنے والا وفد سلام کرتا ہے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ" اور حاکم میں اتنا کہنے کی غیرت نہیں ہے کہ میں رسول اللہ نہیں ہوں میں خلیفۂ رسول اللہ ہوں۔ میں پیغمبرؐ نہیں ہوں، میں اگر بہت سے بہت ہو سکتا ہوں تو ان کی جگہ پر بیٹھنے والا۔ لیکن نہیں اتنا بھی اگر کوئی اونچا ہو جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے اس لیے کہ اقتدار کا نشہ ہوتا ہی ایسا ہے۔ تو جب باپ نے مسئلہ کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اپنے کو رسالت تک پہونچا دیا ہے تو بیٹے کو دو قدم آگے بڑھنا ہی چاہیے تھا کہ "رسالت کھیل ہے، رسالت تماشا ہے، نہ کوئی وحی ہے نہ کوئی خبر ہے"۔ ایسے باپ کے بیٹے سے اس سے زیادہ اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جب اقتدار کا نشہ پیدا ہوتا ہے تو نہ رسالت کا ہوش رہ جاتا ہے، نہ دین کا ہوش رہ جاتا ہے۔ یقیناً وہ افراد قابل قدر ہوتے ہیں، جو اقتدار پانے کے بعد بھی ہوش میں رہ جائیں۔ اقتدار پانے کے بعد بھی مسلمان اور مومن رہ جائیں ورنہ یہ نشہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ حاکم شام کا اعلان دیکھا۔ ہر موقع پر سب ایک ہی حقیقت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں اور ایک ہی بات عوام کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ اصل ہم ہیں، نہ دین کوئی شے ہے نہ مذہب کوئی شے ہے۔ اسی لیے جب واقعۂ کربلا تمام ہو گیا آل محمدؐ کو قیدی بنایا جا چکا، شام کے سارے مسائل ختم ہو گئے تو آخری مرحلہ پر عابدؑ بیمار سے ایک شخص نے عجیب و غریب سوال کیا۔ یہ بتلائیے کہ آپ کا سارا گھر قربان ہو گیا۔ آپ کا سارا خاندان کٹ گیا، گھر لٹ گیا، سب مٹ گئے۔ فائدہ کیا ہوا؟

فرمایا فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے میدان جیت لیا۔ فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے قربانی دے کر میدان سر کر لیا۔

کہا مگر جو تخت پر بیٹھا تھا وہ ابھی تک بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے ہاتھ میں حکومت تھی، حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ نے کون سا میدان جیت لیا؟

فرمایا مگر میدان تخت پر کہاں ہے، میدان تاج کا کہاں ہے۔

کہا پھر آپ کے جیت جانے کی، آپ کے کامیاب ہو جانے کی کوئی علامت

کوئی نشانی ہے۔ یہ تو اپنے کو فاتح کہتا ہے اس لیے کہ تخت پر ہے، تاج اس کے سر پر ہے، خزانہ اس کے قبضہ میں ہے۔ آپ کہتے ہیں ہم نے میدان جیتا ہے تو آپ کے جیتنے کی علامت کیا ہے؟

فرمایا، تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ ابھی وقت نماز آ رہا ہے۔ جب مؤذن کہے "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" تو جب شام کا مؤذن یہ اعلان کرے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں تب یہ اندازہ ہوگا کہ رسالت کو کھیل تماشا کہنے والا حاکم ہار گیا اور رسالت کی راہ میں قربانی دینے والا جیت گیا۔

بس اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ جیسا فساد ہوگا ویسی ہی اصلاح کرنا ہوگی اور اصلاح کے لیے دو اہم بنیادیں ہیں۔ یہاں سے میری آج کی گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ اصلاح کے لیے دو اہم بنیادیں ہیں جب کوئی انسان اصلاح کرنا چاہے تو پہلے اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ فساد کا مرکز کہاں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر آدمی کو نزلہ زکام بھی ہو جائے اور کسی طبیب کے پاس یا حکیم ڈاکٹر صاحب کے پاس چلا جائے تو پہلے پتہ لگاتے ہیں کہ یہ بیماری چلی کہاں سے ہے۔ اگر وہ جڑ معلوم ہو جائے، وہ بنیاد معلوم ہو جائے تو مرض کی اصلاح آسان ہے اور اگر خالی دوائیں کھلاتے رہے اور اصل نہیں معلوم ہے تو ہر دوا ایک نئی بیماری پیدا کردے گی اور ہر دوا سے ایک نیا مرض پیدا ہوگا اور گویا ری ایکشن ہو رہا ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ مرض ہے کہاں۔ آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ بیماری کہاں ہے۔ تو اگر بیماری کی جڑ معلوم ہو جائے تو اصلاح بہت آسان ہے اور اگر بیماری کی بنیاد نہ معلوم ہو تو دوائیں دینا ممکن ہے اصلاح کرنا ممکن نہیں ہے۔

تو جب کوئی اصلاح کے لیے اٹھے تو پہلا فرض یہ ہے کہ وہ یہ پہچانے کہ فساد کی جڑ کہاں ہے تاکہ وہیں سے کام شروع کیا جائے۔ افسوس کہ میں ساری باتیں نہیں کہہ سکتا ہوں۔ آپ کے ذہنوں پر اعتبار کرتے ہوئے گذارش کر رہا ہوں۔ تو فساد کی جڑ معلوم ہو جائے کہاں ہے، تاکہ اصلاح کا کام وہیں شروع ہو۔

یہ پہلا نکتہ ہے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اصلاح کے لیے اُٹھنے والے کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کون سی جگہ ہے جہاں ہمنوا اور ہم آواز ساتھ دینے والے اعوان و انصار پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایسی جگہ آواز اُٹھانے سے کیا فائدہ کہ جہاں کوئی ساتھ دینے والا نہ ہو۔

تو یہ دو بنیادی نکتے ہیں اصلاح کے لیے کہ مرکزِ فساد کو نگاہ میں رکھا جائے اور وہاں سے کام شروع کیا جائے کہ جہاں اصلاح کے ساتھی مل سکتے ہوں ورنہ خالی شور مچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔

اسی لیے آپ دیکھیں کہ پروردگارِ عالم نے اس بدترین دنیا میں، اتنی بگڑی ہوئی دنیا میں اپنے پیغمبرؐ کو کہاں بھیجا۔ توجہ کریں۔ جو اللہ نبی کو مکہ میں پیدا کر سکتا تھا وہ خدا کیا چین میں نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ وہ خدا کیا جاپان میں نہیں پیدا کر سکتا تھا پیغمبرؐ کو کہیں بھیج دیتا۔ مگر پروردگارِ عالم جب دنیا کی اصلاح نبیؐ کے ذریعہ کرانا چاہتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ مرکزِ فساد کہاں بن گیا ہے۔ جس جگہ کو ہم نے مرکزِ اصلاح بنایا تھا اپنا گھر ابراہیمؑ سے بنوا دیا، اسمٰعیلؑ سے بنوا دیا تاکہ یہ ہمارا مرکز رہے۔ تو جو ہمارا مرکز تھا اس مرکز پر ایسا قبضہ ہوگیا کہ گھر ہمارا بُت اُن کے۔ گھر ہمارا خدا اُن کے۔ ارے ایک خدا کا ایک گھر اور اس پر تین سو ساٹھ خداؤں کا قبضہ۔ ایک خدائے لاشریک کا اپنا گھر اور اس پر تین سو ساٹھ خداؤں نے قبضہ کر لیا۔ بُت پرستی کا مرکز بن گیا۔ تو ظاہر ہے کہ فساد اتنا عام ہوگیا تو جو مرکزِ فساد تھا پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب کو وہیں بھیجا۔ اور نبیؐ نے وہیں سے کام شروع کیا اور جتنا بدترین فساد تھا اتنا ہی سخت ترین قدم بھی اٹھایا۔ میں تاریخ کے پُرانے اوراق نہیں دہرا سکتا ہوں۔ لیکن آپ نگاہ میں رکھیں گے جتنا بدترین فساد تھا اتنا ہی سخت ترین قدم نبیؐ نے اٹھایا کہ ادھر تین سو ساٹھ خدا، اِدھر اعلان لا الٰہ الا اللہ۔ کوئی صلح نہیں، کوئی مصالحت نہیں، نہ سو پر صلح نہ پچاس پر، نہ دس پر، نہ بیس پر، تم میں کا ایک میں نہیں مان سکتا ہوں۔ بس وحدہ لاشریک خدا ہے تو جتنا بدترین فساد تھا اتنا ہی سخت ترین قدم نبیؐ نے اُٹھایا کوئی مروت نہیں

ہے، کوئی مصلح کی بات نہیں ہے کہ سب بے کار ہیں، سب باطل ہیں، سب نااہل ہیں۔ بس وحدہٗ لاشریک ہے جو سجدہ کرنے کے قابل ہے۔ تو جو مرکز فساد بنا تھا نبیؐ نے وہیں سے آواز اٹھائی اور جیسا فساد تھا اتنا ہی سنگین قدم نبیؐ نے اٹھایا۔ اور جب نبیؐ نے قدم اُٹھایا تو اس محفل میں قدم اٹھایا کہ جہاں اگر جادوگر کہنے والے ہوں تو کوئی "یاسیدی" کہنے والا بھی ہو۔ جہاں اگر دیوانے کہنے والے ہوں تو کوئی ایسا بھی ہو جو کہے گھبرائیے گا نہیں میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ میں آپ کا بوجھ بٹاؤں گا۔ اس راہ میں قربان ہو جاؤں گا مگر مقصد کو ضائع نہ ہونے دوں گا۔ تو اصلاحی قدم وہاں سے اُٹھتا ہے جو فساد کا مرکز ہو، اور اصلاحی قدم وہاں اٹھایا جاتا ہے جہاں اعوان وانصار کے پائے جانے کے امکانات پائے جاتے ہیں۔

بس یہ دو باتیں نگاہ میں رکھیے گا تاریخ اسلام آپ کو معلوم ہے اب آئیے وہ دور جو امام حسینؑ کا دور ہے اس دور میں فساد کے مرکز ہیں دو۔ ایک جو حاکم کا اپنا مرکز ہے اور ایک جو اس کے بدترین گورنر کا مرکز ہے۔ میں بدترین گورنر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ حاکم خود بھی اسے قابل لعنت قرار دیتا ہے۔ "لعن اللہ ابن مرجانہ" یہ خود یزید نے کہا ہے خدا ابن زیاد پر لعنت کرے۔ تو اس کا مطلب کیا ہے کہ جہاں خود حاکم ہے ایک فساد کا مرکز وہ ہے اور جہاں ایسے گورنر کو بٹھایا ہے جو حاکم کی نگاہ میں بھی قابل لعنت ہے وہ فساد کا مرکز ہے۔

ایک کا نام ہے شام اور ایک کا نام ہے کوفہ۔

یہ دو مرکز ہیں، تو جو انسان اصلاح کے لیے اٹھے گا اس کی نگاہ میں یہ دو جگہیں بہر حال ہونی چاہئیں اس لیے کہ سارا فساد جو عالم اسلام میں پھیلا ہوا ہے یا حاکم کے ذریعہ آیا ہے یا گورنر کے ذریعہ آیا ہے۔

بس شام اور کوفہ میں ایک بنیادی فرق ہے کہ شام سے اپنا کوئی سابقہ نہیں رہا اور کوفہ سے اپنا سابقہ رہ چکا ہے۔ یعنی شام میں کبھی اپنا دخل نہیں رہا ہے اور

مولائے کائنات کا دارالحکومت رہ چکا ہے۔ تو اگر اعوان و انصار پیدا ہو سکتے ہیں اگر مددگار پیدا ہو سکتے ہیں تو اس زمین پر پیدا ہو سکتے ہیں جس سرزمین نے علیؑ کا کردار دیکھا ہے۔ اس سرزمین پر نہیں پیدا ہو سکتے ہیں جس نے علیؑ کے بارے میں گالیاں سُنی ہیں۔ دو مرکز فساد شام اور کوفہ میں، ایک مرکز وہ ہے کہ جہاں ساتھی نہیں مل سکتے ہیں۔ اور ایک مرکز وہ ہے جہاں ساتھیوں کے ملنے کا امکان ہے۔ لہٰذا سیاسی اعتبار سے، قانونی اعتبار سے، عقلی اعتبار سے امام حسینؑ کی ذمہ داری تھی کہ اپنی اصلاح کا مرکز اس کوفہ کو قرار دیں جو مرکزِ فساد بھی بنا ہوا ہے اور جہاں اصلاح کے امکانات بھی اس لیے پائے جاتے ہیں کہ کوفہ میں وہ اعوان و انصار پیدا ہو سکتے ہیں جو حسینؑ کے ہم آواز ہو جائیں۔

میں کوفہ کی تاریخی حیثیت اس دن گذارش کروں گا جب "قاتلانِ حسینؑ کا مذہب" طے ہوگا اس لیے کہ سب کوفہ والے ہی ہیں لیکن کوفہ نے ایسے کردار بھی پیدا کیے ہیں جن کو خود امیرالمومنینؑ نے سند دی ہے۔ "جمجمۃ الایمان، کنز الاسلام، سیف اللہ" یہ وہ افراد ہیں جو ایمان کی جان ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو ایمان کا سر ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو ایمان کے خزانے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو دین کی راہ میں قربانی دینے والے ہیں۔ اور ایک لفظ یاد دلا دوں۔ مسئلہ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ یہ کوفہ جس میں جتنے بے وفا پیدا ہوئے ہوں۔ تیس ہزار ہوں، پچاس ہزار ہوں لیکن بہرحال اسی کوفہ نے پہلے بھی اور بعد میں بھی ایسے کردار پیدا کیے ہیں جو آلِ محمدؐ کے لیے یقیناً قابلِ اعتماد تھے۔

ایک جملہ یاد دلاؤں جب طرماح بن عدی امیرالمومنینؑ کا پیغام لے کر حاکم شام کے دربار میں آئے۔ واقعہ آپ نے سُنا ہوگا اور نہیں سُنا تو اب جا کے پڑھیے گا۔ جب طرماح کی سواری پر حاکم یا حاکم کے چاہنے والوں نے قبضہ کر لیا۔

وہ کہتے ہیں یہ میرا اونٹ ہے اس پر کیوں قبضہ کر رہے ہو۔ غصب تو ناجائز ہے، حرام ہے...

لوگ کہتے ہیں یہ اونٹنی ہے اونٹ نہیں ہے۔

سنا ہوگا آپ نے اور آخر میں نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس گواہی دینے والے کھڑے ہو گئے، حاکم کی طرف سے کہ یہ اونٹنی ہے اور یہ اونٹ نہیں ہے وہ تو طرماح کی اپنی ذہانت تھی کہ وہ ثابت کرلے گئے کہ اونٹنی نہیں اونٹ ہے۔ وہ ان کا ہنر تھا لیکن پچاس آدمی حکومت کے ہم آواز پیدا ہو گئے یہ کہنے کے واسطے کہ یہ اونٹ نہیں بلکہ اونٹنی ہے جب کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اونٹ اونٹنی کا فرق ہر آدمی پہچانتا ہے۔

اب جو طرماح چلنے لگے تو شام کے حاکم نے کہا کہ جا کے علیؑ سے کہہ دینا میں نے تمہارے مقابلہ کے لیے ایک لاکھ سپاہی ایسے ہی تیار کیے ہیں کہ جو اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہیں کرتے ہیں تو تم میں مجھ میں کیا فرق کریں گے۔

یہ بھی ایک قابلِ فخر بات ہے یعنی حاکم اس بات پر ناز کر رہا ہے کہ میرے عوام بالکل جاہل ہیں، نالائق ہیں، نااہل ہیں۔ اور اس بات پر ناز کر رہا ہے کہ یہ ایسے نہ ہوتے تو ہم حاکم کیسے ہوتے۔ جا کے کہہ دینا کہ ہم نے ایک لشکر تیار کیا ہے، جس لشکر کی ذہنیت کا عالم یہ ہے کہ یہ اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہیں کرتے ہیں اور میدان میں جب آ کے پھیل جاتے ہیں تو جیسے رائی کے دانے بکھرے ہوئے ہوں اس طرح پورے میدان میں میرا لشکر نظر آتا ہے۔ تو جناب طرماح نے ایک جملہ کہا کہ اگر تو نے ایسا لشکر ایک لاکھ کا اکٹھا کیا ہے جو میدان میں آجائیں اور رائی کے دانوں کی طرح بکھر جائیں تو علیؑ نے بھی ایک مرغ پال رکھا ہے کہ اگر یہ مرغ کہیں میدان میں آگیا تو سارے دانوں کو ایک ایک کر کے چگ جائے گا۔ یہ کون ہے آپ پہچانتے ہیں یہ جو انسان بھی ہے یہ بھی کوفہ ہی کی دین ہے یعنی کوفہ نے اگر ویسے بے وفا پیدا کیے ہیں تو ایسے ابن اشترؑ بھی پیدا کیے ہیں۔ ایسے صاحبانِ کردار بھی پیدا کیے ہیں۔ حبیب کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ حُر کہاں کا رہنے والا ہے؟ کوفہ ہی کا رہنے والا ہے۔ یعنی کوفہ نے اگر ویسے بدترین کردار پیدا کیے ہیں

تو ایسے بہترین کردار بھی پیدا کئے۔ جن کی مثال عقل کے اعتبار سے، شعور کے اعتبار سے، فہم و ادراک کے اعتبار سے، طاقت و شجاعت کے اعتبار سے شام میں نہیں ملتی ہے۔ تو جو اصلاح کے لیے اٹھتا ہے اُسے وہ راستہ اختیار کرنا ہوگا جہاں ایسے وفادار پیدا ہو سکتے ہوں۔ اور میں اس سے واضح بات کہوں۔ واقعہ سب جانتے ہیں۔ واقعہ کوفہ میں بھی پیش آیا اور شام میں بھی پیش آیا۔ یعنی سر امام حسینؑ کوفہ میں بھی آیا اور شام میں بھی آیا۔ اہل حرم کوفہ میں بھی آئے اور شام میں بھی آئے۔

کوفہ کی مصیبت محدود تھی تھوڑی دیر کے لیے۔ شام کی مصیبت ایک سال کی تھی، مگر فرق اتنا تھا کہ کوفہ نے چند دن جو مصائب دیکھے تو توابین کے گروہ پیدا کر دیے۔ شام نے سال بھر مصیبت دیکھی مگر غیرت داروں کی جماعت نہ پیدا ہو سکی۔ اب اندازہ ہوا کہ حسینؑ کو شام کا رُخ نہیں کرنا تھا کوفہ کا رُخ کرنا تھا۔

آپ اس تاریخی منظر کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہیں یا نہیں؟ بات کو میں اور واضح کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے تمام سُننے والے جو تاریخی حقائق سے بے خبر ہیں اور نہ جانے کیسے کیسے پروپیگنڈوں میں مبتلا ہیں وہ بھی بات کو پہچانیں۔

اب اس کے مقابلہ میں چار پانچ جگہیں اور ہیں جو دورِ حاضر کے بیسویں صدی کے مشیر امام حسینؑ کو مشورہ دے رہے ہیں کہ امام حسینؑ کو یہ کرنا چاہیے تھا اور وہ کرنا چاہیے تھا۔

وہ مشورے کیا ہیں؟

ایک مشورہ جو کل بھی تھا کہ ان کو وہیں مدینۂ رسولؐ میں رُک جانا چاہیے تھا۔ کہیں جاتے ہی نہیں۔ مدینہ سے اچھی محفوظ کون سی جگہ ہے۔

دوسرا مشورہ۔ خیر مدینہ چھوڑ دیا تھا تو مکہ ہی میں رُک جاتے۔

تیسرا مشورہ۔ یمن کو ان کے بابا نے مسلمان بنایا تھا تو وہاں چلے جاتے۔

چوتھا مشورہ مصر چلے گئے ہوتے۔ یعنی ذرا اور دور تاکہ جان بالکل محفوظ ہو جاتی اور ہر خطرہ سے دور نکل جاتے۔

یہ بھی ایک مشورہ ہے جو امام حسینؑ کو دیا جا رہا ہے کہ وہ راستہ اختیار کر لیا ہوتا اور اُدھر چلے گئے ہوتے۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہا کہ اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ پورا جزیرۃ العرب چھوڑ دیا ہوتا۔ فارس چلے گئے ہوتے یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی مسافر گھر بنانے کی جگہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ جیسے نعوذ باللہ کوئی خانہ بدوش آدمی ہے اس کو گھر بنانے کے لیے ایک جگہ چاہیے۔ ہر ایک، ایک پراپرٹی کا حوالہ دے رہا ہے یہاں مکان سستا ملتا ہے، وہاں زمین سستی ملتی ہے۔ یہاں چلے جائیں، وہاں چلے جائیں اور سب کی بنیاد ایک ہے۔ یہاں رہیں گے جان بچ جائے گی، وہاں رہیں گے جان بچ جائے گی۔ اس سے آگے کوئی سوچنے والا ہی نہیں ہے۔ ایمان بچانے کی فکر تو کسی کے ذہن میں نہیں ہے۔ ہر ایک کے ذہن میں ایک فکر ہے کہ امام حسینؑ کی جان کہاں بچ سکتی ہے اور ایسے تمام مشیر امام حسینؑ کی نگاہ میں کل بھی تھے۔ اس لیے کہ جب مشورہ دینے والوں نے مشورہ دیا تو فرمایا تم مجھ سے شہروں کی بات کر رہے ہو تم مجھ سے علاقوں کی بات کر رہے ہو۔ میں اگر کسی جانور کے سوراخ کے اندر بھی چلا جاؤں تو یہ میرے وجود کو گوارا نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ان کو اندازہ ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا ان کی بدکاریاں اسلام نہ بن سکیں گی۔ جب تک میں زندہ رہوں گا ان کی بے دینی کو دین نہ بننے دوں گا۔ اس لیے یہ میری زندگی کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ نہ مدینہ میں، نہ مکہ میں، نہ کسی اور علاقے میں۔ رہ گیا علاقوں کی صورت حال تو دو دو لفظوں میں اسے بھی پہچان لیں آپ۔

مدینہ میں رُک جاتے۔ تو جب جا رہے تھے جبھی لوگ کھڑے ہو گئے ہوتے۔ اگر آپ آج مشورہ دے رہے ہیں کہ مدینہ میں رُک گئے ہوتے بڑی محفوظ جگہ تھی۔ تو یہ آپ کیوں کہہ رہے ہیں یہ تو مدینہ والوں کو کہنا چاہیے تھا کہ فرزند رسولؐ! ارے ہم تو سب موجود ہی ہیں جان دینے کے واسطے۔ ہم موجود ہیں دفاع کرنے کے لیے۔ کوئی نگاہ اٹھا کے دیکھا آنکھیں نکال لیں گے۔ آپ کیوں جا رہے ہیں۔

مگر یہ بات کس نے کہی۔ یہ بات اگر کہی بھی کہ کہاں جا رہے ہیں تو محمد حنفیہ نے

کہی۔ عبداللہ بن جعفر نے کہی۔ عبداللہ بن عباس نے کہی۔ جناب اُمّ سلمہ نے کہی۔ مگر جن کے سہارے آپ روکنا چاہتے ہیں کوئی ان کی آواز بھی ڈھونڈھ نکالے تاریخ میں کہ ایک دو ہزار کی فوج آکے کھڑی ہوگئی ہو۔ گھبرائیے گا نہیں ہم قربان ہوجائیں گے آپ پر۔ آپ ٹھہریئے مدینے سے زیادہ محفوظ کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہ ایسے افراد مدینہ میں دکھائی دیئے اور نہ مکہ میں کہ جب حرم خدا سے امام حسینؑ جانے لگے حج کو عمرہ سے بدل کر، تو ابن عباس نے کہا۔ نہ جائیے۔ ابن جعفر نے پیغام دیا کہ نہ جائیے۔ محمد حنفیہ کا پیغام آیا کہ نہ جائیے مگر مسلمانوں کا پیغام کہاں چلا گیا جن کو ایثار کا مظاہرہ کرنا ہے، جن کو نبیؐ کے نواسے کی جان بچانا ہے، جن کو اسلام کے تحفظ میں ساتھ دینا ہے۔ وہ فوجیں کہاں ہیں۔ وہ آواز کیوں نہیں اُٹھتی ہے۔ تو جو علاقے نبیؐ کو دیکھے ہوئے ہیں جنھوں نے نبیؐ کی حیات دیکھی ہے، نبیؐ کا کردار دیکھا ہے۔ جن علاقوں کو پیغمبرؐ نے بنایا ہے۔ جب حکومت کا رُعب ان پر اتنا غالب آجائے کہ جو بڑے بڑے باپ کے بڑے بڑے بیٹے تھے وہ بھی علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں یا بیعت کے لیے تیار ہوجائیں تو جہاں اتنی بزدلی پائی جاتی ہو ان کے سہارے کون سا قیام کیا جائے؟

اور میں نے کل آپ کے سامنے اشارہ کیا تھا کہ امام حسینؑ کی شہادت کے فوراً بعد جو مدینہ کا انجام ہوا ہے وہ بھی آپ کو معلوم ہے اسی لشکر یزید کے ذریعہ۔ مگر نہ کوئی فوج دکھائی دی، نہ کوئی طاقت دکھائی دی۔ جو اپنی غیرت کا اور اپنی حمیت کا اس انداز سے مظاہرہ کرے جس مظاہرہ کی توقع ہونی چاہیئے تھی۔ تو حجاز، مکہ، مدینہ میں تو وہ انداز نہیں پایا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جب شام کا حاکم یزید کی بیعت لینے کے لیے مدینہ میں وارد ہوا اور اس نے خطبہ پڑھا اور لوگوں سے بیعت کا مطالبہ کیا تو صرف ایک امام حسینؑ تھے جو کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ کس قدر بے غیرتی کی بات ہے کہ ایسے انسان کی بیعت کا مطالبہ عالم اسلام سے کیا جا رہا ہے جس کے کردار میں شراب ہے، جوا ہے، بدکرداری ہے، ہر بُرائی ہے کوئی نیکی نہیں ہے۔ اس کی بیعت لینے کے واسطے تو عالم اسلام سے مطالبہ کر رہا ہے اور اس کو مجبور کر رہا ہے۔

یہی وقت تھا جب امام حسینؑ نے آواز اٹھائی تھی تو مدینہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ابھی تو فیصلہ آسان تھا نہ کوئی لشکر آیا تھا نہ کوئی فوج آئی تھی، مگر جو ایک حاکم کے رُعب سے اتنے مرعوب ہو جائیں کہ نبی زادے کی آواز پر آواز نہ دے سکیں۔ وہ مقابلہ کے لیے، جان دینے کے لیے آئیں گے؟

یہ وہ طاقت نہیں ہے، یہ وہ علاقہ نہیں ہے جس کے سہارے قیام کیا جا سکے۔

یمن کا حال بھی دیکھا۔ معاویہ کا لشکر آیا۔ مسلم بن ابی ارطاۃ نے سارے یمن کو آ کے غلام بنا لیا اور لوگوں نے غلامی کی بیعت کر لی مگر ایک لشکر سے لڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

مصر کا حال سب کو معلوم ہے۔

فارس میں اس دور میں تو ظاہر ہے کہ آلِ محمدؐ کے چاہنے والوں کا نہ کوئی علاقہ تھا اور نہ کوئی طاقت، جس طاقت کے سہارے کوئی قیام کیا جا سکے۔

اس لیے امام حسینؑ کے سامنے دونوں اعتبارات سے، مرکز فساد ہونے کے اعتبار سے بھی اور اصلاح کے ساتھیوں کی امداد اور توقع کے اعتبار سے بھی سوائے کوفہ کے اور کوئی علاقہ نہ تھا کہ جدھر امام حسینؑ اپنا رُخ کرتے۔

علاوہ اس کے ایک تاریخی حقیقت جو بڑی تلخ ہے مگر کہے بغیر بات بنتی نہیں ہے۔

مدینہ چھوڑا امام حسینؑ نے مگر مدینہ والوں نے نہ کہا کہ ٹھہر جائیے۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔

مکہ چھوڑا امام حسینؑ نے مگر مکہ والوں نے نہ کہا کہ ٹھہر جائیے ہم کو آپ کی ضرورت ہے۔

جب یمن خبر پہونچی تو علیؑ کے بنائے ہوئے مسلمان تھے مگر نہ کہا یہاں آجائیے ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔

مصر سے کوئی دعوت نامہ نہ آیا، لے دے کے بس کوفہ والوں ہی کا دعوت نامہ

آیا۔ اب کوفہ اور باقی علاقہ والوں کا فرق آپ پر واضح ہو گیا۔ نہیں توجہ کی۔ کوفہ کا فرق اور باقی علاقوں کا فرق تو معلوم ہو گیا کہ کوئی اور دعوت دینے والا نہیں ہے مگر کوفہ کے فریب کار سہی انھوں نے اپنی طرف سے امام حسینؑ پر گویا حجت تمام کر دی کہ ہم نے وعدۂ نصرت کیا، ہم نے آپ کو دعوت دی۔ اب امام حسینؑ کے سامنے دو راستے ہیں:

اگر کوفہ نہ جائیں تو انھیں یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ہم نے بلایا۔ نہ آئے، پروردگار تو گواہ رہنا۔

اور اگر کوفہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں تو ظالموں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ ان کے باپ دادا کا علاقہ تو کوفہ تھا۔ یہ اُدھر گئے تھے کوئی فتنہ اٹھانے کے لیے اُدھر تو کسی نے بُلایا بھی نہیں تھا۔ اگر جانا تھا تو وہاں گئے ہوتے جہاں والے بُلا رہے تھے۔

لہٰذا کوفہ اپنی تاریخی حیثیت کے اعتبار سے بھی اور کوفہ اپنی دعوت کے اعتبار سے بھی یہ حق پیدا کر چکا تھا کہ فرزندِ رسولؐ اٹھیں یہ اور بات ہے کہ امام حسینؑ اصلاح بھی چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ دنیا کو یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ امام حسینؑ کوئی حالات سے اتنے بے خبر ہیں کہ جس کا جی چاہے دھوکہ دیدے۔

ایسا نہیں تھا کہ کوئی یہ سوچے کہ امام حسینؑ حالات سے، سیاست حاضرہ سے اتنے بے خبر تھے کہ جس کا جی چاہے دھوکہ دیدے۔ نہیں اسی لیے اٹھارہ ہزار خطوط پانے کے بعد بھی امام حسینؑ نہ گئے۔ غور کر رہے ہیں آپ؟ امام حسینؑ اس وقت تک نہیں گئے جب تک آپ نے مسلمؑ کو بھیج نہیں دیا۔

یہ مسلمؑ کا بھیجنا اس بات کا اعلان ہے کہ تمھارے خطوط کے مضامین سے لہجوں سے دنیا دھوکہ کھا جائے مگر میں دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ میں تمھارا امتحان بھی لینا چاہتا ہوں کہ دیکھوں تمھارے خطوط میں کتنی صداقت اور کتنی سچّائی پائی جاتی ہے۔ اور اگر آپ نے تاریخ کے الفاظ پڑھے ہیں اور نگاہ میں رکھا ہے اور اگر نہیں رکھا ہے تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ جب مسلمؑ کو بھیجا تو یہ سند دی ہے "انی باعث الیکم اخی و ابن عمی و ثقتی مسلم بن عقیل"۔ میں اسے بھیج رہا ہوں جو میرا بھائی ہے، میرے چچا

کا بیٹا ہے اور میرا معتبر انسان ہے۔

امام حسینؑ نے مسلمؑ کے اعتبار کا اعلان کر کے اہل کوفہ کو متوجہ کر دیا کہ یہ تو معتبر ہے اسے اس لیے بھیجتا ہوں تاکہ تمہیں دیکھا جا سکے کہ تم میں کتنا اعتبار ہے۔

یہ سیاستِ حسینؑ کا ایک پہلو تھا، انشاء اللہ باقی وضاحت آئندہ کروں گا۔

تو امام حسینؑ نے حالات کو دیکھنے کے بعد وہ راستہ اختیار کیا جس راستہ کے علاوہ کوئی قانونی راستہ نہیں تھا۔ اس کے بعد جب امام حسینؑ آگے بڑھے تو جو آخری نتیجہ آپ کے سامنے آیا وہ ابھی میں گذارش کروں گا۔ مگر ایک آخری جملہ کہہ کر بیان کو آخری مرحلہ پر لانا چاہتا ہوں۔ اور یہ ایک تاریخی لفظ ہے میرا۔ جو سمجھیں گے وہ تو سمجھیں گے ہی انشاء اللہ، جو نہ سمجھیں وہ بھی محفوظ رکھیں انشاء اللہ کبھی بات سمجھ میں آجائے گی۔

امام حسینؑ نے جب قدم نکالا وطن سے اور ان سارے حالات کو دیکھا تو امام حسینؑ کی نگاہ میں ایک عراق یعنی کوفہ ہی وہ مرکز تھا کہ جہاں جا کر صدائے احتجاج، صدائے اصلاح بلند کی جا سکتی تھی اس لیے کہ کل جب اصلاحِ اُمت کا وقت آیا تھا اور باپ نے یہ کام سنبھالا تھا تو میرے بابا نے بھی سارے علاقوں کو چھوڑ کر اسی کوفہ کو مرکز بنایا تھا۔ علیؑ کے دور کا دارالحکومت تھا کوفہ۔ اس کے پہلے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن کو آج علیؑ کی کوئی ادا پسند نہیں آتی وہ یہ اعتراض کرتے ہیں دیکھئے علیؑ نبیؐ کی سیرت سے ہٹ گئے، سرکارِ دو عالمؐ یا مکہ میں رہے یا مدینہ میں۔ تو علیؑ کو بھی اپنا دارالحکومت یا مکہ کو بنانا چاہیے تھا یا مدینہ کو، جو حضورؐ کی سُنت تھی، جو حضورؐ کی سیرت تھی اور علیؑ سے پہلے بھی ہوتا چلا آرہا تھا یعنی سب سیرتِ پیغمبرؐ پر قائم تھے صرف ایک علیؑ نے اس راستہ کو بدل دیا اور مکہ مدینہ کو دارالحکومت بنانے کے بجائے کوفہ کو دارالحکومت بنا دیا۔ اب ان نافہموں کو کون سمجھائے کہ اُس دور کے حالات میں اور اِس دور کے حالات میں کیا فرق تھا۔ کل عالمِ اسلام کتنا بڑا تھا اور آج عالمِ اسلام علیؑ کے دَور میں کتنا بڑا تھا۔ وہ الگ مسئلہ ہے لیکن ایک بات گذارش کرنا ہے کہ اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ علیؑ نے کوفہ کو دارالحکومت بنا کے سیرتِ پیغمبرؐ سے انحراف کیا ہے تو تم تو سیرت پر چلے جاؤ۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے

کہ جس دن سے علیؑ نے کوفہ کو دارالحکومت بنایا ہے ۳۶ھ سے آج ۱۴۱۰ھ تک پھر عالم اسلام میں کبھی دارالحکومت نہ مکہ دکھائی دیا نہ مدینہ۔ جتنے سیرت کے ٹھیکیدار تھے کوئی پلٹ کے مکہ مدینہ نہیں گیا۔ تو اگر ان پر انحراف کا الزام ہے تو تم تو اس الزام کو دھو ڈالو کیوں کہ عالم اسلام متحد ہو جائے ایک دارالحکومت مکہ یا مدینہ ہو جائے۔ مگر کوئی پلٹ کے نہ گیا تو مجھے کہنے دیجیے کہ معاذاللہ اگر تمھاری نگاہ میں علیؑ کا کوئی قدم غلط بھی اٹھ جاتا ہے تو ساری دنیا اسی نقش قدم پر چلتی ہے کوئی اصلاح کرنے والا نہیں پیدا ہوتا ہے۔

بغداد، سامرہ، طوس، دیگر علاقے، ساری دنیا عالم اسلام کے لیے دارالحکومت بن گئی اور بنتی چلی آرہی ہے اور آج کے بعد بھی بنتی رہے گی۔ مگر وہ علیؑ کا سیاسی اقدام تھا جس نے یہ سمجھایا کہ دیکھو جتنا بڑا عالم اسلام پھیلتا جائے امور حکومت کو اسی اعتبار سے طے ہونا چاہیئے تاکہ حکومت کو کنٹرول کیا جاسکے۔ نظام کو چلایا جاسکے۔ یہ راستہ علیؑ ہی کا بنایا ہوا ہے جس پر سارا عالم اسلام چل رہا ہے۔ اور اگر یہ حسرت ہی ہے کہ نہیں پھر ایک مرتبہ نبیؐ کا دور پلٹ آئے تو انتظار کرو پلٹ کے آئے گا جب آخری وارث پیغمبرؐ آئے گا تو مکہ ہی سے پلٹ کے آئے گا۔

جب آخری اصلاح کرنے والا قدم اٹھائے گا تو اس کا اصلاحی قدم وہیں سے اٹھے گا جہاں سے پہلے کا قدم اٹھا تھا، جہاں سے پہلے نمائندۂ الٰہی نے کام شروع کیا تھا وہیں سے اس کا آخری وارث بھی کام شروع کرے گا۔ اب آپ پوچھے گا کہ کیوں؟

اس لیے کہ اصلاحی کام وہیں شروع ہوتا ہے جہاں فساد کا مرکز ہوتا ہے۔

بس عزیزانِ محترم! میں نے اپنی بات کو آج مکمل کر دیا۔ اب میں اس تذکرہ تک آگیا کہ کوفہ کی اکثریت کتنی ہی بے وفا ہو گئی ہو، اس کے حالات کتنے ہی خراب ہو گئے ہوں۔ مگر نیک کردار، بلند کردار افراد بھی اسی کوفہ نے پیش کیے ہیں جن کی تاریخ میں مثالیں موجود ہیں اور جن کے تذکرے آپ سنتے رہتے ہیں۔ انھیں افراد میں سے ایک کردار جس کا آج مجھے تذکرہ کرنا ہے۔

یہ ایک عجیب خصلت تھی اہل کوفہ میں۔ اس زمانہ میں اہل کوفہ میں تھی اور آج بیسویں صدی میں تو شاید پوری دنیا ہی کوفہ ہو گئی ہے۔ جب امام حسینؑ نے مکہ چھوڑا اور مکہ سے چلنے لگے تو فرزدق سے ملاقات ہو گئی۔

امام حسینؑ نے پوچھا فرزدق یہ بتاؤ کہ عراق کا کیا حال ہے؟ اُدھر میں جا رہا ہوں، وہاں والوں کا کیا حال ہے؟ تو ایک جملہ فرزدق نے کہا جو تاریخ میں محفوظ ہے "قلوبهم معك وسيوفهم عليك" دل تو سب کے آپ کے ساتھ ہیں، لیکن اگر تلوار اُٹھ گئی تو سب کی تلواریں آپ کے خلاف اٹھیں گی۔ یعنی اندر کتنے ہی محبت کرنے والے ہوں لیکن جب مظاہرہ کا وقت آئے گا تو حکومت سے ایک انچ آگے پیچھے نہیں ہوں گے۔ جدھر حکومت کی تلوار اُٹھ جائے گی سب کی تلواریں اسی کے ساتھ اُٹھیں گی۔ پھر آپ کے ساتھ کوئی تلوار اُٹھنے والی نہیں۔ اور یہ امام حسینؑ نے خود بھی کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے یعنی یہ ایک کردار ہے جو ہر دور میں دنیا میں پیدا ہوتا رہتا ہے کہ دل میں بڑی محبت ہے۔ بس اظہار کا نام نہ لیجیے گا۔ اس دور میں یہ کردار کوفہ میں بستا تھا اور آج ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ جس سے کہئے ارے ہم مولا والے ہیں لیکن یہ خالی کہنے کا وقت آجائے کہ ہم مولا والے ہیں تو سب کچھ بن جاؤ مولا والے نہ بننا۔ اگر کہیں ہزار روپیہ خطرہ میں پڑ جائے، کہیں دو ہزار روپیہ خطرہ میں پڑ جائے، کہیں چھوٹی موٹی حیثیت خطرہ میں پڑ جائے تو پھر کہیں نہ کہو کہ ہم مولا والے ہیں۔ بس دل میں مولا کی محبت رکھو۔ وہ تو جانتے ہی ہیں اور وہ آپ کو خوب جانتے ہیں اور سب کو جانتے ہیں۔ جو ہم کہتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں اور جو دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ بھی جانتے ہیں۔ وہ سب کو جانتے ہیں، پورے عالم اسلام، عالم کفر سب کو جانتے ہیں اور سب کی حقیقت کو جانتے ہیں مگر یہی بدترین کردار تھا جس نے کل بھی فساد کیا اور یہی خرابی ہے جو ہر دور میں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے آپ دونوں باتیں دیکھیں گے کہ ابن زیاد کا نمائندہ بن کے آیا ہے حُر۔

کیوں؟ امام حسین کا راستہ روکنے کے لیے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے امام حسینؑ نے

بیابانوں میں صحراؤں میں جانا ہے لہٰذا پانی کا ذخیرہ ساتھ لے لیا جائے۔ روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھ پانی جمع کرنے کے لیے مشکیزوں یا برتنوں کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اب جو اصحاب امام حسینؑ پانی لے کر چلے تو سامنے ایک منظر دکھائی دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر اصحاب نے آواز بلند کی: "اللہ اکبر"۔

پوچھا آپ نے یہ صدائے تکبیر کیوں کہی؟

کہا، مولا نخلستان دکھائی دے رہا ہے۔ کھجور کے درخت ہیں اب سایہ مل جائے گا ٹھہرنے کے لیے، بیٹھنے کے لیے ایک جگہ مل جائے گی۔ تو امام حسینؑ کے ساتھ جو لوگ راستہ جاننے والے بطور دلیل چلا کرتے تھے انھوں نے کہا مگر یہ علاقہ وہ جہاں نخلستان کا کوئی وجود نہیں ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ کوئی لشکر آ رہا ہے جس کے نیزے اتنے بلند ہیں کہ کھجور کے باغات معلوم ہو رہے ہیں اور چند لمحے نہیں گذرے تھے کہ ادھر کا قافلہ آگے بڑھا اور ادھر کا قافلہ بھی تیزی سے آگے بڑھا اور دیکھا کہ ایک لشکر ہے، تلواریں ان کے پاس ہیں، نیزے ان کے پاس ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ایک ہزار افراد اور اتنی تیزی سے دوڑائے گئے ہیں صحراؤں میں، بیابانوں میں کہ عالم یہ ہے کہ ہر ایک کی زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی ہے پیاس سے۔ یہ لشکر ہے حُر کا۔

کیوں آیا ہے؟

امام حسینؑ کو گرفتار کرنے کے لیے اور راستہ روکنے کے لیے۔

جیسے ہی امام حسینؑ نے یہ عالم دیکھا۔ آواز دی بھیا عباس! یہ لشکر پیاسا ہے۔ ساقیٔ کوثر کے لال! میں ان کے ارادوں سے باخبر ہوں، یہ راستہ روکنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ گرفتار کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

مگر میں یہ منظر نہیں دیکھ سکتا کہ یہ پیاسے رہ جائیں۔ بھیا ان کو سیراب کرنے کا انتظام کیا جائے۔

ایک ہزار کا پیاسا لشکر، امام حسینؑ کے ساتھیوں نے اتنا انتظام اپنے ساتھ رکھا تھا کہ ایک ہزار کے انسانوں کو بھی سیراب کیا ...

پانی پلا دیا یہاں تک کہ حُر کے لشکر کا آخری سپاہی علی بن طعان محاربی کہتا ہے کہ میں چونکہ سب سے پیچھے تھا اور ترتیب وار پانی پلایا جا رہا تھا اور میرا عالم یہ تھا کہ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک میری باری آئے گی میں مر چکا ہوں گا کہ امام حسینؑ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی تو اب تک تو امام حسینؑ بیٹھے منظر دیکھ رہے تھے اور اصحاب بنی ہاشم پانی پلا رہے تھے۔ مگر جیسے ہی میرا عالم دیکھا نبیؐ کا لال اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے قریب آئے اور آکے فرمایا کہ اپنے اونٹ کو بٹھا دے۔ مگر میں پیاس سے اتنا بدحواس ہو رہا تھا کہ میں سمجھا بھی نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر سمجھایا اپنے اونٹ کو بٹھا دے۔ میں نے ناقہ کو بٹھایا۔ کہا میں تجھے سیراب کرنا چاہتا ہوں، پانی پلانا چاہتا ہوں۔ مگر میں پیاس سے اتنا بے قرار اور بے تاب تھا کہ پانی پینے کی صلاحیت بھی مجھ میں نہیں تھی تو امامؑ نے خود اپنے دست مبارک سے مجھے پانی پلایا اور جب میں پانی پی چکا تو میرے اونٹ کو پانی پلایا۔ ایک ہزار کے لشکر کو امام حسینؑ نے سیراب کر دیا اس عالم مسافرت میں۔ یہ ایک منظر تھا۔ آئے کاہے کے لیے ہیں، امامؑ کا راستہ روکنے کے لیے۔ گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس لے جانے کے واسطے، اور اسی دوران وقتِ نماز آ گیا۔ ظہر کا ہنگام آ گیا۔ امام حسینؑ نے کہا حُر وقت نماز آ گیا ہے میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ جا تو بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ لے اس لیے کہ مسلمان تو تم بھی ہو، کلمہ تم بھی پڑھتے ہو۔ حُر نے کہا نبیؐ کے لال یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے میں نماز پڑھاؤں۔

یہ آپ نے کوفہ کی خصلت دیکھی۔ یہ دوہرا منظر ہے گرفتار کرنے کے لیے بھی، راستہ روکنے کے لیے بھی۔ اور اس کے بعد یہ بھی کہ کس کی مجال ہے جو آپ کے ہوتے ہوئے نماز پڑھائے گا۔ آپ نماز پڑھائیں گے، میں بھی آپ کے پیچھے پڑھوں گا اور سارا لشکر پڑھے گا۔ یہ کردار تاریخی کردار ہے ہمیشہ کا، اسے نگاہ میں رکھیں گے۔ امام حسینؑ نے نماز پڑھائی اور سارے لشکر نے امام حسینؑ کے ساتھ نماز پڑھی۔ دیکھنے والا اگر کوئی ہوتا تو شاید اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا کہ غربتِ حسینؑ کو

دیکھ کر، فیاضیِ حسینؑ کو دیکھ کر، کرمِ حسینؑ کو دیکھ کر، اس ایثارِ حسینؑ کو دیکھ کر لشکر راستہ پر آگیا اور سب حسینؑ کے قدر داں ہو گئے ہیں۔ مگر پانی پلانے کے بعد، نماز پڑھانے کے بعد نماز تمام کرنے کے بعد اب جو امام حسینؑ چلنے لگے اور گھوڑے پر سوار ہوئے تو حُر نے بڑھ کر لجامِ فرس پکڑ لیا۔ مگر میں جانے نہیں دوں گا اس لیے کہ حاکم کا حکم ہے کہ آپ کو حاکم کے سامنے پیش کیا جائے۔ دنیا کا کوئی دوسرا انسان ہوتا تو کہتا حُر، کس قدر بے غیرتی کی بات ہے۔ حیا آنی چاہیے۔ میں نے تیرے لشکر کو سیراب کیا ہے، میں نے پانی پلایا ہے اور پھر میرے ساتھ یہ برتاؤ؟

مگر یہ ابنِ زہراؑ کا کردار ہے۔ یہ نبیؐ کا نواسہ، علیؑ کا لال ہے اپنے احسان کا ذکر بھی نہیں کیا۔ مگر ظرف میں صلاحیت دیکھی تو چاہا کہ حُر کو راستہ پر لے آئیں۔ چاہا کہ کوئی ایسا راستہ نکل آئے کہ جس میں اتنی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ میرے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے تیار ہے وہ راستہ پر آ ہی جائے۔

امام حسینؑ سے بڑا نباض کون ہوگا؟ حسینؑ سے زیادہ مزاج کا پہچاننے والا کون ہوگا! امام حسینؑ نے تبلیغ کا بالکل نرالا راستہ نکالا۔ نہ احسان کو یاد دلایا نہ کرم کو یاد دلایا۔ نہ پانی پلانے کا ذکر کیا۔ بلکہ جیسے ہی حُر نے لجامِ فرس پر ہاتھ ڈالا حسینؑ نے کہا حُر! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔ بس یہ سُننا تھا کہ حُر کانپنے لگا۔ لرز گیا۔ کہا حسینؑ! اگر آپ کے علاوہ کسی اور نے میری ماں کا ذکر کیا ہوتا تو میں غیرت دار انسان تھا ہمارے یہاں ایسے الفاظ برداشت نہیں کیے جاتے ہیں۔ میں اسی لہجہ میں جواب دیتا۔ مگر کیا کروں آپ کی ماں فاطمہ زہراؑ ہیں۔

بس عزادارو! اب آپ نے پہچانا کہ امام حسینؑ نے حُر کی ماں کا ذکر کیوں کر دیا تھا۔ چاہتے تھے کہ حُر کی ماں کا ذکر آئے تاکہ اس کے ذہن میں میری مادرِ گرامی کا خیال آئے اور یہی خیال وہ ہے جو حُر کو راستہ پر لا سکتا ہے۔

بس اس کے بعد مسلسل حُر کو یہ خیال تڑپا رہا تھا کہ حسینؑ زہراؑ کے لال ہیں، حسینؑ فاطمہؑ کے نورِ نظر ہیں۔ حسینؑ کو فاطمہؑ نے بڑی مشقت...

لے کر کربلا تک اور ۲ محرم سے لے کر عاشور کی رات تک حُر کو تڑپاتا رہا یہاں تک کہ جب عاشور کی رات آئی اور طے ہو گیا کہ صبح جنگ ہونے والی ہے تو حُر اپنے خیمہ میں آیا کہ تھوڑی دیر آرام کرے اس لیے کہ صبح کو سرداری لشکر کا فرض انجام دینا ہے۔ خیمہ میں آ کر لیٹنا چاہتا ہے مگر آنکھ نہیں لگتی، نیند نہیں آتی۔ بے قرار ہو کر اُٹھ جاتا ہے۔ کبھی خیمہ کے باہر کبھی خیمہ کے اندر۔

کسی نے کہا امیر یہ کیا بے چینی ہے۔ یہ کیا بے قراری ہے۔ کل جنگ کا دن ہے تھوڑا آرام تو کر لیجیے۔؟

کہا کیا آرام کروں، جب خیمہ میں جاتا ہوں، بستر پر لیٹنا چاہتا ہوں تو کانوں میں آواز آتی ہے "العطش" ہائے پیاس۔ ہائے پیاس۔ ارے جس نے میرے لشکر کو پانی پلایا تھا اس کے چھوٹے بچے پیاسے ہیں میں کیسے آرام کروں گا مجھے کیسے نیند آئے گی۔

رات گذرتی رہی یہاں تک کہ سحر کا ہنگام آیا۔ حُر، ابن سعد کے سامنے آئے اور کہا "یَابْنَ سَعْدٍ اَتُقَاتِلُ هٰذَا الرَّجُلَ"؟ کیا واقعاً حسینؑ سے جنگ ہوگی؟

ابن سعد نے کہا ایسی جنگ ہوگی کہ سر کٹ کے اُڑتے ہوئے دکھائی دیں گے اور ہاتھ کٹ کے گرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

بس یہ سُننا تھا کہ حُر پیچھے ہٹ آیا، سارا بدن کانپ رہا ہے۔

ایک شخص نے بڑھ کے کہا، حُر اگر مجھ سے کوئی پوچھتا کہ کوفہ کا سب سے بڑا بہادر کون ہے تو تیرے علاوہ کسی کا نام نہ لیتا۔ یہ تو جنگ کی چھوٹی سی سپاہ کو دیکھ کر کانپ رہا ہے، لرز رہا ہے۔

حُر نے کہا مسئلہ لشکر و سپاہ کا نہیں ہے۔ میں اپنے کو جنت و جہنم کے درمیان دیکھ رہا ہوں۔ اگر اِدھر رہ جاؤں تو جہنم ہے، اُدھر جاؤں تو جنت مل جائے گی۔ مگر اب کس منھ سے جاؤں گا۔ میں نے ہی تو راستہ روکا تھا۔ میری ہی وجہ سے نبیؐ کی ذرّیت اس بلا کے بن میں گرفتار ہو گئی ہے۔ کیسے جاؤں گا، مگر پھر ہمت کی اور طے کر لیا کہ مولاؑ کی خدمت میں جانا ہے۔ چلے چند قدم آگے بڑھے تھے کہ ایک مرتبہ آہٹ محسوس کی،

مُڑ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ جوان بیٹا علی بن حُر آ رہا ہے۔

بیٹا کیوں آئے؟

کہا بابا کہاں جا رہے ہیں؟

کہا میں تو مولاؑ کی خدمت میں جا رہا ہوں، اپنی خطا کی معافی مانگنے جا رہا ہوں میں نے سمجھ لیا کہ جہنّم اِدھر ہے جنّت اُدھر ہے۔

کہا تو بابا ایسے موقع پر مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں، ایسے موقع پر اپنے لال کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ نہ ہو سکے گا میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔

کہا آؤ میرے لال آؤ اِس وقت تو مجھے تمہاری ضرورت تھی۔

کہا بابا کوئی خدمت میرے لائق؟

حُرؓ نے رومال بیٹے کے ہاتھ میں دیا، کہا ذرا میرے ہاتھوں کو باندھ تو دو۔ یہی وہ ہاتھ ہیں جو مولاؑ کے لجامِ فرس تک پہنچ گئے تھے میں چاہتا ہوں کہ ہر دیکھنے والا پہچان لے کہ ایک خطا کار ہے جو معافی کا طلبگار ہے۔

اِدھر حُرؓ چلے اُدھر حسینؑ نے آواز دی، چاہنے والو اُٹھو، ارے میرا مہمان آ رہا ہے۔ بڑھو استقبال کرو۔

اصحاب نے استقبال کیا۔ حُرؓ نے مولاؑ کو دیکھا سر قدموں پر رکھ دیا۔ حسینؑ نے کہا حُر سر اٹھا لو۔ کہا مولا جب تک خطا معاف نہ ہو گی یہ سر نہ اُٹھے گا۔

حسینؑ نے کہا تیری خطا کو میں نے معاف کیا میرے خدا نے معاف کیا اب تو سر اُٹھا لے

کہا مولا یہ تو آپ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے میں نے راستہ روکا تھا، اگر مجھے یہ انجام معلوم ہوتا تو میں کیوں آپ کا راستہ روکتا۔ اب پہلے مجھے اجازت دیجیے۔ پہلے میں قربان ہو جاؤں۔

اے حُرؓ یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ ابھی تم آئے ہو۔ حسینؑ کسی خاطر کے قابل بھی نہیں ہے خیمہ میں اب تو ایک قطرۂ آب بھی نہیں رہ گیا ہے۔ میں تمھیں مرنے کی اجازت دے دوں؟

حُرؓ نے ہاتھ جوڑے، کہا مولاؑ! اگر خاطر کرنا چاہتے ہیں تو میرے بیٹے کو مرنے کی اجازت دیدیجئے۔ میرے بیٹے کو مرنے کی رضا دیدیجئے۔

حسینؑ نے فرمایا حُرؓ کیا کروں آج تو قربانیوں کا دن ہے۔ جاؤ میں نے اجازت دیدی۔ بس آخری جملہ۔ حُرؓ نے اپنے جوان بیٹے کو سمجھایا، آراستہ کیا، گھوڑے پر بٹھایا میدان کی طرف رُخصت کیا۔ حُرؓ کا جوان بیٹا جہاد کر رہا ہے۔ ابن سعد کی فوجیں آگے بڑھیں چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔ حملوں پر حملے شروع ہو گئے، وار پر وار اور زخموں پر زخم۔

حُرؓ کا بیٹا اب جو گھوڑے سے گرنے لگا تو آواز دی بابا! اسے بیٹے کا آخری دیدار کرنا ہو تو آجائیے۔ بیٹے کو دیکھنا ہو تو آجائیے۔

حُرؓ کے کانوں میں جوان بیٹے کی آواز آئی۔ حُرؓ اٹھے کمر کو کس کے بامعہ میدان کا رُخ کیا۔ کسی نے آ کے امام حسینؑ سے کہا حُرؓ تو میدان میں جا رہے ہیں۔ ارے اس کرم کا جواب کہاں ملے گا۔ حسینؑ اٹھے، حُرؓ کے قریب آئے۔ حُرؓ کیا ارادہ ہے؟

کہا مولا جوان بیٹے نے پکارا ہے۔ میں اپنے لال کے سرہانے جا رہا ہوں۔

فرمایا حُرؓ یہ نہ ہو سکے گا تم نہ جاؤ گے میں جاؤں گا۔

ارے مولا آپ یہ زحمت کیوں فرمائیں گے؟

کہا اس لیے کہ باپ کا معاملہ ہے اور جوان بیٹے کا مسئلہ ہے۔ اپنے بیٹے کو کیسے تڑپتے دیکھو گے۔ اپنے لال کو کیسے ایڑیاں رگڑتے دیکھو گے۔ میں جاؤں گا تمہارے لال کا لاشہ اُٹھا کے لاؤں گا۔

حُرؓ کو روکا، حسینؑ میدان میں آئے۔ حُرؓ کے بیٹے کا لاشہ تو اُٹھ گیا مگر ایک وہ وقت بھی آیا جب حسینؑ جیسا باپ علی اکبرؑ جیسا بیٹا۔ اب کون لاشہ اٹھائے۔ آواز دی، بنی ہاشم کے بچو! آؤ ضعیف باپ سے جوان بیٹے کا لاشہ نہ اُٹھ سکے گا۔

سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ۝

مجلس ۵

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ
بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ
اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفس مطمئن! پلٹ آ اپنے رب کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے، ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

سورۂ مبارکہ فجر کی ان آخری آیات کریمہ کے ذیل میں "کربلا شناسی" کے عنوان سے جو معروضات آپ کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے ان کا پانچواں مرحلہ "سیاست امام حسینؑ" سے متعلق ہے۔ لفظ سیاست ساری دنیا کا محبوب ترین لفظ ہے اور ساری دنیا کا بدنام ترین لفظ بھی ہے۔ یہ اگر انسان کو مل جائے تو کوئی چھوڑنے والا نہیں ہے اور اگر ہاتھ نہ آئے تو کوئی بخشنے والا نہیں ہے۔

عجیب و غریب بات ہے کہ کل کی تاریخ میں آل محمدؐ کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سیاست سے باخبر نہیں ہیں اور آج کی دنیا میں ہر آدمی کو یہ فکر ہے کہ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو ہو مگر اس موضوع کو زیر بحث نہ لایا جائے۔

لفظ سیاست جو دور حاضر میں اور شاید ہر دور میں ایسے غلط معانی میں استعمال ہوا ہے کہ انتہائی بدنام ترین لفظ ہو گیا ہے۔ اس کے واقعی معنی ہیں تدبیر اور انتظام۔

تدبیر اور انتظام کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ یعنی ہر انسان کو پہلے اپنا ایک مقصد طے کرنا ہوتا ہے اس کے بعد اس مقصد کو حاصل کرنے کے [illegible]

اس مقصد تک پہنچنے کے لیے تدبیریں کرنا ہوتی ہیں۔ اسی تدبیر اور اسی انتظام کو سیاست کہا جاتا ہے۔

سیاست کی واقعیت اور اس کی عظمت و اہمیت کو پہچاننے کے لیے ان دونوں باتوں پر نگاہ رکھنا ہوگی۔ جو انسان اس راہ میں قدم رکھتا ہے اس کا مقصد کیا ہے، اور اس مقصد تک جانے کے لیے اس نے کیا تدبیر اختیار کی ہے اور کیا راستہ اختیار کیا ہے۔

کبھی انسان مقصد کی تعیین میں دھوکہ کھا جاتا ہے اور کبھی انسان راستہ کے انتخاب میں بدنام ہو جاتا ہے۔

توجہ فرمائیں گے۔ مسئلہ انتہائی حساس ہے لہٰذا میں ان تمام باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف اپنے موضوع کے حدود میں اپنی باتوں کو گذارش کرنا چاہتا ہوں۔

تو پہلا مرحلہ ہے وہ مقصد جس کو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے، اور دوسرا مرحلہ ہے وہ تدبیر و تنظیم جس کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

تو کسی سیاست کی اچھائی یا بُرائی کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ اگر مقصد اچھا ہے تو سیاست اچھی کہی جائے گی، اور اگر مقصد خراب ہے تو سیاست خراب ہو جائے گی اور مقصد کی اچھائی کے بعد اگر وہاں تک جانے کا راستہ مناسب اور اچھا ہے تو بہترین سیاست کہی جائے گی، اور مقصد لاکھ بلند ہو اگر جانے کا راستہ خراب ہے تو سیاست کو گندہ اور ذلیل قرار دیا جائے گا۔

آج ساری دنیا میں سارے فیصلے اسی بنیاد پر ہوتے ہیں ورنہ کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ ہمارا مقصد خراب ہے۔ ہر انسان یہ کہتا ہے کہ ہم نے انتہائی پاکیزہ اور بلند ترین مقصد کو نگاہ میں رکھا ہے مگر خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہاں تک جانے کے لیے جو راستے اختیار کیے جاتے ہیں وہ راستے اتنے گندے ہوتے ہیں کہ مقصد کی بلندی بھی اس راستہ کو پاکیزہ نہیں بنا سکتی ہے۔ لہٰذا کسی انسان کی سیاست کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان دو باتوں کو دیکھنا ہوگا کہ فریقین کا مقصد کیا تھا اور فریقین نے

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تدبیر کیا کی ہے۔ توجہ فرمائیں گے۔ ہر مقابلہ میں یا فریقین کے مقصد سے ان کی عظمت کا فیصلہ ہوگا یا مقصد تک جانے کے لیے جو راستہ دونوں نے اختیار کیا ہے اس راستہ سے ان کی سیاست کی کامیابی کا فیصلہ ہوگا۔ اگر وہ راستہ اچھا ہے اور وہ وسائل اور ذرائع ایسے ہیں جو مقصد تک پہونچا دینے والے ہیں تو سیاست کو کامیاب کہا جائے، اور اگر ذرائع مقصد تک لے جانے والے نہیں ہیں تو ایسی سیاست کو ہر دور میں ناکام اور ناکامیاب کہا جائے گا۔

امام حسینؑ کے مقاصد کو پیش کرنے سے پہلے اور امام حسینؑ کے طریقۂ کار کو نگاہ میں رکھنے سے پہلے ایک جملہ امام حسینؑ اور یزید دونوں کی وراثت کے بارے میں گذارش کرنا ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ وہ مقصد جو امام حسینؑ کو ملا ہے وہ کیا ہے اور وہ مقصد جو یزید کے ہاتھوں میں آیا ہے وہ کیا ہے؟

یہ بعد میں فیصلہ ہوگا کہ اپنے اپنے مقصد تک جانے کے لیے دونوں نے کیا راستے اپنائے ہیں۔

توجہ فرمائیں گے۔ آخری مرحلۂ حیات میں جب مولائے کائنات کا سر اقدس مسجد کوفہ میں عین حالت سجدہ میں زخمی ہوا اور سر پر ابن ملجم کی تلوار لگی تو صورت حال یہ ہے کہ علیؑ کی تلوار دشمن پر نہیں چل رہی ہے موقع وہ ہے کہ جہاں نہ کوئی میدان ہے، نہ کوئی معرکہ ہے، نہ کوئی لڑائی ہے۔ ایک بندۂ خدا کا سجدہ ہے اور قاتل کی تلوار اس بندۂ خدا پر چل رہی ہے۔ تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جب تلوار ظالم کی چل گئی، جب قاتل کا وار کامیاب ہو گیا جب علیؑ کا سر شگافتہ ہو گیا تو علیؑ کو صدمہ ہو گیا کہ جس کی ایک تلوار سے بدر میں ۳۶ مارے گئے جس کی ایک تلوار نے اُحد کے معرکہ کو فتح کیا، جس کی ایک تلوار نے مرحب کے دو ٹکڑے کر دیئے جس کی ایک ضربت نے کل کفر کا خاتمہ کر دیا آج اس پر یہ وقت آگیا ہے کہ دوسرے کی تلوار اس پر چل رہی ہے۔

توجہ نہیں کی آپ نے۔ جو انسان ہمیشہ معرکوں میں گلے کاٹتا رہا ہے، دشمنوں کو فی النار کرتا رہا ہے، دشمنوں کو تہ تیغ کرتا رہا ہے اگر کبھی وہ زخمی ہو جائے تو اسے صدمہ ہونا چاہیئے

افسوس ہونا چاہیئے کہ جو ہمیشہ فاتح رہا جو ہمیشہ معرکوں کو سر کرتا رہا جس کے مقابلہ میں بڑے بڑے سورما آنے کے بعد نہ ٹھہر سکے۔ اور انسانوں کا ذکر کیا ہے سارا لشکر جس سے مقابلہ نہ کر سکا، جس کی تلوار نے ایسوں کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہو جن کا نام سن کر سارا لشکر سر نہ اٹھا سکے ایسے انسان کے سر پر تلوار چل جائے اور اس کا سر زخمی ہو جائے تو اسے پھر زندگی میں کبھی سر اٹھانا نہیں چاہیئے۔ ہر محفل میں، ہر انسان کے سامنے شرمندہ ہونا چاہیئے کہ جو ہمیشہ کامیاب رہا آج کامیاب نہ ہو سکا۔ جو ہمیشہ گلے کاٹتا رہا آج اس کے سر پر تلوار چل گئی۔ مگر یہ تاریخ کا عجیب و غریب منظر ہے کہ جب تک علیؑ کی تلوار دشمنوں پر چلتی رہی جب تک علیؑ کے ہاتھوں دشمن کا سر کٹتا رہا۔ علیؑ نے اپنی کامیابی کا اعلان نہیں کیا اور جب ظالم کی تلوار علیؑ کے سر پر چل گئی تو علیؑ نے سر اٹھاتے ہی آواز دی "فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ" پروردگار کعبہ کی قسم علی کامیاب ہو گیا۔

خدا جانتا ہے کہ دنیا کا کوئی دوسرا انسان ہوتا تو اس کا سر جھک جاتا۔ اتنا بڑا فاتح، اتنا بڑا کامیاب انسان، اتنا بڑا سورما، ساونت، مجاہد، غازی اور اس کے ساتھ یہ صورت حال پیش آجائے مگر علیؑ نے سر اٹھا کے اعلان کیا "رب کعبہ گواہ ہے کہ علیؑ کامیاب ہے" جو کل اعلانِ کامیابی نہیں کر رہا تھا وہ اب اعلانِ کامیابی کر رہا ہے تاکہ دونوں مقصد واضح ہو جائیں کہ اگر میرا مقصد گلے کاٹنا ہوتا، اگر میرا مقصد میدانوں کو سر کرنا ہوتا، اگر میرا مقصد اپنے لیے غازی اور مجاہد کا لقب لینا ہوتا تو میں میدانوں میں کامیابی کا اعلان کرتا۔ میرا مقصد عبادتِ الٰہی اور سجدۂ پروردگار کو بقائے دوام دینا ہے' لہذا آج جب سجدہ میں میرا سر زخمی ہوا تو دنیا یہ پہچان گئی کہ میرے اور دشمن کے درمیان یہی فرق ہے کہ سجدہ کرنا میرا کردار ہے اور سجدہ گذار پر حملہ کرنا اس کا کردار ہے۔

توجہ کی آپ نے!۔ یہ علیؑ ہیں جو اپنے مقصد کا اعلان کر رہے ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ میں کیوں کامیاب ہوں۔

اس لیے کہ میرا مقصد ہے رضائے خدا، میرا مقصد ہے بندگیٔ پروردگار، میرا مقصد

مسجد کوفہ کا اعلان کعبہ کے حوالے سے کیا۔ توجہ کریں۔ مسجد کوفہ میں اعلان کیا اور حوالہ کعبہ کا دیا۔ "فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَةِ" پروردگار کعبہ کی قسم علیؑ کامیاب ہے۔ تو اعلان کوفہ میں ہو رہا ہے اور حوالہ کعبہ کا دیا جا رہا ہے۔ اب دونوں کا رابطہ پہچانیے۔ علیؑ نے اپنی کامیابی میں رب کعبہ کی قسم کھا کے آغاز اور انجام دونوں کو واضح کر دیا کہ میری کامیابی کا آغاز کعبہ ہے اور میری کامیابی کی انتہا کوفہ۔ وہاں بھی آیا تھا تو کعبہ میں قدم رکھتے ہی سجدہ کیا تھا اور یہاں سے بھی جا رہا ہوں تو سجدہ میں زخمی ہو کر جا رہا ہوں۔ سجدہ ابتدا ہے، سجدہ انتہا ہے اور یہی علیؑ کی کامیابی ہے۔ یہی حیات علیؑ کی کامیابی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ باپ جب کامیابی کا اعلان کر رہا تھا تو کامیابی کعبہ سے چل کر کوفہ تک آئی تھی اور بیٹا جب کامیابی کا اعلان کر رہا تھا تو کامیابی کوفہ سے چل کر کعبہ تک جا رہی تھی مگر یہاں سر ہوا عظمت کعبہ وہاں برقرار رہ گئی۔

بندگی پروردگار اور رضائے الٰہی ہے مقصد علیؑ۔

اس کے بعد دوسرا منظر امام حسنؑ اور حاکم شام کی صلح کے بعد جب حاکم شام نے اپنی نگاہ میں اپنا مقصد حاصل کر لیا تو خطبہ پڑھا۔ تاریخ میں یہ خطبہ محفوظ ہے "یَا اَھْلَ الْکُوْفَةِ" یعنی اے حسنؑ کے چاہنے والو، اے کوفہ والو! "اِنِّیْ مَا قَاتَلْتُکُمْ لِتُصَلُّوْا وَتُزَکُّوْا وَتَحُجُّوْا" یہ یاد رکھنا میں نے اس لیے تم سے جنگ نہیں کی ہے کہ تم نماز پڑھنے لگو۔ یہ تاریخ کے الفاظ ہیں۔ میں نے اس لیے تم سے جنگ نہیں کی ہے کہ تم نمازی ہو جاؤ۔ تم زکوٰۃ دینے لگو، تم حج کرنے لگو۔ اس کام کے لیے میں کیسے جنگ کروں گا جب کہ میں خود جانتا ہوں کہ تم نماز پڑھتے ہو۔ تم زکوٰۃ دیتے ہو، تم حج کرتے ہو تو تم سے نماز کے لیے جنگ ہو سکتی ہے، نہ زکوٰۃ کے لیے ہو سکتی ہے، نہ حج کے لیے ہو سکتی ہے تو پھر یہ جنگ کیوں ہوئی۔

ہم آپ نہیں طے کریں گے، جو صاحب معاملہ ہے وہ طے کرے۔ تو تم یہ پوچھو گے پھر یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے۔ تو یاد رکھو "اِنِّیْ قَاتَلْتُکُمْ لِاَتَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ" میں نے تم سے صرف اس لیے جنگ کی ہے تا کہ تمھاری گردنوں پر حکومت کروں تا کہ تم پر حاکم ہو جاؤں۔

مقصد پہچانا آپ نے

یہ سارے ہنگامے کیوں؟ تاکہ تمہاری گردنوں پر میری حکومت قائم ہو جائے۔ تو اُدھر کا مقصد ہے بندگیٔ پروردگار، اِدھر کا مقصد ہے لوگوں پر حکومت کرنا۔ وہ اُس مقصد کا وارث ہے جس کا نام ہے حسینؑ بن علیؑ، یہ اِس مقصد کا وارث ہے جس کا نام ہے یزید بن معاویہ۔

یہ اقتدار کا مقصد لے کر آیا ہے، وہ بندگیٔ پروردگار کا مقصد لے کر آئے ہیں۔ مگر ایک بات یاد رکھیے گا ان دونوں کا ایک بڑا نازک سا فرق ہے جو میں ایک لفظ میں اپنے نام سننے والوں کو سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ یہ اقتدار کیا ہے اور بندگیٔ پروردگار کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جب حکومت لینے والا اپنی مرضی چلانے کے لیے حکومت لیتا ہے تو اس کا نام ہے آمریت، اس کا نام ہے استبداد، اس کا نام ہے حکومت۔ اور حکومت پر قبضہ کرنے والا جب اوامرِ الٰہی کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو اس کا نام ہے دین، اس کا نام ہے مذہب اور اس کا نام ہے اسلام۔

اسلام کبھی یہ نہیں چاہتا کہ ہم محکوم بن کر غلامی کریں۔ اسلام خود حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اللہ نے انبیاء و مرسلین کو اسی لیے بھیجا ہے کہ ہماری دنیا میں ہمارے قانون کو نافذ کریں، ہماری دنیا میں ہمارا قانون چلائیں۔ اسی لیے انبیاء آئے، مرسلین آئے، اولیاء، خاصانِ خدا سب کا ایک مقصد تھا کہ دنیا خدا کی ہے تو قانون خدا کا ہونا چاہیے اور دنیا کے افراد اور دنیا کے سلاطین اور حکام۔ یہ تو جانتے تھے کہ دنیا ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے مگر چاہے ملک خدا کا رہے مگر قانون ہمارا رہے۔ بڑی نازک منزل ہے اگر آپ متوجہ رہیں۔ اللہ کے بندے یہ چاہتے ہیں کہ ملک اللہ کا ہے تو قانون اللہ کا رہے۔ دنیا کے بندے یہ چاہتے ہیں کہ ملک اللہ کا رہے اور قانون ہمارا رہے۔ جو ہم چاہیں۔ جو ہماری مرضی ہو اور دونوں کا ایک بڑا نازک سا فرق ہے۔ جو وہ مقصد لے کر آتے ہیں کہ ملک خدا میں قانونِ خدا رائج ہو وہ اس وقت تک اقتدار کو ہاتھ نہیں لگا سکتے جب تک قانونِ خدا سے باخبر نہ ہوں۔ اس لیے کہ اگر قانونِ خدا کو نافذ کرنا چاہتے ہیں وہ پہلے قانونِ خدا سے باخبر ہوں جب ہی تو نافذ کریں گے تو اگر ان کے پاس قانونِ الٰہی کا علم نہ ہوگا تو اقتدار کو ہاتھ

نہ لگائیں گے اور جو اپنی مرضی چلانا چاہتے ہیں وہ قانون سے بے خبر ہوتے ہیں مگر حاکم ہوتے ہیں۔ بس یاد رکھیے گا جہاں حکومت نتیجۂ علم ہو وہاں قانونِ الٰہی چلتا ہے اور جہاں حکومت کی لائن علم سے الگ ہو جائے اور یہ کہا جائے کہ اقتدار اِن کا ہے علم اُن کا ہے۔ حضورؐ نے خود کہا ہے علم لینا ہو تو اُدھر چلے جانا اور اقتدار لینا ہو تو جدھر چاہو ادھر چلے جانا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قانونِ الٰہی سے الگ حکومت جاری ہے اور جو قانونِ الٰہی سے الگ حکومت ہو جائے وہ نفس کا اقتدار ہے قانونِ خدا کی حکومت نہیں ہے۔

یہ ایک بنیادی فرق ہے میں آپ کے سامنے گذارش کرنا چاہتا تھا اس کے بعد چار پانچ بنیادی مسائل ہیں انھیں آپ ذہن میں محفوظ کرلیں تاکہ میں نتیجہ تک جا سکوں اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں جس کو سیاست کہا جاتا ہے۔ جو مقصد بھی ہو اچھا یا بُرا اس مقصد تک پہنچنے کے لیے چند باتیں جو ہمیشہ جُرم ہوتی ہیں مگر اس راستہ پر آکے ہنر بن جاتی ہیں۔

جو صاحبانِ اقتدار دنیا میں پائے جاتے ہیں کفار و مشرکین کی مثالیں تو دنیا میں آپ کو بہت مل جائیں گی اور انھیں مثالوں سے دوسرے افراد کو بھی آپ پہچان لیں گے۔ ہمیشہ قانون یہ ہے اور اسی لیے سیاست نے ایک اصول ہمیشہ سے بنا رکھا ہے کہ مقصد تک جانے کے لیے جو راستہ بھی اختیار کیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اقتدار کو بیچ سے الگ کر دیا جائے تو ساری وہ باتیں جو جُرم ہوتی ہیں جب اقتدار کی راہ میں وہی باتیں استعمال کی جاتی ہیں تو ہنر بن جاتی ہیں۔ جھوٹ بولنا عیب ہے یا نہیں؟ کوئی ہے دنیا میں ایسا جو کہہ دے جھوٹ بولنا عیب نہیں ہے۔ کسی فرقہ کا، کسی مذہب کا، مسلمان، کافر، دین دار، بے دین، ملحد، مشرک کوئی ہے جو کہے جھوٹ عیب نہیں ہے؟ سب کہیں گے کہ جھوٹ عیب ہے، بُرا ہے۔ لیکن الیکشن میں جتنا جھوٹ بولا جائے انشاء اللہ اتنے ہی ووٹ زیادہ ملیں گے۔ جس سے پوچھو یہ جتنی باتیں کہہ رہے ہیں صحیح کہہ رہے ہیں۔ کہا وہ کون صحیح کہتا ہے کہ یہی صحیح کہیں گے۔ کون سچ بولتا ہے جو یہ سچ بولیں گے۔ جب جانتے ہو جھوٹ بول رہے ہیں تو جھوٹے کو کیوں ووٹ دے رہے ہو؟ جھوٹے کی کیوں حمایت کر رہے ہو؟ یہ غلط کار انسان ہے۔ غلط کار انسان کی حمایت کرنے والا روزِ قیامت غلط کار

سب صحیح ہے مگر یہ دنیا کا کاروبار یوں ہی چلتا ہے۔ یعنی انفرادی معاملات میں جھوٹ بولیں تو عیب۔ حکومتی مسائل میں جھوٹ بولا جائے تو ہنر۔ یہ دنیا کا نقشہ ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ ہر جگہ جس نے بھی الیکشن کا تجربہ کیا ہے، جو اس بلا سے محفوظ ہیں شکر خدا کریں لیکن جس نے تجربہ کیا ہے وہ جانتا ہے۔

تو جھوٹ ہر جگہ عیب ہے۔ ہر جگہ جرم ہے۔ ہر جگہ بُرائی ہے۔ مگر اقتدار کی راہ میں ہنر ہے۔ کمال ہے جو جتنا بڑا جھوٹ بولنے کا ماہر ہے اتنا ہی بڑا کامیاب کہا جائے گا۔

دوسرے پر اتہام اور الزام لگانا عیب ہے یا ہنر؟ آپ فیصلہ کریں۔ یہ الزام لگانا یا کسی پر جھوٹا اتہام لگانا یہ عیب ہے یا نہیں ہے؟ لیکن جب اقتدار کا معاملہ سامنے آجائے تو یہ اپنے اپوزیشن کے بارے میں جو چاہیں کہیں، وہ اپنے اپوزیشن کے بارے میں جو چاہیں کہیں، کوئی قانون گرفت کرنے والا نہیں ہے کہ یہ الزام ہے، یہ اتہام ہے، یہ غلط بیانی ہے، تمہیں حق نہیں ہے میدان میں آنے کا۔ اس لیے کہ تم الزام لگانے والے ہو، اتہام رکھنے والے ہو، جھوٹ بولنے والے ہو، کوئی کہنے والا نہیں ہے۔ یعنی ہر لائن میں جاؤ تو یہ جرم ہے، اس لائن میں آجاؤ تو یہ جرم نہیں ہے۔ بلکہ میں نے تو ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ ان سے پوچھا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی احمق آدمی آپ کو ووٹ دیدے گا۔ آپ کی اوقات کیا ہے، حیثیت کیا ہے؟ کہنے لگے یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ہم کو کوئی نہ دے گا اور خود ہم بھی اپنا ووٹ نہ دیں گے۔ بھائی تو ووٹ ملنے والے نہیں، آپ کامیاب ہونے والے نہیں نہ ایم ایل اے ہونے والے ہیں نہ ایم پی ہونے والے ہیں تو کس خوشی میں آپ کھڑے ہوگئے ہیں؟

کہنے لگے آپ نہیں جانتے یہ دنیا دوسری ہے اس کو ہم جانتے ہیں یعنی وہ دنیا کیا ہے؟ آپ کے کھڑے ہونے کا مقصد کیا ہے؟ کہا بات یہ ہے کہ جو مقابلہ پر آجاتا ہے اس کو حزب اختلاف کے بارے میں سب کچھ کہنے کا حق مل جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ میں کوئی سیاسی تقریر تو نہیں کر رہا ہوں ورنہ میں سیکڑوں مثالیں آپ کو سنا دیتا۔ میں تو اپنے موضوع کی حد تک بات کہنا چاہتا ہوں

ہیں کہ ان کے مقابلہ میں دوچار چھ دس جتنے امیدوار ہیں دوچار الزام ان پر لگائیں گے' دوچار باتیں اُن کے بارے میں کہیں گے' دوچار گالیاں اِن کو دیں گے۔ فقط گالیوں کو' تہمتوں کو جائز بنانے کے لیے یہ میدان میں آئے ہیں۔ اس لیے کہ اور اوقات میں جھوٹ جائز نہیں ہوتا مگر اس میدان میں آنے کے بعد اس کا نام تہمت نہیں ہے' اس کا نام ہے سیاسی عمل۔ اس کا نام سیاسی تدبیر ہے اس لیے کہ اپنے مقصد تک جانے کے لیے ہر آدمی کوئی راستہ نکالتا ہے۔ یہ بھی ایک راستہ ہے تو جھوٹ ہر جگہ عیب ہے مگر یہاں عیب نہیں ہے۔ اتہام ہر جگہ عیب ہے مگر یہاں عیب نہیں ہے۔ حساب لگاتے چلیں آپ اور آگے بڑھیں۔ جھوٹا پروپیگنڈہ کرنا۔ خالی یہی نہیں کہ الزام لگا دیا۔ اس الزام کا اشتہار اور پروپیگنڈہ کرنا ہر جگہ عیب ہے۔ مگر اس میدان میں آنے کے بعد پھر عیب نہیں رہ جاتا اور اس سے آگے بڑھ جائیں جو اس سے بدترین بات ہے آپ میرے گھر میں بغیر میری مرضی کے پانچ منٹ کے لیے اگر بیٹھ جائیں تو سارا محلہ کہے گا نالائق ہیں۔

میرا گھر ہے میرے گھر کا دروازہ ہے آپ کرسی رکھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا بھائی دروازہ میرا ہے۔ کہنے لگے وہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ ہم نے کہا آپ کیسے بیٹھ گئے' میں راضی نہیں ہوں؟ کہا آپ ہرگز راضی نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ پھر آپ کیوں بیٹھ گئے؟ کہا ہمارا جی چاہتا ہے۔ اب جو محلہ والا گھر سے باہر نکلا ہم نے کہا آپ دیکھ رہے ہیں' یہ ہمارے گھر میں کرسی رکھ کر بیٹھے ہیں۔ ہمارے دروازے پر راستہ روکے ہوئے ہیں۔ سب نے کہا آپ کو شرم نہیں آتی ہے۔ مکان دوسرے کا ہے' دروازہ دوسرے کا ہے وہ راضی نہیں ہے آپ کیسے آکر بیٹھ گئے۔ ہر آدمی بُرا کہے گا' ہر آدمی مذمت کرے گا۔ لیکن یہی صاحب انفرادی عمل کو سیاسی بنا دیں' تو جہاں چاہو کرسی رکھ کر بیٹھ جاؤ۔ توجہ کریں۔ یعنی میرے دروازہ پر کرسی رکھ کر بیٹھ جائے جب کہ میں کیا' میری اوقات کیا' تو سب مجرم کہیں گے اور ملک خدا میں کرسی رکھ کر بیٹھ جائے تو کوئی کچھ کہنے والا نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہر راستہ میں یہ عمل ناجائز ہوتا ہے مگر سیاسی راستہ میں یہ عمل بھی جائز ہو جاتا ہے۔ تو یہ ایک ایسی دنیا

ایک قانون ہے کہ مقصد تک جانے کے لیے جو راستہ بھی اختیار کیا جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مقصد ٹھیک ہونا چاہیے اور مقصد بھی کیا ہے اپنے اقتدار کو مضبوط بنالینا تو جیسے مضبوط بن جائے وہاں تک انسان چلا جائے گا۔ مگر اسی مقام پر اس بات کو پہچاننا ہے کہ جو آمریت اور حکومت کا طلبگار ہے وہ اپنے مقصد تک جانے کے لیے جھوٹ کو بھی ذریعہ بنائے گا۔ اتہام کو بھی ذریعہ بنائے گا۔ پروپیگنڈہ کو بھی ذریعہ بنائے گا۔ ہر ایک کے گھر میں کرسی رکھ کر بیٹھ جائے گا۔ مگر جو مرضی خدا کا طلبگار ہے اس کی مجبوری یہ ہے کہ چاہے مقصد حاصل ہو یا نہ ہو جھوٹ نہیں بول سکتا ہے۔ نہیں میں جو بات کہہ رہا ہوں سوچیے گا۔ چاہے مقصد حاصل ہو یا نہ ہو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تہمت نہیں لگا سکتا۔ دوسرے کی ملکیت پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ کسی کے خلاف غلط پروپیگنڈہ نہیں کر سکتا۔ اس کا ایک اعلان ہے میں جرم نہیں کروں گا۔ گناہ نہیں کروں گا۔ برائی نہیں کروں گا۔ چاہے مقصد حاصل ہو یا نہ ہو۔ تو جتنے ماہرین سیاست ہیں وہ سب کہتے ہیں اگر یہ نہ کرو گے تو اس دنیا میں آئے کیوں تھے۔ یہاں قدم رکھا کیوں تھا۔ اس لیے کہ یہاں کامیابی بغیر ان وسائل کے حاصل نہیں ہو سکتی ہے اگر آپ نے ان وسائل کو چھوڑ دیا تو ناکام ہو کر رہ جائیں گے۔ تو عزیزو! میرا جملہ یاد رکھیے گا۔ جب ساری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ جو وسائل دنیا میں اختیار کیے جاتے ہیں جو اختیار کرے گا وہ کامیاب ہو گا، جو اختیار نہیں کرے گا وہ ناکام ہو جائے گا۔ تو ایسی دنیا میں اگر کوئی بندہ ایسا پیدا ہو جائے جو سارے غلط وسائل کو ٹھکرا دے اور اس کے بعد بھی کامیاب ہو جائے تو دنیا کو ماننا پڑے گا کہ یہ اتنا بڑا ماہر سیاست ہے کہ دنیا کے سارے سیاست داں اس کے سامنے طفل مکتب نظر آتے ہیں۔

یہ ہے میرا دعویٰ اب اس کے بعد میں آپ کے سامنے حسینؑ بن علیؑ کی سیاست کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس نکتہ کو ذہن میں رکھیں گے۔ جو مقصد حسینؑ کا ہے وہ آپ کے سامنے ہے اور جو دنیا میں مقصد تک جانے کے لیے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں وہ سب اسلام کے جرائم ہیں اور امام حسینؑ ان راستوں کو اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ ان سارے راستوں

حاصل کی ہے اس کے لیے چند جملے گذارش کرنا ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں بات بہت پہلے سے شروع کرتا مگر شاید وقت کافی نہ ہوگا اس لیے بات کو محدود انداز سے گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اہلِ نظر ہیں بات کو خود پہچانیں گے۔ بس تاریخ کے دو ایک منظر:

سرکارِ دو عالمؐ طوافِ خانۂ خدا کے لیے آئے ۶ھ میں، اور جب مکّہ کے قریب پہونچے تو مشرکینِ مکّہ نے کہا کہ ہم آپ کو نہ آنے دیں گے۔ ہم آپ کو اپنے شہر میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ یہ کون کس سے کہہ رہا ہے۔ یہ مکّہ کے کفار سرکارِ دو عالمؐ سے کہہ رہے ہیں۔ تو اگر یہ ان کا وطن ہے تو سرکار کا وطن کہاں ہے۔ توجہ کریں گے آپ۔ اگر یہ مکّہ والوں کا وطن ہے تو پیغمبرؐ کا وطن کہاں ہے۔ پیغمبرؐ کہاں پیدا ہوئے۔ پیغمبرؐ کے آباء و اجداد کہاں تھے۔ پیغمبرؐ کے بزرگانِ خاندان کہاں تھے۔ سب مکّے کے رہنے والے تو ہیں۔ تو اگر یہ تمہارا وطن ہے تو ان کا بھی وطن ہے، اس کے معنی کیا کہ ہم آپ کو نہ آنے دیں گے۔ اور جس گھر پر تم نے اپنے خداؤں کا قبضہ دلایا ہے وہ بھی انھیں کے خدا کا گھر ہے۔ یعنی تمہارے خدا تو اتنے مفلس ہیں کہ ان کو بیٹھنے کا ایک گھر بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ تین سو ساٹھ خدا اتنے مفلس ہیں کہ تم نے ان کے واسطے ایک گھر بھی نہ بنا کے دیا۔ چندہ کر کے بنا دیا ہوتا کہ یہ خدا ہیں تو بیچارے کو کہیں بیٹھنے کی جگہ تو مل جائے۔ مگر یہ جانتے ہیں کہ جو بنایا ہوا ہوتا ہے اپنے گھر بٹھایا تو گاڑی چلے گی نہیں۔ اتنا سب کو اندازہ تھا کہ بنا لینا آسان ہے مگر بنا کے اگر اپنے ہی گھر بٹھالیا تو کوئی پُرسانِ حال بھی نہ پیدا ہوگا لہٰذا وہاں بٹھاؤ جدھر لوگ پہلے سے متوجہ ہیں۔ تو یہ تدبیر پہلے سے سب کو معلوم تھی۔ یہ طریقۂ کار چلا آرہا تھا اور وہی تو تھے جو اُدھر سے اِدھر چلے آئے تھے۔ تو جہاں سے آئے تھے وہیں کے اصول بھی لیے چلے آئے۔ نہیں ایک تاریخی لفظ میں نے کہا آپ نے غور نہیں کیا۔ جو کفر کے گھر سے آئے تھے وہ کفر کے اصول لے کر آئے۔ جو خدا کے گھر سے آیا تھا وہ خدائی قانون اپنے ساتھ لے کر آیا۔

تو سرکارِ دو عالمؐ سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم آپ کو مکّہ میں نہیں آنے دیں گے اور حضورؐ نے نہایت ہی خاموشی سے اس بات کو قبول بھی فرما لیا اور جو صورت حال تھی وہ آپ

ہوئی اور صلح کس شان کی صلح ؟ ہمارا کوئی آدمی آپ کے یہاں جائے تو آپ کو واپس کرنا ہوگا اور آپ کا آدمی ہمارے یہاں آجائے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے اور آپ تو فی الحال واپس چلے ہی جائیے، ہم آپ کو یہاں داخل بھی نہ ہونے دیں گے۔ ہاں اگلے سال اگر آپ آئیں گے تو آجائیے گا ہم تین دن کے واسطے مکہ خالی کر دیں گے۔ آپ اطمینان سے طواف خانہ کعبہ کریں مگر آج چلے جائیں۔ اب کوئی ان احمقوں سے کہے جب اگلے سال تم کو شہر خالی کر دینا ہے۔ جب اگلے سال سارا مکہ خالی کر کے تم کو باہر نکل جانا ہے اور سارے شہر میں ان کو رہنا ہے تو اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ تھوڑے سے آدمی ہیں نہ تمہارے شہر میں آئیں گے نہ تمہارے گھر جائیں گے، نہ تمہارے محلہ میں جائیں گے۔ اپنے خدا کے گھر آئیں گے، طواف کریں گے چلے جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ آج ہی موقع دے دو، آج ہی انہیں طواف کر لینے دو۔ طواف کریں گے چلے جائیں گے۔ آج تو کسی گھر میں نہیں جائیں گے۔ بہ نسبت کل پورا شہر خالی کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ آج یہ موقع دے دیا جائے۔ مگر ایک مصیبت اور ایک بلا جس نے ہر دور کے انسان کو برباد کیا ہے، آج ہم کو برباد کیا ہے کل دوسروں کو برباد کیا تھا۔ جس کو آج کی زبان میں کہتے ہیں پرسٹیج ایشو اور کوئی مسئلہ نہیں ہے خالی ایک ہی مسئلہ ہے، اگر آج ان کو آنے دیا تو یہ ہماری آن کا مسئلہ ہے، یہ ہماری عزت و آبرو کا مسئلہ ہے، یعنی جو انھوں نے چاہا وہ ہو گیا۔ اور اگر آج ہم کہیں چلے جائے اگلے سال آئیے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہم نے کہا وہ ہوا تو عزت کے پیچھے چاہے جھوٹی ہو یا سچی ہر آدمی مرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اچھے خاصے پڑھے لکھے اس راہ میں کبھی کبھی برباد ہو جاتے ہیں اور حماقتیں کر بیٹھتے ہیں تو وہ تو کفار ہیں، مشرکین ہیں، بے عقل ہیں۔ ان کی بات کیا ہے انھیں صرف ایک بات کا خیال ہے کہ اگر آج یہ چلے جائیں گے تو ہم اونچے ہو جائیں گے۔ اور اگر آج یہ داخل ہو جائیں گے تو یہ اونچے ہو جائیں گے۔ لہٰذا آج یہ چلے جائیں گے تاکہ ہماری بات رہ جائے۔

وہ سمجھے کہ یہ چلے جائیں گے تو ہماری بات رہ جائے گی، اور نبی یہ سمجھ رہے ہیں کہ

ہو جائے تو آگے سیاستِ حسینؑ کا سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مطمئن ہیں اسی لیے حضورؐ واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے ورنہ لڑنے مرنے میں کیا پریشانی ہے، راہِ خدا میں مر ہی تو جائیں گے۔ قتل ہو جائیں گے کوئی پریشانی نہیں مگر نہیں یہ سوچتے ہیں کہ ہم کامیاب۔ حضورؐ یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر ہم چلے گئے تو ہم کامیاب۔ لہٰذا حضورؐ تیار ہو گئے جانے کے واسطے۔ وہ تیار ہو گئے واپس کرنے کے لیے۔ کفار نے کہا ہمارا آدمی جائے گا تو واپس آئے گا، تمہارا آدمی آئے گا تو واپس نہیں جائے گا۔ حضورؐ نے کہا ٹھیک ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے آدمی کا واپس آنا ہماری کامیابی ہے۔ حضورؐ سمجھتے ہیں کہ اُن کے آدمی کا واپس جانا ہماری کامیابی ہے۔

یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبرؐ کے آدمی کو واپس نہ کریں گے تو ہم جیتے۔ پیغمبرؐ سمجھتے ہیں کہ ہمارا آدمی ان کے درمیان رہے گا تو ہم جیتے۔ اب یہ دونوں کی فکر الگ الگ ہے۔ اب مصلحتیں تو بعد میں سامنے آئیں گی کہ کس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جو بات کفار کہہ رہے تھے وہ اتنی ہی غلط تھی کہ جن کو شاید مختلف اعتبارات سے ان سے اختلاف نہ رہا ہو انھیں بھی یہ بات پسند نہیں آئی۔ توجہ کریں۔ ہمارا آدمی جائے تو واپس آئے اور تمہارا آدمی آئے گا تو واپس نہیں جائے گا۔ کسی بھی تھرڈ پارٹی کے سامنے تیسرے آدمی کے سامنے یہ بات رکھتے کہ انھوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کوئی دنیا کا شریف، انصاف پسند آدمی اس کو پسند کرے گا کہ ٹھیک کہا تھا۔ ہر آدمی کہے گا کہ یہ بات کیا ہے کہ صلح کرنا چاہتے ہو تو صلح تو برابر سے ہوتی ہے یا یہ طے کر لو کہ تم لوگوں کے آدمی بھی واپس جائیں گے یا یہ طے کر لو کہ دونوں کے آدمی واپس نہیں جائیں گے یہ کون سی زبردستی ہے۔ جس سے آپ پوچھیں گے یہی کہے گا کہ یہ زبردستی ہے۔ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ یہ مطالبہ غلط ہے اور یہی وجہ ہے کہ بات اتنی واضح تھی کہ پیغمبرؐ والوں نے بھی یہی بات کہی اس لیے کہ جس سے آپ پوچھیں گے وہ یہی کہے گا کہ مطالبہ صحیح نہیں ہے تو باوجودیکہ مطالبہ ظالمانہ ہے، جابرانہ ہے، زبردستی ہے، ناانصافی ہے، مگر نبیؐ نے کہا منظور۔ تو جو دنیاوی سیاست کے مالک تھے وہ سمجھ رہے تھے جبر سے ہم جیتے، ظلم سے ہم جیتے، تشدد سے ہم جیتے، زبردستی سے ہم جیتے

جور تشدد کرتے جارہے ہیں یہ ہماری کامیابی ہے۔ بس یہی فرق تھا سیاست دنیا میں اور سیاست الٰہی میں کہ سیاست دنیا نے جو راستہ اختیار کیا راستہ تو بہرحال غلط تھا، ہر انصاف والا کہتا ہے غلط تھا لیکن اس کے بعد بھی نبیؐ نے منظور کرکے بتادیا کہ تم غلط راستہ سے جہاں جانا چاہتے ہو نہ پہونچنے پاؤ گے اور ہم تمھارے ہی راستہ سے وہ مقصد حاصل کرلیں گے جو ہمارا مقصد ہے۔ اب جو نبیؐ کو واپس کردیا گیا تو اعلان کیا ہوا۔ یہ بے بس تھے چلے گئے، کمزور تھے چلے گئے، ڈر گئے چلے گئے، دب گئے چلے گئے۔ یعنی جتنے الزامات ہیں سب نبیؐ کے خلاف ہیں۔ یہاں تک کہ ساتھ والے متاثر ہو گئے کہ واقعاً یہ تو عجیب و غریب قسم کی باتیں ہیں، عجیب و غریب قسم کی صلح ہے۔ دنیا ہم سے کہے گی ڈر گئے، دب گئے مرعوب ہو گئے، بزدل ہیں، کمزور ہیں، بڑا ہنگامہ ہوگا۔ مگر حضورؐ نے کہا اب منظور ہے، اس لیے کہ فیصلہ کل ہوگا، فیصلہ اگلے سال ہوگا۔ اب جو پیغمبرؐ آئے تو جتنے افراد ساتھ لیکر آئے تھے ان سے کہیں زیادہ ساتھ آئے، یعنی پہلے جو لوگ آئے تھے ان کے سامنے کوئی تلخ تجربہ نہیں تھا، نہ کوئی مزاحمت، نہ کوئی روک ٹوک، نہ کوئی جھگڑا، نہ آخر میں کوئی صلح۔ تب آدمی تھوڑے تھے اب تو سب کو معلوم ہو گیا کہ مزاحمت بھی ہوتی ہے اب تو سب کو اندازہ ہو گیا کہ روک ٹوک کا بھی سلسلہ ہے۔ پابندیاں بھی ہوتی ہیں، نہیں جانے دیں گے مگر اس کے بعد اب جو آئے تو کئی گنا ساتھ آئے۔ ایک دو چار نہیں کئی گنا ساتھ آئے۔ اب اندازہ ہوا کہ کل جتنے ساتھی نبیؐ کے پاس تھے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جب کفر نے میدان جیت لیا تھا اور ڈرا دھمکا کے واپس کردیا تھا تو ساتھی گھٹ جاتے۔ ساتھی کم ہوجاتے۔ مگر ساتھیوں کا بڑھ جانا اس بات کی علامت ہے کہ جس راہ سے وہ اپنا رُعب و جلال دکھلانا چاہتے تھے نبیؐ نے اسی راہ سے اپنی کامیابی کا اعلان کیا اور بیچارے کفار کی عقل میں اتنی بات نہیں آئی کہ اگر آج مکہ میں داخل ہو کر طواف خانۂ خدا کرلینا ان کی کامیابی بن جائے گا تو کل جب ہم سارا شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے اور ان کا سارے شہر پر قبضہ ہو جائے گا تو اسے کیا کہا جائے گا۔

نہیں تو جو کی آپ نے کہ اب تو سب چلے گئے اب تو وہی نظر آرہے ہیں یہ تو

اس سے بڑی کامیابی ہوگی، اس سے بڑی فتح ہوگی مگر کوئی سوچنے کے لیے تیار نہیں ہے آج چلے جائیں کل آجائیں گے۔ پیغمبرؐ واپس چلے گئے ان تمام شرائط کے ساتھ صلح کر کے چلے گئے۔ مگر مستقبل جو سامنے آیا آپ پہچانیں اور یہ ایک بات ہے جو شاید کتابوں سے ہٹ کے گذارش کر رہا ہوں۔ یہ تاریخی مطالعہ کا ایک نتیجہ ہے جو آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ بزدل بنا کے واپس کیا، اپنا رعب و دبدبہ دکھلا کے واپس کیا، یہ سب ہو گیا لیکن جس کو ڈرایا تھا، کمزور بنایا تھا، بزدل بنایا تھا اس کو اس کے شہر میں داخل نہیں ہونے دیا، اس کے خدا کے گھر کا طواف نہیں کرنے دیا۔ اب جو دوبارہ پیغمبرؐ کی آمد ہوئی تو تاریخ نے عجب منظر دکھلایا۔ جو کمزور بن کے گئے تھے جو بقول ان کے ڈر کے گئے تھے وہ جو پلٹ کے آئے تو ان میں نہ کوئی خوشامد کرنے والا دیکھا۔ اے بھائیو اب چین سے حج کر لینے دو، اب کچھ نہ کہو تم نے تو خود ہی چھوٹ دے دی ہے۔ تم نے تو خود ہی موقع دے دیا ہے۔ نہ کسی کو خوشامد کرتے دیکھا، نہ کسی کو ڈرتے دیکھا، نہ کسی کو دبتے دیکھا، نہ کسی کو کمزوری کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہاں جس نے کل رعب داب سے واپس کیا تھا اسے کلمہ پڑھتے دیکھا۔

یہ منظر آپ نے دیکھا کہ کل جن کا وہ زور و شور تھا۔ ہم شہر میں قدم نہ رکھنے دیں گے۔ اب وہ آئے ہیں کہنے کے لیے امان دیدیجیے، کلمہ پڑھوا دیجیے، مسلمان بنا دیجیے۔ اب آپ کلمے کو مسلمان بن رہے ہیں؟ طاقت والے بزدل کے آگے جھک رہے ہیں۔ فوجوں والے کمزور کے آگے جھک رہے ہیں۔ مگر پیغمبرؐ نے بنایا جو راستہ کل میں نے اپنایا تھا اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ مستقبل کی کامیابی کس بات میں ہے۔ اب پہچانو، ان کا راستہ ظلم و تشدد اور جبر کا، اور میرا راستہ تھا مظلومیت کا۔ بس یہی میری گفتگو کا بنیادی نکتہ ہے کہ ان کا راستہ جبر کا، تشدد کا، ستم کا، ظلم کا۔ تو سیاست ظلم انھوں نے اپنائی اور سیاست مظلومیت ہم نے اپنائی اور سال بھر کے اندر دنیا نے دیکھ لیا کہ سیاستِ ظلم زیر ہوگئی اور سیاستِ مظلومیت کامیاب ہوگئی اور اتنی کامیاب ہوگئی کہ جو سیاستِ ظلم کے ٹھیکدار تھے وہ مظلوم کے آگے کلمہ پڑھنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اب بیعت لے لیجیے۔ وہ جس اقتدار کے لیے بے چین تھے وہ مل جائے گا۔ علیؑ نے کہا یہی تو سمجھانا چاہتا ہوں کہ میرا مسئلہ نہ بیعت لینا ہے نہ بیعت کرنا ہے میرا مسئلہ کسی کو

حاکم مانتا ہے نہ کسی سے حکومت منواتا ہے۔ میں حکومت پر ایمان نہیں رکھتا۔ میں عبادتِ الٰہی پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں بندگیٔ پروردگار پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں اپنی حکومت نہیں چاہتا قانونِ الٰہی کی حکومت چاہتا ہوں۔ جب تک قانونِ الٰہی کی حکومت نہ مانو گے، جب تک قانونِ الٰہی کا اقتدار نہ تسلیم کرو گے میں تمھاری بیعت بھی لینے کے لیے تیار نہیں ہوں بیعت کرنے کا کیا ذکر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب صلح ہوئی تب بھی یہی کہا کہ کتابِ خدا پر عمل کرنا ہوگا۔ علیؑ کے احکام پر نہیں اللہ کے احکام پر، تاکہ معلوم ہو جائے کہ جو اپنے لیے مرتے ہیں وہ اور ہوتے ہیں اور جو خدا کے لیے جان دیتے ہیں وہ اور ہوتے ہیں۔

نہیں عزیزو! ابھی گفتگو کے بہت سے مراحل باقی ہیں۔ دیکھیے میں کہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ لہٰذا ایک راستہ ہے سیاستِ ظلم کا اور ایک راستہ ہے سیاستِ مظلومیت کا جو پیغمبرؐ نے اختیار کیا وہی راستہ مولائے کائناتؑ کے حصہ میں آیا، وہی حصہ وراثت میں حسینؑ بن علیؑ کو ملا۔ مگر جہاں میں نے تذکرہ کیا تھا وہاں ایک لفظ کہتا ہوں۔ مکہ میں پیغمبرؐ آنا چاہتے ہیں اپنے اللہ کے گھر کا طواف کرنے کے لیے۔ کہا نہیں آپ نہیں آسکتے ہیں یعنی سب آسکتے ہیں کفار تو رہتے ہی ہیں۔ کفار و مشرکین تو مکہ میں رہتے ہی تھے ان پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہودی آئیں کوئی پابندی نہیں ہے۔ عیسائی آئیں کوئی پابندی نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے آئے کوئی پابندی نہیں ہے۔ مگر نبیؐ آئیں ہم ان کو نہ آنے دیں گے۔ یعنی یہ معاذ اللہ اس قابل نہیں ہیں کہ خانۂ خدا کا طواف کریں۔ اللہ کے گھر تک آئیں۔ باقی سب اس لائق ہیں۔ باقی سب اس قابل ہیں اور پیغمبرؐ خاموش ہیں یہ منظر دیکھ رہے ہیں اور واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔

کیوں؟ اس لیے کہ مشرکین کے ذہن میں ایک بات بیٹھی ہوئی ہے کہ مذاہب تو دنیا میں تین ہی ہیں۔ یا شرک ہے جو ہمارا مذہب ہے، یا یہودیت ہے جو یہودیوں کا مذہب ہے، یا عیسائیت ہے جو عیسائیوں کا مذہب ہے، یہ چوتھی آواز کہاں سے لے کر آ گئے۔ دیکھیے پیغمبرؐ جو بات کہہ رہے تھے وہ نہ وہ ہے جو کفار کہہ رہے تھے، نہ وہ ہے جو یہودی کہہ رہے تھے، نہ وہ ہے جو عیسائی کہہ رہے تھے۔ اسی بات سے تینوں ناراض تھے۔ نہ کفار خوش ہیں نہ یہودی خوش ہیں نہ عیسائی خوش ہیں۔ تینوں ناراض ہیں اس لیے کہ یہ چوتھی بات کہاں سے نکالی۔ یہ

"قولوا لا الٰہ الا اللہ" کیا ہے؟ یہ اپنے لیے رسالت کا دعویٰ کیسا ہے؟ رسول تو موسیٰ تھے۔ قصّہ ختم ہو گیا۔ یہ کون ہیں؟ رسول تو عیسیٰ تھے۔ بات تمام ہو گئی۔ یہ کون ہیں؟ خدا تو اتنے بہت سے ہیں یہ لا الٰہ الا اللہ کیا؟ تو چونکہ اس دور میں تین مذاہب رائج تھے اور پیغمبرؐ نے چوتھے مذہب کا اعلان کیا لہٰذا سب اس بات پر متحد ہیں کہ خبردار! یہ نہ آنے پائیں، ورنہ اگر یہ آ گئے تو چوتھا مذہب پیدا ہو جائے گا پھر روکنا مشکل ہو جائے گا۔

ارے اسلام کی تاریخ تو پڑھی ہے آپ نے۔ اور نہیں پڑھی ہے تو پھر سے جا کے غور کیجیے گا۔ ساری پریشانی کیا ہے اگر یہ آ گئے خانۂ خدا کا طواف کرنے کے لیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عقیدے والے بھی ایک مذہب رکھتے ہیں۔ اس عقیدے والے بھی ایک دین رکھتے ہیں۔ یہ لا الٰہ الا اللہ والے بھی کوئی چیز ہیں تو اگر یہ آ گئے تو یہودیت کو پریشانی ہے کہ ایک نیا مذہب آیا۔ عیسائیت کو پریشانی ہے کہ ایک نیا مذہب آیا۔ مشرکین کو پریشانی ہے کہ ایک نیا مذہب آیا تو ساری پریشانی یہ ہے کہ تین کے مقابلہ میں چوتھا مذہب نہ پیدا ہونے پائے۔ آپ چلے جائیے اگلے سال آیئے گا۔ اب بات سمجھے کہ پیغمبرؐ اتنی خاموشی سے کیوں چلے گئے؟ کوئی ڈر گئے تھے؟ کسی سے دب گئے تھے؟ مرعوب ہو گئے تھے؟ پیغمبرؐ نے کہا ایک سال بعد بھی جب مجھے آنے کی اجازت دو گے تو اجازت اس بات کا اقرار ہے کہ تم نے چوتھے مذہب کو مان لیا۔ تو یہ طریقہ پیغمبرؐ نے مسلمان کو سکھایا ہے کہ جب مذہب کی واقعیت کو منوانا ہو تو سیاستِ مظلومیت اختیار کرو۔ اگر مظلومیت کے راستہ پر چلے تو ایک نہ ایک دن مذہب بہرحال تسلیم ہو جائے گا۔

اب اس ذیل میں ایک جملہ۔ ایک لفظ کے معنی شاید میرے بچے نہ سمجھے ہوں فقط یہی نہیں ہے کہ اسلام چوتھا مذہب بن جائے گا۔ نہیں اس سیاست مظلومیت کا اثر تو آپ دیکھیں۔ یہی نہیں ہے کہ اگلے سال آپ آ جائیے گا آپ طواف کر لیں گے چلیے آپ بھی کچھ ہیں۔ ایک مذہب آپ کا بھی ہو گا۔ نہیں یہ مذہب اب جو سیاستِ مظلومیت کی بنیاد پر نکھر کے آیا تو ایسا آیا کہ وہ چوتھا مذہب نہیں بنا بلکہ جو پرانے والے ہیں وہ بھی آنے لگے تو اس منظر کو یاد رکھیے گا کہ جب نبیؐ نے مظلومیت کی سیاست کو اپنایا تو

میں سے ٹوٹ کے آئے۔ کچھ عیسائیوں میں سے ٹوٹ کے آئے۔ یعنی سیاست مظلومیت ہر جماعت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ طاقت پر، ہر فرقہ پر، ہر انسان پر سیاست مظلومیت اثر انداز ہوتی ہے لہٰذا اس کے بعد کی تاریخ پڑھیں تو کافر مسلمان ہوتے دکھائی دیں گے۔ یہودی اسلام لاتے دکھائی دیں گے۔ عیسائی کلمہ پڑھتے دکھائی دیں گے۔

حسینؑ نے کہا پہچانو، اگر میں نے نانا کے راستہ پر چل کر مظلومیت کی سیاست نہ اپنائی ہوتی تو نہ عیسائیت سے ٹوٹ کے وہب آتا، نہ باطل سے ٹوٹ کے زہیر آتے، نہ لشکر یزید سے ٹوٹ کے حُر آتا۔ یہ سیاست مظلومیت تھی کہ جس نے کل نانا کو کامیاب بنایا تھا اور آج نواسہ کو کامیاب بنایا ہے۔

اگر سیاست ظلم کامیاب تھی تو کوئی ایک چلا گیا ہوتا۔ کسی ایک پیاسے کو توڑ لیا ہوتا جو پیاس سے پریشان ہو کر چلا جاتا۔ جو بھوک سے پریشان ہو کر چلا جاتا۔ جو پریشانیوں میں مبتلا ہو کر چلا جاتا۔ مگر ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ سرداری چھوڑ کر غلام بننے آ رہا ہے۔ دریا چھوڑ کے پیاسا رہنے آ رہا ہے۔ آرام چھوڑ کر تکلیفیں سہنے آ رہا ہے۔ یعنی حسینؑ نے سیاست مظلومیت کو ذہنوں میں اتنا راسخ کر دیا کہ دنیا نے قدر مظلومیت کو پہچانا اور دنیا ظلم سے بیزار ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں چند دنوں میں اور چند لمحات میں فرزند رسولؐ ثقلین نے اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا کہ نہ دین سے ہاتھ جانے پائے، نہ مذہب کے خلاف کوئی کام ہونے پائے، نہ کوئی حرام نہ حلال ہونے پائے، نہ جھوٹ کا شائبہ آنے پائے، نہ کسی پر جھوٹا الزام لگنے پائے، نہ غلط پروپیگنڈہ ہونے پائے، کچھ نہ ہونے پائے اور اس کے بعد بھی مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ اب یہی جبر و تشدد اور مظلومیت کا لفظ گذارش کرتے ہوئے ایک آخری لفظ کہنا ہے اور بات کو آج یہیں پہ تمام کر دینا چاہتا ہوں۔

عزیزانِ محترم! اور شاید یہ ایک رُخ ہے تاریخ کا۔ میرے سُننے والے اور شاید میرے بچے اور نوجوان بہت سے متوجہ نہ ہوں تو اس مصلحت کو پہچانیں۔ سیاستِ ظلم میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ دو ملکوں میں جنگ ہو رہی ہے تو علاقہ پہ قبضہ ہو جائے۔ دنیا کا مزاج ہے سیاست ظلم کا۔ دنیا کا مزاج ہے سیاست جبر کا، سیاست اقتدار کا۔ لہٰذا جس کا اقتدار

زیادہ نمایاں ہوتا ہے وہی فاتح اور کامیاب کہا جاتا ہے۔ نعوذ باللہ خدا نکردہ ہمارے گھر کے آگے دس گز زمین ہماری ہے اور ہمارے مکان کے سامنے آپ کا مکان ہے دس گز زمین آپ کی ہے۔ بیچ میں روڈ ہے۔ اِدھر دس گز کے مالک ہم، اُدھر دس گز کے مالک آپ خدانکردہ کسی بات پر ہمارا آپ کا جھگڑا ہو گیا۔ ہم اپنے دروازہ کھڑے ہوئے لکچر دے رہے ہیں۔ آپ اپنے دروازہ کھڑے ہوئے تقریر کر رہے ہیں۔ جب تقریر میں زور اور جوش پیدا ہوا تو دو قدم ہم بڑھے، دو قدم آپ۔ اب تقریروں کا زور بھی بڑھتا جا رہا ہے اور مقررین کے قدم بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ دس گز کا فاصلہ ہمارا بھی ختم ہو گیا اور دس گز کی زمین آپ کی بھی ختم ہو گئی۔ اب دونوں اپنے اپنے بارڈر پر آگئے۔ دونوں اپنی اپنی سرحد پر آگئے۔ اب ہم اپنی آخری سرحد پر ہیں۔ آپ اپنی آخری سرحد پر ہیں۔ درمیان میں سرکاری سڑک ہے۔ اب ہم نے اپنا مزید جوش دکھلایا تو اپنی زمین سے آگے بڑھ کر سرکاری زمین پر آئے۔ آپ نے بھی کچھ زور دکھلایا تو آپ بھی آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اب دونوں اپنی اپنی جگہ پر زور لگائے ہوئے ہیں۔ اِدھر ہم بڑھ رہے ہیں اُدھر آپ بڑھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ مقابلہ اس منزل پر آگیا کہ ہم سرکاری روڈ کراس کر کے آپ کی دس گز زمین تک پہونچ گئے۔ اب جو تیسرا اُدھر سے گذرنے والا ہے اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں تو دیکھنے والا کیا کہے گا۔ کون طاقتور ہے۔ کس کو طاقتور کہے گا۔ آپ کو نہیں۔ طاقتور ہم کو کہا جائے گا۔ کامیاب ہم کو کہا جائے گا۔ کیوں؟

اس لیے کہ ہم آپ کے علاقہ میں آگئے۔ ہم آپ کی زمین پر آکے آپ سے لڑ رہے ہیں لہٰذا ہم طاقتور ہیں۔ اگر آپ طاقتور ہوتے تو آپ ہمارے علاقہ میں گھس آئے ہوتے۔ تو دنیا میں طاقت اور کامیابی کا فیصلہ یوں ہی ہوتا ہے کہ دیکھو لڑائی کس کی زمین پر ہو رہی ہے۔ اگر اُن کی زمین پر ہو رہی ہے تو یہ طاقتور ہیں، اور اگر اِن کی زمین پر ہو رہی ہے تو وہ طاقتور ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ جب مسئلہ سیاسی بن جاتا ہے تو قدریں ختم ہو جاتی ہیں۔ اب کوئی نہیں کہتا کہ لڑائی بھی، جنگ بھی مگر آپ نے ان کی زمین پر قدم رکھا کیسے؟ یعنی اگر جنگ درمیان میں نہ آئی ہوتی اور آپ آکے میری زمین پر کھڑے ہو جاتے اور میں کہتا

تو سب میرا ساتھ دیتے۔ لیکن اب جو لڑائی بیچ میں آگئی تو آپ میری زمین پر کھڑے ہوئے ہیں مگر کوئی کچھ نہیں بولتا۔ اس لیے کہ مزاج دنیا یہی ہے کہ جس کی زمین پر لڑائی شروع ہو جائے سمجھو وہ ہار گیا، سمجھو وہ کمزور پڑ گیا۔ اور جو دوسرے کے زمین میں آکے لڑے سمجھو وہی کامیاب ہے۔

یہ مزاج دنیا ہے۔

اب مزاج دین پہچانئے۔

جتنی لڑائیاں اسلام اور کفر میں ہوئی ہیں۔ بدر سے آخر تک جتنی لڑائیاں اسلام اور کفر میں ہوئی ہیں، ہر لڑائی میں کفر اسلام کے علاقہ میں زیادہ آیا ہے اور اسلام کفر کے علاقہ میں نہیں گیا ہے۔ بدر کا فاصلہ چھوڑیے مدینے سے مکہ سے۔ کتنی دور سے وہ آئے ہیں اور کتنی دور سے یہ گئے ہیں۔ بدر تو پھر ستر میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور آگے بڑھ جائیے اُحد کی لڑائی کہاں ہوئی ہے وہ تو مدینہ میں ہے، یعنی کفار وہاں سے نبیؐ کے گھر آگئے ہیں جب ہی تو خوش تھے کہ ہم جیت گئے۔ اور اُحد تو پھر مدینہ سے باہر ہے۔ خندق کی لڑائی کہاں ہوئی ہے وہ تو بالکل مدینہ کے اندر ہوئی ہے۔ کفار اس بات پر خوش ہیں کہ ہم ان کے علاقہ میں آگئے ہیں اور نبیؐ کبھی نہیں کہتے کہ اے مسلمانو! بڑی توہین ہو رہی ہے۔ بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ دیکھو بدر میں یہاں چلے آئے اب چلو جب لڑنا مرنا ہی ہے، جب جنگ ہی کرنا ہے تو کیوں انتظار کریں کہ وہ اُحد تک آئیں۔ کیوں انتظار کریں کہ وہ خندق تک آئیں۔ کیوں نہ چلیں ہم لوگ مکہ میں وہیں چل کر لڑیں۔ نہیں توجہ کی آپ نے میں نے کیا کہا؟

صورت حال یہ ہے کہ ہر مرتبہ وہ آتے ہیں ان کے یہاں۔ ہر مرتبہ وہ چلے آتے ہیں اور اسی بات پر اکڑے ہوئے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں کہ ہم ان کے علاقہ میں پہنچ گئے۔ یہ ہماری طاقت کی علامت ہے، یہ ہمارا زور ہے یہ ہماری قوت ہے۔ اور یہاں عالم یہ ہے کہ جب وہ آتے ہیں تو لڑتے ہیں اور جب یہ گئے مکہ تک، تو لوگ مشورہ دے رہے ہیں کہ حضورؐ لڑیئے۔ حضورؐ صلح نہ کیجیے۔ سرکار بڑی بدنامی ہو جائے گی۔ ارے ہم جیسے بہادر موجود ہیں لڑیئے۔

مگر پیغمبرؐ نے کہا اب نہ لڑیں گے۔ تو اسلام اور کفر کا مزاج پہچانا آپ نے؟۔ نہیں۔ پہچان لیجئے تو میں گذارش کروں تاکہ میری بات ضائع نہ ہو۔

اسلام اور کفر کا مزاج کیا ہے۔ کفر یہ چاہتا ہے کہ اسلام کی زمین پر جا کے لڑیں۔ اسلام کہتا ہے کہ ہم یہ بدنامی مول نہ لیں گے چاہے وہ خطہ ہمارا ہی کیوں نہ رہا ہو۔ لیکن اگر آج مکہ پر تمہارا قبضہ ہے تو وہاں جانا گوارا کریں گے مگر لڑنا گوارا نہ کریں گے۔ اس لیے کہ جب تم آؤ گے تو جارح تم کہے جاؤ گے اور اگر ہم آ کر لڑیں گے تو جارحیت کا الزام ہم پر آجائے گا۔ ہم اب برداشت کر سکتے ہیں جارح ہونا برداشت نہ کریں گے۔ تو نبیؐ کی سیاست یہ تھی کہ جو جنگ ہو اپنی زمین پر ہو تاکہ دشمن جارح کہا جائے، ہم پر جارحیت کا الزام نہ آئے۔ اس نکتہ کو نہ بھولے گا۔ ہمیشہ یاد رکھئے گا کہ دشمن ظالم کہا جائے مگر ہم پر جارحیت کا الزام نہ آنے پائے۔ اب پہچانئے کہ عالم غربت میں آکے حسینؑ نے کربلا کی زمین کیوں خریدی؟

اگر یہاں قتل ہو کر دفن بھی ہو جانا ہے تو تھوڑے سے آدمیوں کے دفن ہونے کے واسطے کتنی زمین چاہئے۔ یہ پورا علاقہ کیوں خریدا جا رہا ہے۔ یہ فرسخوں میں زمین کیوں لی جا رہی ہے۔ یہاں کوئی محل بننے والا ہے۔ یہاں کوئی قصر بننے والا ہے۔ کوئی دارالحکومت بننے والا ہے۔ آپ تو خود کہہ کر آئے ہیں کہ ہم قتل ہونے جا رہے ہیں۔ ہم راہِ خدا میں جان دینے جا رہے ہیں۔ تو یہ علاقہ کیوں خریدا گیا۔

حسینؑ نے کہا میں چاہتا ہوں کہ نانا کی سیاست کو زندہ کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ نانا کی سیاست کو دنیا کے سامنے پھر دُہرا دوں۔ کل نانا یہ چاہتے تھے کہ لڑائی ہو تو میری زمین پر ہو تاکہ ظالم وہ کہا جائے۔ میں نے یہ خطہ اسی لیے خریدا ہے تاکہ جو لڑائی ہو گی وہ اسی سرزمین پر ہو گی۔

اب کوئی نہ کہے گا کہ حسینؑ لڑنے آئے تھے۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ حسینؑ نے خروج کیا تھا۔ حسینؑ نے بغاوت کی تھی۔ اب تو اس سے جا کر کہو جو حسینؑ کی زمین پر آیا تھا ــ اگر ضمیر اسلامی میں ادنیٰ انصاف ہے تو جارح یزید کو کہا جائے گا، خارجی حسینؑ کو نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جس کو حسینؑ بن علیؑ نے محسوس کرایا کہ مجھ پر یہ الزام نہیں آسکتا۔ میں نے جو مظلومیت کا راستہ اختیار کیا ہے یہ راستہ مجھے کامیاب بھی بنائے گا اور یہی وہ راستہ ہے کہ جس کے بعد دنیا کو اندازہ ہو گا کہ بغیر گناہ کیے، بغیر جرم کیے، بغیر بُرائی کیے، بغیر جھوٹ بولے انسان اپنے مقصد میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے۔ اگر مقصد رضائے خدا ہے۔ اگر مقصد پاکیزہ ہے تو انسان پاکیزہ راہوں سے چلے گا۔ جس کی رضا کے لیے اٹھ

کامیاب بنائے گا۔ جس کی رضا کے لیے چلا ہے وہ اسے کامیابی سے ہمکنار کرے گا اسی لیے قدم قدم پر حسینؑ بن علیؑ کی کامیابی کو دیکھا گیا۔

بس آخری بات تذکرۂ مصائب کے ذیل میں۔ عزیزو! کتنا فرق تھا اس سیاستِ ظلم میں اور اس سیاستِ مظلومیت میں۔ پیسہ اُدھر دیا جارہا ہے، چلو لڑنے کے واسطے۔ لوگ تیار نہیں ہوتے۔ دباؤ ڈالا جارہا ہے چلو حسینؑ سے لڑنے کے واسطے۔ لوگ تیار نہیں ہوتے۔ حد یہ ہے کہ ملک رے کا پروانہ دے دیا گیا مگر ابن سعد کہتا ہے کہ ارے میں کیسے اپنے ہاتھوں کو خونِ حسینؑ سے رنگین کروں۔ وہ تو آخر وقت میں نفس غالب آگیا اور بالآخر تیار ہو گیا۔ مگر اتنا بڑا ملک رے کا پروانہ ملنے کے بعد بھی ابن سعد گھبرا رہا ہے حسینؑ سے لڑنے کے لیے، حاکم وقت کا ساتھ دینے کے لیے اور اسی کے برخلاف ہر طرف ناکہ بندی ہو گئی۔ راستے روک دیے گئے۔ کوئی جائے گا تو زندہ نہیں جاسکتا۔ کوئی حسینؑ کی مدد کے لیے اٹھے گا تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر اس کے بعد بھی بے قراری کا عالم یہ ہے کہ کسی صورت سے حسینؑ تک پہنچ جائیں۔ کسی طرح حسینؑ کے قدموں میں آجائیں۔ فرق پہچانا کہ ظلم طاقتوں سے کھینچ رہا ہے مگر لوگ جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مظلومیت کی راہ پر پابندیاں عائد کی جارہی ہیں، راستے روکے جارہے ہیں مگر جانے والے بے چین ہیں اور بے چینی کا عالم کیا ہے کہ اگر تنہا حبیبؓ ہی بے قرار ہوتے، اگر فقط حبیبؓ ہی حسینؑ تک پہنچنے کے لیے بے چین ہوتے تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی اس لیے کہ حبیبؓ حسینؑ کے بچپن کے جاں نثار تھے اور اسی لیے حبیبؓ کو یہ سند ملی کہ میں حبیبؓ سے دوہری محبت کرتا ہوں۔ ایک محبت کا راز یہ بھی ہے کہ یہ میرے لال حسینؑ سے محبت کرتا ہے اور بچپنے میں حسینؑ کے حبیبؓ کا یہ عالم تھا کہ حسینؑ آگے آگے چلتے تھے تو حبیبؓ پیچھے پیچھے چلتے تھے اور حسینؑ کے قدموں کی خاک اٹھا کے اپنی آنکھوں سے لگاتے تھے۔ تو حسینؑ کو پہچانا ہے۔ جو حسینؑ کی قدر پہچانتا ہو وہ اگر حسینؑ پر جان دینے کے لیے تیار ہو جائے، وہ اس راہ میں مرنے کے لیے تیار ہو جائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے اور پھر حبیبؓ کو تو حسینؑ نے بلایا بھی تھا۔ اے عزیزو! حبیبؓ کا مرتبہ اس ایک لفظ سے پہچانو کہ وہ بے نیاز حسینؑ جو عاشور کی رات کہتا ہے کہ جانا ہو تو چلے جاؤ، وہ بھی اگر کسی کو بلاتا ہے تو وہ الحسینؑ

بن علی الی الرجل الفقیہ حبیب بن مظاہر الاسدی" یہ خط حسینؑ بن علیؑ کا ہے ایک مرد فقیہ عالم دین حبیبؑ بن مظاہر کے نام۔ اے حبیبؑ! تم تو جانتے ہو کہ پیغمبرؐ سے ہماری قرابت کیا ہے۔ اے حبیبؑ! ہم زغۂ اعدار میں گھر گئے ہیں، اگر ممکن ہو تو ہماری مدد کے لیے آؤ۔ خط کو پڑھنا تھا کہ حبیبؑ بے چین ہو گئے۔ زوجہ نے پوچھا کس کا خط ہے؟ کہا نبیؐ کے نواسے زہراؑ کے لال کا خط ہے۔ کہا کیا لکھا ہے؟ کہا مولاؑ نے لکھا ہے کہ ہم زغۂ اعدار میں گھر چلے ہیں اگر ممکن ہو تو ہماری مدد کے لیے آؤ۔

پھر حبیبؑ تم نے کیا فیصلہ کیا، کیا ارادہ ہے؟

کہا زمانہ بڑا پر آشوب ہے۔ حالات بہت خراب ہیں ایسے میں انسان کیسے جلے گا، ایسے میں انسان کیسے مصائب کا سامنا کرے گا۔

بس یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ زوجہ کو جلال آگیا۔ کہا حبیبؑ، نبیؐ کا لال بلائے اور تم زمانے کے حالات دیکھو۔

کہا، نہیں مومنہ یہ خیال ہے کہ میں چلا جاؤں گا تو تجھے چھوڑ کر جانا ہوگا۔

کہا، حبیبؑ تمھیں میرا خیال ہے، زہراؑ کا خیال نہیں ہے۔ فرزند زہراؑ مصائب میں گھر گیا ہے، نبیؐ کا لال مصیبتوں میں مبتلا ہے وہ تمھیں بلائے اور تمھیں اس بات کا خیال ہے کہ میرا کیا ہوگا۔ اگر تم نہیں جانا چاہتے ہو تو گھر میں بیٹھو میں جا رہی ہوں نبیؐ کے لال کی مدد کے لیے۔

حبیبؑ نے کہا مومنہ! یہ کیا کہہ رہی ہے، میں تو چاہتا تھا کہ تیرا کمال ایمان بھی واضح ہو جائے۔ ورنہ میرا مولا بُلائے اور میں نہ جاؤں۔ میرا آقا بلائے اور میں نہ جاؤں؟

عزیزو! چار پانچ منٹ کے اندر مجلس تمام اور انشاء اللہ آپ بہت خشاب ہوں گے۔

عجیب غربت کا عالم ہے۔ حبیبؑ نے غلام کو بُلایا اور کہا، اے غلام یہ میرا راہوار ہے، اسے لے کر جا اور فلاں مقام پر میرا انتظار کرنا۔ زمانہ پُر آشوب ہے۔ میں کسی نہ کسی صورت میں وہاں پہنچ جاؤں گا اور اس کے بعد اس گھوڑے پر سوار ہو کر جاؤں گا اپنے مولا کی مدد کے واسطے۔ غلام اس جگہ پر کھڑا راہوار کو لیے ہوئے حبیبؑ کا انتظار کر رہا تھا۔ حبیب مختلف راہوں سے

علی اللہ) خدا آپ کو کسی غم میں نہ رُلائے سوائے غمِ آلِ محمدؐ کے۔ اور غمِ آلِ محمدؐ کے علاوہ کون سا غم اس قابل ہے کہ جس پر چودہ صدیوں تک آنسو بہائے جائیں۔ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور غلام بے چین ہو کر کہتا ہے۔ اے اسپ باوفا! اگر میرا مالک کسی وجہ سے نہ بھی آسکا تو میں تیری پشت پر سوار ہو کر چلوں گا فرزندِ رسولؐ کی مدد کے واسطے۔ بس یہ سُننا تھا کہ بے چین ہو کر رُخ کیا اے میرے مولاؑ۔ اے نبیؐ کے لال! آپ پر یہ وقت پڑ گیا ہے کہ غلام جان قربان کرنا چاہتے ہیں اور جانور آنسو بہا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر حبیبؓ آگے بڑھے، گھوڑے پر سوار ہوئے، مُڑ کے غلام کو دیکھا کہا تو نے میرا بڑا ساتھ دیا ہے اور بڑی خدمت کی ہے۔ جا میں نے تجھے راہِ خدا میں آزاد کر دیا۔ بس یہ سُننا تھا کہ غلام نے قدم پکڑ لیے حبیبؓ! آپ نے یہی انصاف کیا ہے۔ جب تک آپ کی خدمت کا معاملہ تھا آپ نے اپنے ساتھ رکھا، اب جب زہرؑا کے لال کی خدمت کا موقع آیا ہے تو مجھے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا مولاؑ کی خدمت میں۔ جب وقت آئے گا تو مولاؑ پر قربان ہو جاؤں گا۔

تو عزیزو! حبیبؓ چلے اُدھر حسینؑ اپنے چاہنے والوں کے درمیان رایات لشکر پرچم ہائے لشکر تقسیم کر رہے ہیں۔ جب ایک پرچم باقی رہ گیا تو کسی نے کہا مولا یہ کسے ملے گا؟ کہا انتظار کرو جو اس کا حقدار ہے وہ آنے والا ہے۔ تھوڑی دیر جو گذری تو ایک گرد نمودار ہوئی۔ فرزندِ رسولؐ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ اے میرے چاہنے والو بڑھو، میرا بچپن کا جاں نثار آرہا ہے۔ بڑھو حبیبؓ کا استقبال کرو۔ چاہنے والے آگے بڑھے، حبیبؓ کا استقبال کیا۔ حبیبؓ مولاؑ کے قدموں تک آگئے۔ اصحاب میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور شدہ شدہ یہ خبر خیمہ گاہ میں پہنچی۔ ایک مرتبہ شہزادی زینبؑ نے کہا فضہ! جب سے ہم عالمِ غربت میں آئے ہیں ایک ہی خبر سُننے میں آتی ہے کہ لشکر آرہا ہے، فوج آرہی ہے، بھیا کے خون کے پیاسے آرہے ہیں، دشمنوں کے رسالوں پر رسالے آرہے ہیں۔ اے فضہ جاؤ دریافت کرو کہ اب کون آیا ہے؟ فضہ پلٹ کے آئیں۔ کہا بی بی مبارک ہو مولاؑ کے بچپن کا جاں نثار حبیبؓ آیا ہے۔ یہ سُننا تھا کہ شہزادی نے فرمایا اے فضہ جاؤ جا کے حبیبؓ سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا حبیبؓ تم نے بڑا احسان کیا جو ایسے وقت میں میرے بھیا کی مدد کے لیے آگئے۔ مقتل کا فقرہ ہے کہ فضہ نے سلام پہنچایا حبیبؓ زمین پر بیٹھ گئے، خاک کربلا

کو اُٹھا کے سر پر رکھنا شروع کیا۔ ارے یہ وقت آگیا ہے کہ شہزادیاں غلاموں کو سلام کہلا بھیجیں، یہ وقت آگیا ہے کہ شہزادیاں غلاموں سے کہیں کہ تم نے بڑا احسان کیا ہے جو میرے بھیا کی مدد کے لیے آگئے ہو۔ حبیبؓ بے چین ہیں کہ وہ وقت آئے کہ مولاؑ پر قربان ہو جائیں۔ واقعات آپ کے سامنے برابر آتے رہتے ہیں مگر اس واقعہ کا ایک آخری پہلو جو شاید کم سُننے میں آیا ہو گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو آپ نے بہن اور بھائی کا رشتہ دیکھا کہ جب بھائی کا مددگار آگیا تو بہن کا عالم کیا تھا۔ اب ذرا عابدؑ بیمار کی مصیبت کو دیکھئے۔ عابدؑ بیمار کی بیکسی کو دیکھیں حبیبؓ ابن مظاہر حسینؑ پر قربان ہو گئے۔ حبیبؓ کا سر قلم ہو گیا۔ شہادت امام حسینؑ کے بعد جب اہلِ حرم کو قیدی بنایا گیا اور اس لُٹے ہوئے قافلہ کو کوفہ کی طرف لے کر چلے تو آگے آگے شہیدوں کے سر جا رہے ہیں اور پیچھے پیچھے لٹا ہوا قافلہ آ رہا ہے۔ جب یہ قافلہ کوفہ میں داخل ہوا تو حبیبؓ کا ایک بیٹا جس کا نام تھا قاسم۔ اسے معلوم ہوا کہ کربلا میں مولاؑ مارے گئے اور ان کے اہلِ حرم قیدی بنا کے لائے جا رہے ہیں، آیا اور آ کے سر راہ کھڑا ہو گیا۔ ذرا پتہ لگائیں میرے بابا کا کیا ہوا۔ پتہ لگائیں کہ کربلا میں کتنا بڑا ظلم ہو گیا۔ کس کو کس کو مار ڈالا گیا۔ کس کو کس کو ذبح کر دیا گیا۔ وہ سر راہ کھڑا ہوا تھا کہ دیکھا ایک سوار آ رہا ہے اور اس کے گھوڑے کی گردن میں ایک کٹا سر ہے آگے بڑھا۔ اے سوار! یہ کس کا سر ہے؟ کہا تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ کہا یہ سر تو میرے بابا حبیبؓ سے ملتا ہوا ہے۔ کہا ہاں یہ حبیبؓ کا سر ہے۔ یہ سُننا تھا کہ بچہ آگے بڑھا، بڑھ کے حملہ کیا۔ ارے میں برداشت نہ کرسکوں گا کہ قاتل کے ہاتھ میں باپ کا سر دیکھوں مگر میرا بیمار امام کربلا سے شام تک۔ نوکِ نیزہ پر باپ کا سر اور پیچھے پیچھے بیمار امام۔ اے بابا آپ کا سر آگے آگے اور میں اس قافلہ کا قافلہ سالار۔ اس شان سے شام تک آیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

مجلس نمبر ۶

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَآءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَ خَاتَمِ النَّبِيّٖنَ مَوْلَانَا اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى اَعْدَآئِهِمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفسِ مطمئن! پلٹ آ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

سورۂ مبارکہ فجر کی ان آخری آیات کریمہ کے ذیل میں "کربلا شناسی" کے عنوان سے جو سلسلہ معروضات آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا آج اس کے چھٹے مرحلہ پر "اسباب عظمت قیام حسینؑ" کے عنوان سے اپنے معروضات کو پیش کرنا ہے۔

یہ ایک مسئلہ جو کسی دور میں زیر بحث نہیں تھا لیکن آج بیسویں صدی کے اطراف میں قابل بحث بنا دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کی کون سی اتنی بڑی خصوصیت اور عظمت تھی کہ اس کی یاد ساری دنیا میں سیکڑوں سال سے منائی جا رہی ہے جب کہ تاریخ اسلام میں اور نہ جانے کتنے بہت سے افراد ہیں یا کتنی بڑی شخصیتیں ہیں جنھوں نے قربانیاں پیش کی ہیں یا وہ راہِ خدا میں قتل کیے گئے ہیں یا دشمنانِ دین نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ کیوں ان کی یاد نہیں منائی جاتی ہے، کیوں ان کا تذکرہ اس عظمت اور اہمیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا ہے۔ واقعۂ کربلا میں کون سی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کی بنیاد پر اس واقعہ کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔

میں گفتگو کو غیر سنجیدہ نہیں بنانا چاہتا ورنہ یہ بات کہنا بہت آسان تھا کہ ہم واقعۂ کربلا اور امام حسینؑ کی عظمت اور حیثیت سے باخبر ہیں۔ لہٰذا ہم صدیوں سے اس کی یاد منا رہے

ہیں۔ آپ جن کا حوالہ دینا چاہتے ہیں شاید ہم ان کی اہمیت سے باخبر نہیں ہیں۔ تو اگر آپ سیکڑوں سال سے باخبر ہیں تو آپ ہی نے ان کی یاد کو باقی رکھا ہوتا۔ آپ ہی نے ان کے تذکروں کو زندہ رکھا ہوتا۔

مگر جس میں زندگی کے امکانات ہوتے ہیں اسے زندہ رکھا جاتا ہے۔ مُردہ کو کوئی زندہ نہیں بنا سکتا ہے اور اس مقام پر یہ بھی گذارش کرنا ضروری ہے کہ شاید ایسے افراد کو غلط فہمی ہو گئی ہے اور واقعہ کی صحیح بنیادوں سے باخبر ہی نہیں ہیں لہٰذا میں گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ کو دھوکہ ہو گیا ہے۔ آپ کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ہم سیکڑوں سال سے واقعۂ کربلا کو زندہ کر رکھا ہے۔ ہم نے یادِ حسینؑ کو زندہ بنا رکھا ہے۔ ہم واضح لفظوں میں آپ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے واقعۂ کربلا کو زندہ نہیں بنا رکھا ہے، واقعۂ کربلا نے ہم کو زندہ بنا رکھا ہے۔ ہم نے یادِ حسینؑ کو باقی نہیں رکھا ہے، یادِ حسینؑ نے ہم کو باقی رکھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن کے حصہ میں کربلا نہیں آئی تھی وہ مٹ گئے، فنا ہو گئے اور اگر بظاہر فنا نہیں ہو گئے تو انھیں بھی اپنی اوقات کا اندازہ ہے اور حسینؑ اور ذکرِ حسینؑ کرنے والوں کی عظمت کا ساری دنیا کو احساس ہے اور احساس نہ ہوتا تو اعتراضات کی پریشانی ہی نہ پیدا ہوتی، اشکالات کا تصور بھی نہ پیدا ہوتا۔

لیکن ان تمام مسائل سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنے موضوع کے بارے میں جو چند باتیں گذارش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہیں کہ کسی مورد پر، کسی موقع پر، کسی مقام پر اقدام کرنا، قیام کرنا، کھڑا ہو جانا، اُٹھ جانا یہ کوئی ہنر نہیں ہے، کوئی کمال نہیں ہے۔ خود قیام بھی اہمیت پیدا کرتا ہے اپنے خصوصیات، اپنے حالات اور اپنے ماحول کے اعتبار سے۔

ساری باتوں کے لیے شاید وقت کافی نہ ہوگا لہٰذا میں صرف چند باتیں گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی بھی واقعہ پانچ اسباب سے اہمیت پیدا کرتا ہے اور اس کی عظمت کے یہی راز ہوتے ہیں۔

پہلا راز یہ ہے کہ خود قیام کرنے والے کی حیثیت کیا ہے۔

مثال کے طور پر اگر میں اس وقت تحریک کروں کہ حضرات میں ایک مسجد بنانا چاہتا ہوں اور آپ ہی حضرات کے تعاون سے یہ مسجد بن سکتی ہے۔ اگر آپ لوگ ذرا میرا ساتھ دے دیں تو کل ہی سنگ بنیاد رکھ دوں اور چار دن کے اندر عمارت تیار ہو جائے۔ ایک مفلس آدمی جو خود اپنی نوکری کے لیے پریشان ہے، پھٹے کپڑے سمیت اُٹھ کر کھڑا ہوا، کہنے لگا گھبرایئے گا نہیں۔ بس انشاء اللہ سمجھے بن گئی۔ تو کیا اس کے کہنے سے میں واقعاً مطمئن ہو گیا کہ واقعاً بن گئی جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ پیسہ والے سب سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ یہ بیچارہ مفلس جس کو صحیح و سالم کرتہ بھی نصیب نہیں ہے پھٹے کپڑے پہن کے آیا ہے اس نے وعدہ کر لیا اور میں مطمئن ہو گیا کہ کام ہو جائے گا۔ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس بھرے مجمع میں جو اُٹھا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ کام پیسہ کا ہے وہ نادار ہے۔ یہ کام دولت کا ہے وہ مفلس ہے۔ یہ کام جیب سے کچھ نکالنے کا ہے اس کے جیب میں کچھ نہیں ہے۔ تو ایسا آدمی اگر قیام کرے تو اس کے قیام کی کوئی اہمیت نہیں ہے، چاہے بعد میں وہ کچھ کر ہی گذرے۔ لیکن کسی کی نگاہ میں اس کے اُٹھنے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے لیکن ایک ایسا آدمی جس کو لوگ پہچانتے ہیں کروڑپتی ہے، وہ بغیر کھڑے ہوئے یوں ہی بیٹھے بیٹھے کہہ دے کہ مولانا تحریک کرنے کا کیا کام ہے، آپ نے پہلے مجھ سے بتا دیا ہوتا۔ اتنے بڑے مجمع میں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تنہا مجھ سے بتا دیا ہوتا اب تک مسجد بن کر تیار ہو گئی ہوتی۔ بس اس ایک آدمی کا بیٹھے بیٹھے یہ کہہ دینا اتنا وزن رکھتا ہے جتنا کھڑے ہو کر اس آدمی کے اعلان میں وزن نہیں ہے اس لیے کہ فرق شخصیتوں کا ہوتا ہے۔ یہ اُٹھنے والا کوئی شخصیت نہیں رکھتا ہے۔ وہ اُٹھنے والا شخصیت رکھتا ہے۔ تو جتنی شخصیت میں اہمیت ہوگی، جتنا وزن ہوگا اسی اعتبار سے وہ قیام اہم ہوگا۔ اگر نادار اُٹھ کر دولت کا وعدہ کرے تو ہر آدمی شکر کے رہ جائے گا اور مجھے بھی اعتبار نہیں پیدا ہوگا۔ اب میں نہیں جانتا کہ سرکار دو عالم کیا دیکھ رہے تھے کہ اتنے بڑے مشن کے لیے مددگار مانگ رہے ہیں اور کھڑا ہوا ایک کمسن بچہ، جیب میں پیسہ نہیں۔ بظاہر بازوؤں میں طاقت نہیں، پیچھے کوئی لشکر نہیں، ساتھ کوئی فوج نہیں۔ کوئی ایسی طاقت نظر نہیں آتی۔ اس نے وعدہ کر لیا تو نبی مطمئن ہو گئے۔ اس نے نصرت کی

بات کہی اور پیغمبرؐ مطمئن ہو گئے۔

کیوں مطمئن ہو گئے؟ یہ تو نبیؐ جانتے ہوں گے اور نبی تو خیر سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ ماضی بھی جانتے ہیں، حال بھی جانتے ہیں، مستقبل بھی جانتے ہیں۔ حیرت اس قوم پر ہے جو چالیس سالہ پیغمبرؐ کا اعلان سُن کر دیوانہ کہہ رہی تھی وہ گیارہ سالہ بچّے کے دعوۂ نصرت پر کچھ نہ کہے۔ اگر ان کی بات کو جنون کہا گیا تھا تو کم سے کم اس کی بات کو بچپنا تو کہا گیا ہوتا۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کے چہرہ میں جو دیکھا ہو وہ نبیؐ جانتے ہیں۔ قوم نے اتنا جلال ضرور دیکھا ہے کہ کسی میں بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

تو قیام کی ایک اہمیت شخصیت کے اعتبار سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اگر آپ قیامِ حسینی کی عظمت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو حسینؑ کی شخصیت کے بارے میں جتنی باتیں میں نے روزِ اول گزارش کی ہیں ان کے علاوہ آپ حدیث کی صحیح کتابیں بھی پڑھیں۔ سرکارِ دو عالم کا یہ ارشادِ گرامی سارا عالم اسلام جانتا ہے "حُسَیْنٌ مِنِّی وَ اَنَا مِنْ حُسَیْنٍ" حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ حسینؑ مجھ سے ہے یہی حسینؑ کے لیے کیا کم ہے، یہی عظمتِ حسینؑ کے لیے کیا کم ہے چہ جائیکہ میں حسینؑ سے ہوں۔ اتنی بڑی عظمت والا انسان جب اُٹھ کر کھڑا ہو جائے گا تو وہ قیام خود بخود اہمیت پیدا کر لے گا۔

میں اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں تاکہ میرے تمام سُننے والے بات کو پہچان سکیں۔ ساری اُمّت، ساری قوم، سارے مسلمان چودہ صدیوں سے ایک ہی آرزو، ایک ہی خواہش، ایک ہی تمنا رکھتے ہیں کہ کسی صورت سے ہم سرکارؐ کی طرف منسوب ہو جائیں۔ یعنی ہم نہ کہیں ہم ان کے ہیں وہ کہہ دیں یہ ہمارا ہے۔ وہ اپنا بنا لیں۔ اسی کام کے لیے مسلمان رہتا ہے۔ یہ ایمان کاہے کے لیے ہے، یہ قرآن کس کام کے لیے ہے، یہ عبادتیں کیوں ہوتی ہیں۔ یہ شریعت کے احکام پر عمل کیوں ہو رہا ہے۔ اتنی جانفشانیاں، اتنی مصیبتیں مسلمان کیوں برداشت کر رہا ہے۔ فقط اس لیے کہ اگر دنیا میں ہیں تو دنیا میں ورنہ آخرت میں حضورؐ یہ کہہ دیں کہ یہ میرا ہے۔ یہ مسلمان ہے۔ یہ ہمارا ہے یعنی سارے مسلمانوں کی فکر کی انتہا یہ ہے کہ نبیؐ اسے اپنا کہہ دیں۔ مسلمان کی معراجِ کمال یہ ہے کہ حضورؐ یہ کہہ دیں کہ یہ میرا ہے۔ یہ مجھ سے متعلق

ہے کہ نبی اسے اپنا بنالیں تو پھر اس کے کمال کو پہچانو جس کے لیے نبی یہ نہیں کہتے کہ یہ میرا ہے، یہ کہتے ہیں میں اس سے ہوں تو سارا عالم اسلام ایک طرف ہوگا اور تنہا حسینؑ بن علیؑ ایک طرف ہوں گے۔

یہ پہلا مسئلہ ہے قیام کی عظمت کے لیے شخصیت۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قیام کرنے والے کی ہمت بھی قیام میں زور پیدا کر دیتی ہے۔ اس کا ایمان، اس کا کردار بھی اہمیت پیدا کر دیتا ہے ورنہ میں نے تحریک تو کر دی اور جہاں چار پریشانیاں دکھائی دیں میں پیچھے ہٹ گیا۔ تو اس قیام میں کوئی وزن نہیں ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ ہر آدمی یہ کہے گا کہ اس سے بہتر یہ تھا کہ آپ نے یہ کام شروع ہی نہ کیا ہوتا پہلے سمجھ لیا ہوتا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ کیا سمجھتے تھے کہ خیبر میں جاؤ گے تو مرحب حلوہ کھلائے گا؟ ارے بھئی قیام کرنے سے پہلے ہر آدمی کو سوچ لینا چاہیئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اگر سمجھتا ہے کہ میں انجام کو فیس (FACE) کرسکتا ہوں، مقابلہ کرسکتا ہوں تو اٹھے۔ اگر جانتا ہے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں ہے تو بیٹھا ہی رہ جائے۔ بلکہ بیٹھا رہ جائے تو اس میں عزت رہ جاتی ہے۔ سمجھ دار تھے وہ لوگ جنھوں نے خندق میں سر بھی نہ اُٹھایا کہ بلا سے ٹل گئی۔

نادانی کر بیٹھے خیبر میں کہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے کہ حضورؐ نے بھی دیکھا اور ساری تاریخ نے بھی دیکھا۔ تو جس نے جس نے دیکھ لیا وہ سب پوچھ رہے ہیں کہ انجام کیا ہوا سر جھکا رہ جاتا تو بات دبی رہ جاتی۔ مگر جو اُٹھ گیا ہے تو اب بات بھی اُٹھ گئی ہے۔ اب ہر ایک کو پوچھنے کا حق ہے کہ اگر آپ کو اندازہ تھا کہ یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے تو آپ نے قیام نہ کیا ہوتا۔

تو عزیزو! قیام بے وزن ہو جاتا ہے، بے قیمت ہو جاتا ہے اگر قیام کرنے والے میں اطمینان نہ ہو، سکون نہ ہو، ایمان نہ ہو، اعتماد نہ ہو، ہمت نہ ہو، طاقت نہ ہو، شجاعت نہ ہو، لیکن اگر قیام کرنے والا اتنا گہرا ایمان رکھتا ہو کہ دنیا ایک طرف ہو وہ اکیلا رہ جائے۔ اتنی طاقت رکھتا ہو کہ ساری دنیا مقابلہ پر آجائے تو کوئی پریشانی نہ پیدا ہو تو وہ قیام اہمیت پیدا کر لیتا ہے۔

واضح لفظوں میں کہوں۔ ذمہ داری سنبھالنے والے کو اگر خود ہی شک ہو جائے تو بات بے وزن ہو جاتی ہے۔ میدان میں جانے والا اگر خود ہی میدان چھوڑ کر چلا آئے تو میدان میں جانے کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ہے۔ لیکن اُٹھنے والا اگر ایسا ایمان رکھتا ہو جو سرکارِ دو عالمؐ کا ایمان تھا کہ جب سرکارؐ اٹھے تو جس ماحول میں اُٹھے اتنا بدتر ماحول کہ کوئی اس قیام کا قدردان نہیں تھا۔ کوئی تعریف کرنے والا نہیں تھا۔ حد یہ ہے کہ جن کو کھلایا وہ بھی جادوگر کہہ رہے ہیں۔ تو کیا حضورؐ کو نہیں معلوم تھا کہ میں ان کو کھلا رہا ہوں یہ جادوگر کہیں گے۔ اور معاذ اللہ اگر پہلے دن نہیں معلوم تھا تو اب تو کہہ چکے، اب تو آپ نے سُن لیا کہ یہ جادوگر کہتے ہیں اب تو انھیں نہ بلائیے۔ مگر دوسرے دن پھر دعوت، پھر بُلا لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبیؐ جانتے ہیں کہ ہمیں جادوگر کہا جائے گا مگر اس کے بعد بھی اٹھنا ہے۔ حضورؐ جانتے ہیں کہ دیوانہ کہا جائے گا مگر اس کے بعد بھی اٹھنا ہے۔ تو کیوں اٹھے ہیں؟ یہ میں آخر کلام میں گذارش کروں گا لیکن اتنا اعتماد کہ سب دیوانہ کہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ عقلِ کل میں ہوں۔ اتنا اعتماد، اتنا بھروسہ کہ دنیا مخالف ہو جائے مگر کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبیؐ نے جب اپنی ہمت اور طاقت کا اعلان کیا اور یہ پیغام آیا کہ آپ اس تبلیغ کو چھوڑ دیں، اس دعوت سے دست بردار ہو جائیں تو فرمایا کہ "لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ عَلٰی يَمِيْنِي وَالْقَمَرَ عَلٰی يَسَارِي" اگر میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب رکھ دیا جائے اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب رکھ دیا جائے کہ میں اس دعوت کو چھوڑ دوں تو میں اس دعوت کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ یعنی زمین والوں کا کیا ذکر ہے یہ بیچارے نادان جاہل مشرک ہیں ان کی کیا قیمت ہے۔ اگر آسمان کا سورج، آسمان کا چاند وہاں سے اُتار کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا جائے تو میں اپنا کام چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ میری ہمت تو دیکھو، میری طاقت تو دیکھو کہ میں اتنا بھروسہ رکھتا ہوں پروردگارِ عالم کی کمک پر کہ زمین و آسمان ہر ایک کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکتا ہوں۔ نہ چاند کی کوئی حیثیت ہے نہ سورج کی کوئی حیثیت ہے۔ اور جب ذکر آیا ہے تو ایک جملہ یاد رکھیے گا۔ سرکارِ دو عالم! یہ کہیے کہ سارے عرب اگر مقابلہ پر آجائیں

کہ کفار، مشرکین، یہود، نصاریٰ اگر سب متحد ہو جائیں تو بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ آسمانوں کی باتیں نہ کریں۔ اگر چاند، سورج کا ذکر شروع کر دیں گے تو لوگ کہیں گے کہ اچھے خاصے پیغمبر تھے یہ تو شاعر ہو گئے ہیں۔ آپ کی گفتگو پر شاعری کا الزام لگ جائے گا۔ اس لیے کہ وہ شاعر ہی ہوتے ہیں جو زمین کے محبوب کو آسمان کا چاند کہتے ہیں۔ جو زمین کی روشنی کو آفتاب کی روشنی قرار دیتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی گفتگو پر بھی شاعری کا اور بے بنیاد ہونے کا الزام آجائے۔

پیغمبرؐ نے کہا مجھے اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ یہ مستقبل نہیں جانتے ہیں تو دیوانہ کہہ رہے ہیں۔ کل انھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ یہ مستقبل نہیں جانتے ہیں تو شاید میری گفتگو کو شاعری کہہ دیں، لیکن جب مستقبل دیکھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ چاند سورج سے میں کیا ڈرتا۔ چاند میرے سامنے آجائے تو میں ٹکڑے کر دوں گا۔ سورج میرے وصی کے سامنے آجائے تو مغرب سے ابھارے گا۔

لہٰذا یہ کوئی شاعرانہ گفتگو نہیں ہے۔ یہ حقائق ہیں جن کا میں اعلان کر رہا ہوں جن کی طرف میں دنیا کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ تو یہ میرا ایمان ہے۔ یہ میرا کردار ہے۔ یہ میرا اعتماد ہے، یہ میری طاقت اور ہمت ہے۔ جس بنیاد پر تم نے میرے قیام کی اہمیت کو دیکھا ہے اور نتائج ابھی آپ کے سامنے آئیں گے۔

تو شخصیت کیا ہے یہ دیکھنا ہوگا۔ اس شخصیت کے پاس کتنی طاقت ہے، کتنی ہمت ہے، کتنا حوصلہ ہے، کتنا ایمان ہے، کیا کردار ہے یہ بھی دیکھنا ہوگا۔

تیسرا مسئلہ، قیام اور اقدام اہمیت پیدا کرتا ہے حالات کے اعتبار سے۔ رات کے وقت اپنے کمرہ میں اے۔ سی (A.C.) چلا کے، بہترین مصلیٰ بچھا کے دو رکعت نماز پڑھ لی آپ نے۔ یہ بھی نماز ہے، عبادتِ الٰہی ہے۔ اس پر بھی انشاء اللہ اجر ملے گا۔ ثواب ملے گا اور بہت ملے گا۔ خدا کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اجر بے حساب ملے گا۔

لیکن اسی کے برخلاف آپ ظہر کے ہنگام اس میدان میں کھڑے ہو جائیے اور یہاں کھڑے ہو کر ساڑھے بارہ بجے دوپہر میں دو رکعت نماز پڑھئے تو ان دونوں نمازوں میں کوئی

فرق ہے یا نہیں ؟ بند کمرے کی اے۔ سی (A.C.) میں قالین پر نماز اور ہے اور اس زمین پر دوپہر کے وقت جب آفتاب نصف النہار کی منزل سے گذر رہا ہے اس وقت دو رکعت نماز پڑھنا اور ہے۔

اس نماز کو کس نے اہم بنایا ہے ؟ حالات ہی نے تو اہم بنایا ہے۔ تو وہ بھی ایک قیام نماز ہے جو گھر میں تھا۔ یہ بھی ایک قیام نماز ہے جو آفتاب میں ہو رہا ہے۔ مگر دونوں قیام میں فرق یہ پیدا ہو گیا ہے کہ اُس کے حالات سازگار تھے تو اہمیت گھٹ گئی ہے، اِس کے حالات ناسازگار ہیں تو اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اسی لیے جب اسلام نے لفظوں کو جہاد قرار دیا تو اعلان کیا "اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ" سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ کلمۂ حق کہا جائے لیکن دوستوں کے مجمع میں نہیں، چاہنے والوں کے درمیان نہیں، مخلصوں کے بیچ میں نہیں، ناداروں کے درمیان نہیں، کمزوروں کے درمیان نہیں، بادشاہ جائر و جابر و ظالم کے سامنے اگر کلمۂ حق کہا جائے تو یہ کلمۂ حق جہاد بنے گا۔

توجہ کی آپ نے ؟ کلمۂ حق خطابت بھی بنتا ہے، کلمۂ حق تقریر بھی بنتا ہے، کلمۂ حق گفتگو بھی بنتا ہے اور کلمۂ حق جہاد بھی بنتا ہے اگر سازگار ماحول میں ہو تو تقریر، خطابت، گفتگو۔ اور حاکم ظالم کے سامنے ہو تو اسی کا نام ہو جائے گا جہاد۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قیام جتنے سخت ترین حالات میں ہو گا اتنی زیادہ اہمیت پیدا کرے گا۔

میں پھر تاریخ آپ کو یاد دلاتا چلوں تاکہ مسئلہ آپ کے سامنے واضح رہے۔ میں وہی حوالے دوں گا جو سب کو معلوم ہیں۔ تو ناسازگار حالات کا قیام اور ہوتا ہے سازگار حالات کا قیام اور ہوتا ہے۔

واضح لفظوں میں گذارش کروں۔ لشکر کے ساتھ میدان میں جانا، فوجوں کے سہارے میدان میں جانا اور ہوتا ہے اور جب فوجیں بزدلی کی سند پاکے بیٹھ جائیں تو اکیلے میدان میں جانا اور ہوتا ہے۔ تو جتنے حالات بدتر ہوتے جائیں گے اسی اعتبار سے قیام اہمیت پیدا کرے گا۔ عظمت پیدا ہو جائے گی۔ اپنے گھر میں چاروں طرف سے گھیر لیا جائے اور آدمی

نام قیام نہیں ہے۔ اس نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس نے کون سا کام کیا ہے بلکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مارنے والے حق بجانب تھے تو مسئلہ اور بھی بدتر ہو جائے گا۔ ہر ایک پلٹ کے کہے گا نہ آپ نے بھائی بندوں کو کھلایا ہوتا نہ یہ حشر ہوتا۔ نہ آپ نے یہ غلط کام کیا ہوتا نہ یہ انجام ہوتا۔ نہ آپ نے ایسا کیا ہوتا نہ یہ ہوتا یعنی ہزار مصیبتیں اور سر آجائیں گی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں گھر کے مر جانا اور ہوتا ہے اور میدان میں قیام کر کے قربانی دینا اور ہوتا ہے۔

اب یہاں پر ایک لفظ مجھے کہنا ہے، شاید میرے سننے والے اگر اس حقیقت سے باخبر نہیں ہیں تو باخبر ہو جائیں۔ ہم یہاں سے باہر نکلے۔ نہیں جانتے ہیں کہ اُدھر ہمارے دشمن بھی ہوں گے۔ خدانخواستہ چار دشمنوں نے ہم کو گھیر لیا اور مار ڈالا۔ ہو سکتا ہے کہ اسلام ہم کو شہید قرار دے۔ ہو سکتا ہے مذہب ہمیں شہادت کا ثواب دیدے اس لیے کہ بے گناہ مارے گئے ہیں اور ایک کار خیر سے پلٹ کے آرہے تھے تو مارے گئے ہیں۔ اس کی ایک اہمیت ہوگی، ثواب ملے گا، اجر ملے گا مگر اس کا نام جہاد ہوگا نہ اس کا نام واقعی شہادت ہوگا۔

یاد رکھیے گا ثواب شہادت الگ ہے اور شہادت الگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو شہادت کے احکام ہیں وہ میدانِ جہاد تک محدود ہیں گھروں میں نہیں ہیں چھوٹا سا مسئلہ جس کو سب جانتے ہیں اور نہیں جانتے ہیں تو معلوم ہو جائے۔ شہید کے واسطے غسل و کفن نہیں ہے۔ شہید جب شہید ہو جائے گا تو نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور دفن کر دیا جائے گا۔ نہ غسل دیا جائے گا نہ کفن۔ مگر ہم جب مرتے ہیں تو ہمیں غسل و کفن دیا جاتا ہے اور واجب بھی ہے۔ حالانکہ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ "مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَہِیْدًا" جو آلِ محمدؐ کی محبت پر مر جائے وہ شہید مرتا ہے۔ تو اگر ہم سب شہید ہی مرتے ہیں تو ہمیں غسل کیوں دیا جاتا ہے، کفن کیوں دیا جاتا ہے؟ مگر یہ فرق یاد رکھیے گا پیغمبرؐ نے کہا کیا۔ جو محبتِ آلِ محمدؐ پر مر جائے وہ "مَاتَ شَہِیْدًا" یعنی مر گیا اور شہید ہوگا۔ مر گیا اور شہید ہو گیا۔ مر کے شہید ہو جانا اور ہے، اور شہید ہو کر دنیا سے جانا اور ہے۔ ہم محبت والے

جب گھر میں مرتے ہیں تو نبیؐ نے ہمارے لیے لفظ موت استعمال کیا ہے اگر ہم ہی میدان میں جا کر اگر قربان ہو جائیں تو قرآن کہتا ہے لفظ موت استعمال نہ کرنا۔ خبردار انھیں مُردہ نہ کہنا یہ زندہ ہیں۔

اب تو فرق معلوم ہوا کہ شہادت اور ہے ثوابِ شہادت اور ہے۔ بستر پر مرنے سے ثوابِ شہادت ملتا ہے اور میدان میں گلا کٹانے سے شہادت ملتی ہے۔ تو شہادت کے احکام الگ ہیں۔ ثوابِ شہادت کے احکام الگ ہیں۔ تو اگر میں راستہ میں گھر جاؤں۔ مجھے چار آدمی مار ڈالیں تو مجھے ثوابِ شہادت انشاء اللہ مل جائے گا، مگر میرے اس مرنے کا نام شہادت نہیں ہے اس لیے کہ نہ کوئی معرکہ ہے نہ کوئی مقابلہ۔ نہ کوئی جہاد ہے نہ کوئی جنگ۔ حد یہ ہے کہ مجھے اطلاع بھی نہیں ہے اگر یہی معلوم ہو جاتا کہ چار دشمن ہیں اور یہ میرے مخالف ہیں یعنی میرے مذہب کے، اسلام کے مخالف ہیں اور اس لیے مجھے مارنا چاہتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے، اسلام کا نام لیتا ہے، اسلام کی آواز بلند کرتا ہے اور اس کے بعد میں چلا جاؤں تو ہو سکتا ہے کہ اس کا نام شہادت پڑ جائے۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ اب اسلام کے نام پر مرنے کا وقت آ گیا ہے۔ دشمن سامنے ہے۔ چونکہ میں سمجھ کے گیا ہوں لہٰذا میرے مقابلہ کا نام جہاد بھی پڑ سکتا ہے اور مرنے کا نام شہادت بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر بے خبری میں مارا جائے تو کتنا ہی ثواب آپ اس کو دے دیں مگر کوئی فقہ اس کو شہید کہنے کے لیے تیار نہیں ہے، شہادت کے احکام دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسلام کی کوئی فقہ ایسے انسان پر شہادت کے احکام مرتب کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو بے خبری میں مارا جائے۔ تو شہادت وہیں پیدا ہوتی ہے جہاں پہلے خبر ہو۔ جہاں جان بوجھ کے میدان میں قدم رکھے۔ جہاں مقابلہ پر آئے اور اس کے بعد مارا جائے۔ تو یہ فرق یاد رکھیے گا کہ شہادت بے خبری میں نہیں ہوتی ہے۔

نہیں۔ میں پھر اپنے لفظ کو دوہراؤں گا تاکہ ایک ایک بچہ کے ذہن میں بات راسخ ہو جائے اور جہاں تک میری آواز جا رہی ہے لوگ پڑھیں اپنی فقہ، پڑھیں اپنا مذہب کہ اگر بے خبری میں مر جائے تو ثوابِ شہادت

ہوگا نہ شہادت کے احکام ہوں گے۔ شہادت کے احکام میدانِ جہاد میں اسی لیے رکھے گئے کہ جو میدان میں آیا ہے وہ یہ سمجھ کے آیا ہے کہ جان کی بازی لگانے جا رہا ہوں۔ وہ سمجھ کے آیا ہے کہ یہاں موت آ سکتی ہے۔ یہاں گلا کٹ سکتا ہے۔ تو یہ یاد رکھیے گا کہ اسلام میں شہادت کی بنیاد ہے خبر اور اطلاع۔ بے خبری میں شہادت نہیں ہے، عدم اطلاع میں شہادت نہیں ہے۔ ناواقفیت میں شہادت نہیں ہے۔ اسی لیے شہادت میدان میں ہے کہ میدان میں کوئی بے خبر نہیں آتا ہے۔ میدان میں مجاہد آتا ہے، لڑنے والا آتا ہے، حالات دیکھنے والا آتا ہے، دشمن کو پہچاننے والا آتا ہے۔ تو شہادت کی بنیاد ہے خبر اور اطلاع۔

کتنے بے خبر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جب جانتے تھے کہ حالات خراب ہیں تو کیوں گئے تھے۔

اکثر سنتے ہیں آپ۔ کہ جب جانتے تھے کہ ابن ملجم مسجد میں ہے تو کیوں گئے تھے۔ جب جانتے تھے کہ حالات ایسے ہیں تو پانی کیوں پی لیا جب جانتے تھے کہ انگور زہر میں بجھائے گئے ہیں تو کیوں کھا لیا۔ جب جانتے تھے کہ بہتر ہی آدمی آپ کے پاس ہیں اور اُدھر ہزاروں ہیں تو کیوں چلے گئے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بے خبری میں چلے گئے ہوتے تو آپ خوش ہوتے۔ نہ اپنا اندازہ ہوتا نہ دشمن کا اور چلے گئے ہوتے۔ دھوکے میں مر گئے ہوتے تو آپ خوش ہو جاتے۔ مگر چونکہ جانتے تھے لہٰذا آپ پریشان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نگاہ میں ایسے ہی مرنے والے ہیں کہ جن کا گلا بھی کٹا تو دھوکے میں۔ جو مارے بھی گئے تو ناواقفیت میں۔ حالانکہ اسلام کی بنیاد یہ ہے کہ ناواقفیت میں موت کا نام شہادت نہیں ہے۔

اسی لیے ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے مدینہ ہی سے کہنا شروع کر دیا تھا:

رُخ ہے حالات کا ایک تلخ حقیقت کی طرف

اس لیے کہ اگر میں مسلسل اپنی آگاہی کا اعلان نہ کروں گا تو مر تو جاؤں گا مگر اسے شہادت نہ کہا جائے گا۔

شہید حالات سے بے خبر نہیں ہوتا ہے۔ شہید میں ارادہ ہے، عزم ہے، ہمت ہے، طاقت ہے، حالات کو جانتا ہے مگر جانتا ہے کہ یہ وقت آگیا ہے کہ انسان مذہب پر قربان ہو جائے لہٰذا قربانی کے لیے اٹھا ہے۔ شہادت ناواقفیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ دھوکہ میں مر جانے کا نام نہیں ہے۔ شہید، راہِ خدا میں قربانی کے عزم و ارادہ سے نکلتا ہے۔ یہ تو خود قرآن مجید نے کہا ہے "يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ" یہی شہادت ہے کہ راہِ خدا میں پہلے جہاد کرتے ہیں، دشمن کو قتل کرتے ہیں اور آخر میں خود شہید ہو جاتے ہیں پہلے قتال، قتل کرنا اس کے بعد قتل ہو جانا۔ جو لوگ قرآن مجید پڑھتے رہتے ہیں وہ ان نکات کو خوب سمجھیں گے اور جب تفسیریں پڑھیں گے تو حالات معلوم ہو جائیں گے۔ یعنی "يُقْتَلُونَ" قتل ہو جانا اس کا تیسرا مرحلہ ہے۔ پہلا مرحلہ "يُقَاتِلُونَ" راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ "يَقْتُلُونَ" دشمن کو قتل کرتے ہیں۔ اور آخری مرحلہ ہے "يُقْتَلُونَ" پھر قتل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا شہادت کو کہاں رکھا ہے اتنے مرحلے گزر جائیں۔ اتنی ہمت کا مظاہرہ ہو۔ کبھی قتال ہو راہِ خدا میں۔ کبھی قتل ہو راہِ خدا میں اور پھر قتل ہو جائے راہِ خدا میں، چاہے مسجد ہی میں ہو جائے۔

توجہ نہیں کی آپ نے میں نے کیا کہا؟ چاہے مسجد میں شہید ہو جائے۔ یہاں معرکہ نہیں ہے مگر اس کا نام شہادت ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ بدر میں دیکھا قتال کرتے ہوئے۔ اُحد میں دیکھا قتال کرتے ہوئے۔ خندق میں دیکھا جہاد کرتے ہوئے۔ خیبر میں دیکھا جہاد کرتے ہوئے۔ معرکوں میں دیکھا جہاد کرتے ہوئے۔ تو قتال کرتے بھی دیکھا اور دشمن کو قتل کرتے بھی دیکھا تو آخر میں اگر مسجد کوفہ میں قتل ہوتے دیکھا تو یہ قتل بھی شہادت ہے اس لیے کہ قتال کے بعد ہے قتل کے بعد آخر میں آیا ہے۔ لیکن جسے کبھی قتال کرتے نہ دیکھا ہو، جسے کبھی دشمن کو مارتے نہ دیکھا ہو وہ کہیں بھی

ہوتا ہے اس لیے کہ شہادت تو تیسرے مرحلہ پر آتی ہے۔ پہلے کارہائے نمایاں اور آخر میں قربانی جو قرآن مجید نے اپنے انداز سے مسلمان کو سمجھایا ہے۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ قیام کی اہمیت شخصیت سے ہے۔ قیام کی اہمیت ایمان سے ہے۔ قیام کی اہمیت حالات سے ہے۔

چوتھا مرحلہ۔ قیام کی اہمیت خود قیام کرنے والے کے مزاج اور اس کی ذہنیت سے ہوتی ہے۔ یعنی وہ خود اپنے قیام کے بارے میں کیا سمجھتا ہے؟ خیر کبھی اللہ ایسے حالات اور ایسے مواقع فراہم کرے گا تو میں ان تفصیلات کو آپ کے سامنے گذارش کروں گا فی الحال وقت کم ہے لہٰذا اجمالاً عرض کرنا چاہتا ہوں۔ خود قیام کرنے والا اپنے قیام کے بارے میں کیا سمجھتا ہے یہ بھی قیام کی اہمیت ہے یعنی قیام کرنے والا اگر خود ہی اپنے قیام سے مطمئن نہیں ہے تو دوسرے کیا قیمت لگائیں گے۔ کم سے کم خود تو مطمئن ہو، خود تو اعتماد رکھتا ہو۔ اعتماد طاقت والا نہیں۔ میں جو اب کہنے جا رہا ہوں وہ چوتھی بات ہے۔ بلکہ کم سے کم خود اعتماد اور اطمینان رکھتا ہو اور اپنے قیام کو حق بجانب سمجھتا ہو، تاکہ دوسروں کو سوچنے کا موقع ملے کہ شاید یہ قیام حق بجانب ہے۔ لیکن اگر وہ خود ہی کہہ دے کہ میں غلط اٹھا ہوں تو ہم کیا کہیں۔ نہیں سبحان اللہ کیا کہنا آپ کا۔

مثلاً اب میں تقریر کر رہا ہوں ایک صاحب بیچ میں کھڑے ہو گئے۔ مولانا ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ اگر تین اور چار رکعت میں شک ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے۔ میں مسئلہ قیام حسینی کا تذکرہ کر رہا ہوں انھیں تین چار کا شک یاد آگیا، جب کہ اس شک کا صدیوں میں علاج نہیں ہو سکا تو میں دو منٹ میں کیا حل کر دوں گا۔ ساری بلا اسی شک کی لائی ہوئی ہے۔

ہاں ہاں نماز میں کوئی شک آدمی کو ہو یا نہ ہو مگر یہ والا اکثر ہو جاتا ہے۔ پہلی رکعت میں آدمی ٹھیک سے چلتا ہے۔ دوسری رکعت سنبھال کے لے جاتا ہے بس جہاں تین چار کا مسئلہ آیا وہیں کتنی دیر تک بیچارہ سوچا کرتا ہے۔ تین کہ چار، تین کہ چار۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ شریعت نے کہا کہ اگر یہ شک ہو جائے تو چار پر بنا رکھنا تین

پر نہیں کہ یہی اسلام ہے۔

اوّل تو دعا کیجیے کہ شک ہونے ہی نہ پائے۔ شک اہل شک کو مبارک ہو ہم سے کیا مطلب، ہم تو اس کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں جو اعلان کرتا ہے کہ اگر سارے پردے ہٹا دیے جائیں تو یقین میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ تو یہاں شک کا کیا ذکر ہے لیکن اگر کسی کو شک ہو جائے تو اسلام نے اس کو راستہ بتا دیا ہے کہ بھائی دیکھو جب تین اور چار میں شک ہو جائے تو تین پر ٹھہر نہ جانا۔ چار پر بنا رکھنا تاکہ نماز کے صحیح ہونے کا امکان پیدا ہو جائے ورنہ اگر ادھر رہ گئے تو نماز بھی گئی۔ خیر

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ صاحب قیام، صاحب اقدام کو اپنے قیام پر اعتماد ہو، اطمینان ہو، اعتبار ہو یہ ایک بڑی چیز ہے، ورنہ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی قیمت نہیں ہے۔

تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ وہ کھڑے ہو گئے، مسئلہ پوچھ لیا بیچارے نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا ہے۔ مسئلہ پوچھ لیا ہے۔ اس کے سامنے مسئلہ تھا وہ پریشان تھا اتفاق سے یاد آ گیا اب مجلس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ بیچ میں کوئی بات ہی نہ ہونے پائے۔ ارے کوئی بے ربط بات نہ ہو لیکن اللہ و رسول کی بات ہے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ اس نے مسئلہ پوچھ لیا۔ میں نے بتا دیا۔ مگر جیسے ہی اس نے پوچھا چاروں طرف سے لوگوں نے اپنی تند نگاہ ہو لیے دیکھا کہ اگر واقعاً نظر کوئی کام کرتی ہوتی تو یہ بیچارہ کب ہارٹ اٹیک اور ہارٹ فیل اور خدا نہ جانے کن منزلوں سے گذر چکا ہوتا۔ مسئلہ پوچھا شرعی مسئلہ پوچھا۔ غلط کام نہیں کیا۔ اب اچھا کیا یا بُرا کیا۔ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ٹھیک نہیں کیا۔ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بڑا شوق تھا آپ کو۔ تو یہ تو اتر ہی رہے ہیں گے ابھی منبر سے۔ پوچھ لینا اور میں تو منبر پر آنے سے پہلے اور منبر سے اترنے کے بعد بھی اسی لیے کافی دیر تک یہاں بیٹھتا ہوں کہ اگر مومنین کی نظر میں کوئی مسئلہ ہے تو روز روز تو آتے نہیں ہیں، نہ آ سکتے ہیں دور دراز کے رہنے والے ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ان کے سامنے ہے تو دریافت کر لیں، میں اسی لیے یہاں بیٹھتا ہوں۔ اور میں تو رہتا ہی ہوں جب بھی آپ چاہیں مسئلہ دریافت کر سکتے ہیں۔ مجھے تو کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے کہ جو چاہو کہو اور نکل جاؤ

پاس چلے آئیں جب چاہیں دریافت کرلیں۔ خیر

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ اب ہر آدمی پریشان ہے۔ کوئی کہتا ہے ٹھیک ہی ہے شریعت کی بات پوچھی ہے۔ کیا بُرا کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں مگر کوئی تُک نہیں، یہ کیا موقع ہے پوچھنے کا۔ اب یہ بحث چل رہی ہے۔ یہ ان کا اُٹھنا یہ ان کا قیام، یہ ان کا سوال صحیح ہے یا غلط۔ یہ بحث چل رہی تھی جیسے ہی میں منبر سے اُترا اب وہ لوگ جو سمجھ رہے تھے کہ ٹھیک کیا۔ کم از کم انھوں نے سوال کیا تو ہم سب کو مسئلہ تو معلوم ہو گیا۔ بڑا اچھا کام کیا وہ آگے بڑھ ہی رہے تھے تعریف کرنے کے لیے۔ شاباش بیٹا تم نے ایک کام کیا۔ ایک مسئلہ پوچھ لیا ہم سب کو معلوم ہو گیا۔ وہ ابھی جا رہے تھے تعریف کرنے کے لیے کہ وہ خود آئے میرے پاس مولانا معاف کیجیے، مجھ سے غلطی ہو گئی۔

ہم جا رہے تھے تعریف کرنے کے لیے شاباش ٹھیک کیا تم نے آجکل کے نوجوانوں میں مذہب کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ہونا چاہیے لیکن ان کی تعریف کرنے سے پہلے وہ خود ہی کہنے لگے معاف کیجیے گا مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے نہیں اُٹھنا چاہیے تھا تو بیچارے تعریف کرنے والے بھی شرما کے چُپ ہو جائیں گے۔

تو قیام کرنے والا جب اپنی بات پر قائم رہتا ہے تب حمایت کرنے والوں کو حمایت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن اگر اسے خود ہی یہ خیال پیدا ہو جائے کہ میں نے غلط کیا اور زندگی بھر اسی شرمندگی میں سر جھکائے رہے تو اب بیچارے تاویل کرنے والے کیا کریں۔ تعریف کرنے والے کیا کریں۔ اس سے زیادہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ بات پردہ کی ہے تو پردہ ہی میں رہ جائے زیادہ بہتر ہے۔

یہ میں نے اس لیے کہا کہ بات پردہ کی ہے پردہ ہی میں رہ جائے کہ میں بات پردہ کی پردہ ہی میں کرتا ہوں۔ اب زیادہ وضاحت سے گفتگو کی جاتی ہے تو خواتین ناراض ہو جاتی ہیں کہ ان کے پاس مجلس میں سوائے پردہ اور داڑھی کے کچھ ہے ہی نہیں تو اگر میرے پاس صرف پردہ اور داڑھی ہے تو مسئلہ آسانی سے ختم ہو جائے گا۔ آپ بھی

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ قیام کرنے والا اگر خود اپنے قیام سے مطمئن ہے تو دوسرے آدمی کو بہر حال حمایت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن اگر قیام کرنے والا خود ہی اپنے قیام سے مطمئن نہیں ہے وہ خود ہی کہتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اُٹھنا میرا کام ہی نہیں تھا یہ تو بزرگوں کی بات تھی، ہم بچہ ہو کر کہاں بیچ میں کھڑے ہو گئے۔ ہم درمیان میں کہاں سے اُٹھ گئے۔ تو اگر خود اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میرا قیام صحیح نہیں ہے تو دوسرا آدمی اس کے قیام کی کیا تفسیر کرے، کیا اس کی تعریف کرے، کیا اس کی تاویل کرے۔ لہٰذا خود اس کا اطمینان ضروری ہے۔ تو یہ چوتھا مرحلہ ہے۔

اور آخری مرحلہ جو آج گذارش کرنا ہے یہ ہے کہ قیام کی اہمیت پیدا ہوتی ہے نتائج کے اعتبار سے۔ قیام اہم ہوتا ہے نتائج کے اعتبار سے۔ لوگوں نے کہا نتیجہ کیا نکلا۔ یہ نہیں کہ خود کیا کہتا ہے نتیجہ میں سب کیا کہتے ہیں اور یہ بات ہر مسلمان آسانی سے سمجھے گا۔ فرق پہچانئے گا دعوت ذوالعشیرہ میں جتنے تھے، جو بلائے گئے تھے کوئی ایک تعریف کرنے والا نہیں تھا۔ کوئی ایک یہ کہنے والا نہیں تھا کہ بالکل صحیح قیام کیا۔ ہم کو ضرورت تھی ایک رہنما کی۔ ہم کو ضرورت تھی ایک پیغمبرؐ کی۔ کوئی ایک تعریف کرنے والا نہیں تھا یہ ابتدائے قیام ہے کہ سارا مجمع جادوگر اور دیوانہ کہنے لگا۔ جب نتائج سامنے آئے تو ہم نے دیکھا کہ جس نے کل مجنون کہا تھا وہ اسی مکہ میں فتح مکہ کے موقع پر اسی مجنون کا کلمہ پڑھنے لگا۔ تو یہ نہ دیکھو کل دنیا نے کیا کہا تھا یہ دیکھو انجام کیا سامنے آیا۔ ابوسفیان کا کلمہ پڑھ لینا اس بات کا اعلان ہے کہ کل جس کو دیوانہ کہا گیا تھا وہ دیوانہ نہیں تھا۔ جو دیوانہ کہہ رہا تھا وہ دیوانہ تھا۔ تو یہ تو نبیؐ کی تاریخ ہے کہ قیام کی ابتدا میں نبیؐ کی تعریف کرنے والا کوئی نہیں ملا، مگر جب نتیجہ سامنے آیا تو بدترین دشمن بھی تعریف کرنے والے ہو گئے۔

اب اگر قیام حسینؑ کی عظمت کو پہچاننا ہے تو دور نہ جائیے۔ یہیں پر آکے پہچان لیجئے کہ امام حسینؑ آخری سانسوں میں جب نرغۂ اعداء میں

۱۹۵۱
انیس سو اکیاون زخم تھے جب بھی امام حسینؑ نے یہ نہ کہا کہ اگر مجھے یہ حالات معلوم
ہوتے تو کبھی نہ اٹھتا۔ یہ میں نے کیا کیا۔ مجھے یہ نہیں کرنا تھا۔ میرا سارا گھر اجڑ گیا۔ ایسے
سخت ترین حالات میں بھی امام حسینؑ نے یہ نہ کہا۔

اور جب پورے لشکر کو فتح مل گئی۔ فتح کے شادیانے بج گئے۔ جب سارا دربار آراستہ
ہو گیا۔ وزراء سفراء اکٹھا ہو گئے، تب بھی حاکم کہہ رہا ہے حسینؑ نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ تو سارے
حالات کا حسینؑ کے ساتھ چلا جانا اور سارے دربار کا یزید کی مذمت کر کے یزید کو شرمندگی پر
آمادہ کر دینا یہ اعلان ہے کہ حسینؑ فاتح اعظم ہیں۔ حسینؑ نے یزید کے دربار کو فتح کیا ہے
اور یزید اپنے دربار میں ہار گیا ہے۔

موقع نہیں ہے ورنہ میں سارے نتائج عرض کرتا کہ واقعۂ کربلا کے بعد جو نتائج
سامنے آئے ہیں ان نتائج نے اس قیام کو اتنا اہم اور قیمتی بنا دیا ہے کہ تاریخ میں بہت
سے راہِ خدا میں قربان ہونے والے ہیں۔ بہت جان دینے والے ہیں اور واقعاً شہید
ہونے والے ہیں اس سے انکار ہو سکتا ہے بلکہ سلسلۂ شہادت آج تک برقرار ہے
اور راہِ خدا میں جان دینے والے جان دے رہے ہیں۔ مگر جن نتائج کو امام حسینؑ نے
اپنے قیام اور اقدام سے حاصل کیا ہے، ان نتائج کو تاریخ میں نہ اس کے پہلے دیکھا گیا
ہے نہ اس کے بعد دیکھا گیا ہے اور میں کیا میری نگاہ کیا۔ ان نتائج کو واقعہ سے پہلے
نگاہِ پیغمبرؐ نے دیکھا۔ توجہ کر رہے ہیں؟ ان نتائج کو واقعہ سے پچاس سال پہلے نگاہِ پیغمبرؐ
نے دیکھا کہ اگر قیام حسینؑ کے یہ نتائج پیغمبرؐ کی نگاہ کے سامنے نہ ہوتے تو کبھی نہ کہتے
"انا من الحسینؑ" میں حسینؑ سے ہوں۔ یہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ جب میرا حسینؑ
اُٹھے گا تو چاہے وہ نہ رہ جائے میرا دین رہ جائے گا۔ میرا اسلام رہ جائے گا، میرا مذہب
رہ جائے گا۔ اور واقعاً رہ گیا حسینؑ سے۔ کہ حسینؑ نے اگر حج کو عمرہ سے تبدیل نہ کیا ہوتا
تو زمین حرم کی حرمت نہ رہ جاتی۔ حسینؑ نے اگر درباروں تک اپنے اہلِ حرم کو نہ پہنچا دیا
ہوتا تو وہاں وحی بے بنیاد ہو جاتی۔ خبر کا انکار ہو جاتا۔ اسلام بنی ہاشم کا کھیل ہو جاتا اور
کوئی اسلام کا نام لینے والا نہ ہوتا۔ یہ حسینؑ کا قیام تھا اہلِ حرم کے ساتھ کہ جس نے اسلام

کو زندہ کیا۔ اگر حسینؑ نے نوک نیزہ پر تلاوت نہ کی ہوتی تو آج کسی کو عظمتِ قرآن کا احساس نہ پیدا ہوتا۔ گھروں میں، قالینوں پر، مسجدوں میں، راحت کدوں میں، عشرت کدوں میں، بہترین دُھنیں بنا کے، بہترین انداز سے، بہترین لہجہ میں قرآن پڑھ لینا اور ہے اور سر کٹانے کے بعد نوکِ نیزہ پر جا کر تلاوت کرنا اور ہے۔

یہ آج کے حافظانِ قرآن کا کام ہے وہ کل کے محافظ قرآن کا کام تھا، وہ حسینؑ بن علیؑ کا کارنامہ تھا جس نے عظمتِ قرآن کو بچا لیا۔ یہ سارے نتائج اس قیام کے جس نے یہ نتائج عالمِ انسانیت کے سامنے پیش کئے ہیں کہ عالمِ انسانیت شرمندۂ احسان حسینؑ بن علیؑ ہے۔

میں اللہ اور رسولؐ کے ارشادات گرامی کے مقابلہ میں اہلِ دنیا کے اقوال کا کیا ذکر کروں اور ان کی کیا حیثیت ہے لیکن اعترافات کے اعتبار سے تو دنیا نے اس حقیقت کو پہچان لیا ہے کہ حسینؑ تنہا اسلام کے لیے بلکہ عالم انسانیت کے واسطے ایک محسن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ کو تاریخی واقعات تو معلوم ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے واسطے ایک غیر مسلم نے قدم اٹھایا، ایک کافر نے، مشرک نے، جو خدا اور بُت کا فرق نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے آواز اٹھائی تو اپنے ساتھ بہتّر آدمیوں کو لیا۔ لوگوں نے کہا کہ انگریز کی اتنی بڑی طاقت، اتنا رعب و دبدبہ، جاہ و جلال کہ اس کے مقابلہ میں یہ چند آدمی جو آپ لے کر اٹھے ہیں یہ کیا کریں گے؟ تو کہا کہ تم نہیں جانتے ہو، یہ فیگر ایسی ہے کہ جو کامیابی کی ضمانت ہے۔

گاندھی کا یہ فقرہ مشہور ہے۔ یہ عدد ایسا ہے کہ جو کامیابی کی ضمانت ہے۔

تم نے کیسے پہچان لیا کہ بہتّر آدمی کھڑے ہو جائیں گے تو اتنی بڑی باطل کی طاقت کو ہرا دیں گے اور ملک سے نکال باہر کریں گے۔

کہا، تم نے کربلا کا واقعہ نہیں پڑھا امام حسینؑ نے دو سبق دیے ہیں۔ یہ بتایا ہے کہ ظلم کا مقابلہ کبھی ظلم سے نہ کرنا۔ ظلم کا مقابلہ ہمیشہ مظلومیت سے کرنا اور جب ظلم کے مقابلہ میں اٹھنا تو افراد پر زور نہ دینا۔ تھوڑے سے مخلص بھی اگر پیدا ہو جائیں تو ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حیرت ہے کہ ایک کافر، ایک مشرک، ایک بُت پرست انسان وہ قیام حسینی کی عظمت کو کچھ تو پہچانتا ہے اور عالم اسلام میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ حسینؑ کیوں اٹھے؟ اس لیے کہ ساری فکر یہ ہے کہ نہ اٹھے ہوتے تو جیسے کل یزید کے دربار میں دور چل رہا تھا آج بھی چلتا۔ کل جو کاروبار ہو رہا تھا وہ آج بھی ہوتا۔

پریشانی تو یہی ہے کہ اب اسلام کے نام پر کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا ہے۔ اب اسلام کے نام پر کوئی بے دینی نہیں ہو سکتی ہے۔ بے دین تو سب کچھ کر سکتا ہے لیکن اسلام کے نام پر بے دینی، اب اس کا امکان نہیں رہ گیا ہے۔

یہ حسینؑ بن علیؑ کا کارنامہ ہے۔ یہ قیام حسینؑ کے نتائج ہیں۔ جس نے اسلام، قرآن، کعبہ سب کی عظمتوں کا تحفظ کیا ہے۔

اس لئے نہ یہ ہمارا کوئی کارنامہ ہے نہ آپ کا کوئی کارنامہ ہے۔ نہ کسی بھی مسلمان کا کارنامہ ہے۔ یہ قرآن ہے جو حسینؑ کو بچائے ہوئے ہے۔ یہ کعبہ ہے جو عظمتِ حسینؑ کو بچائے ہوئے ہے۔ یہ اسلام ہے جو عظمتِ حسینؑ کو بچائے ہوئے ہے۔ یہ پیغمبرِ اسلام کی دعائیں ہیں جو عظمت و قربانی حسینؑ کو بچائے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ ہماری راہ میں مر کے تو دیکھو ہم زندہ جاوید بناتے ہیں یا نہیں۔ یہ زندگیِ جاوید جو حسینؑ بن علیؑ کو حاصل ہوئی ہے یہ علامت ہے کہ حسینؑ نے راہِ خدا میں جان دی ہے۔ اور اگر کسی کو یہ زندگی نہیں ملی ہے تو یہ علامت ہے کہ راہِ خدا میں قربانی نہیں دی ہے۔ راہِ خدا میں قربانی کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

امام حسینؑ جب اٹھے راہِ خدا میں قربانی دینے کے لیے تو اس عزم کے ساتھ اور اس ارادہ کے ساتھ کہ جو کچھ ہوگا سب راہِ خدا میں قربان کر دوں گا۔

ایسا نہیں ہے کہ امام حسینؑ کے سامنے یہ حالات نہیں پیدا ہوئے تھے کہ آپ کے بچنے کے امکانات نہیں ہیں۔ آپ کے زندہ رہنے کے امکانات نہیں ہیں۔

غیروں کا کیا ذکر ہے جب امام حسینؑ مدینہ سے نکلے اور مصلحت اسلام کی بنیاد پر چند افراد کو مدینہ میں چھوڑ دیا مثلاً جناب محمد بن حنفیہ مدینہ میں رہ گئے۔ جناب عبداللہ بن جعفر مدینہ میں رہ گئے۔ کچھ خواتین مدینہ میں رہ گئیں۔

تو جناب عبداللہ بن جعفر نے حالات کا اندازہ کیا اور حالات کو دیکھنے کے بعد انھوں نے حاکم وقت اور علاقہ کے گورنر سے گفتگو کی اور اس کے بعد اپنے فرزندوں کے ذریعہ امام حسینؑ تک یہ پیغام پہنچوایا کہ اگر آپ حالات کو ناسازگار اور نامناسب سمجھتے ہیں تو میں نے آپ کے لیے امان نامہ حاصل کر لیا ہے۔ آپ اطمینان سے رہیں۔ کوئی آپ کے لیے خطرہ نہیں ہے۔

امام حسینؑ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ امان نامہ مل جائے اور آپ یہ کہیں کہ میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن مسئلہ میرے خطرہ کا نہیں ہے اس کی ضمانت کون دے گا کہ اسلام کو خطرہ نہیں ہے۔ اس کی ضمانت کون دے گا کہ دین خدا کو خطرہ نہیں ہے۔ جب تک حاکم امان نامہ لکھتا رہے گا یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کو خطرہ ہے اس لیے کہ امان نامہ وہی تو لکھے گا جو حاکم ہوگا۔ امان نامہ وہی تو لکھے گا جو برسرِ اقتدار ہوگا اور جب تک ایسے فاسق و فاجر برسرِ اقتدار رہیں گے جن کے لیے خود امام حسینؑ نے یہ لفظ استعمال کیا ہے" الا ان الدعی بن الدعی" ایک ناتحقیق کے ناتحقیق بچے نے مجھے ایسی منزلِ مصیبت میں لا کر کھڑا کر دیا ہے" بین السلۃ والذلۃ" جہاں ایک طرف یہ ہے کہ میں تلوار کھینچ لوں اور ایک طرف یہ ہے کہ میں ذلیل ہو جاؤں" وھیھات منا الذلۃ" اور میں ذلت برداشت نہیں کر سکتا ہوں تو ایسے بدترین افراد اگر تختِ اقتدار پر رہیں اور امان نامے لکھتے رہیں تو ان کا تخت پر رہنا ہی دینِ اسلام کے لیے عظیم ترین خطرہ ہے۔

غور کیا آپ نے؟۔ تو امان نامہ مجھے مل سکتا ہے۔ امان مجھے دی جا سکتی ہے لیکن اسلام کو کون امان دے گا، دینِ خدا کو کون بچائے گا، اس کی بقا کی ضمانت کون دے گا۔ میں دینِ خدا کی امان کے لئے اٹھا ہوں میرے سامنے مسئلہ میری زندگی کا نہیں ہے۔

جب جناب عبداللہ بن جعفر نے یہ دیکھ لیا اور دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ حسینؑ پناہ گاہ کی تلاش میں نہیں نکلے ہیں، حسینؑ راہِ خدا میں قربانی کے قصد سے نکلے ہیں، تو کہا کہ فرزند رسولؐ! جب آپ نے یہ طے کر لیا ہے

جارہے ہیں اور آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جارہے ہیں تو کم سے کم میرے بچوں کو لیتے جائیے۔

آپ نے اس عزم کا اندازہ کیا۔ خدا نکردہ آج اگر ہم پر آپ پر کوئی مصیبت آجائے کہ ایک طرف، ہم ہوں ایک طرف ہماری اولاد ہو۔ ایک طرف ہم ہوں ایک طرف ہماری گود کے پالے ہوں تو ہر انسان یہ کہے گا کہ بیٹا تم پیچھے ہٹ جاؤ، ہم آگے جاتے ہیں۔ پہلے مرنا ہے تو ہم مرجائیں تم بچ جاؤ۔ مگر یہ راہِ خدا میں قربانی دینے والے ہیں کہ اگر مصلحت نہیں ہے اور مجھے نہیں لے جاتے ہیں اور شہادت میرا مقدر نہیں ہے تو بچے آپ کے ساتھ جائیں گے تاکہ دینِ خدا پر اگر وقت پڑے تو یہ راہِ خدا میں قربان ہو جائیں۔

یہ حوصلہ تھا جناب عبداللہ بن جعفر کا۔ یہ حوصلہ تھا ان بندگانِ خدا کا کہ جن کو مصلحتِ اسلام نے منزلِ شہادت تک نہیں جانے دیا تو ہر ایک نے اپنا اپنا فدیہ ساتھ کر دیا۔

بس عزیزو! آپ متوجہ ہو گئے اور میں بیان کو آخری منزل تک لے آیا۔ اب تو ماہ محرّم کے پانچ دن بھی گذر گئے لہٰذا چاہتا ہوں کہ یہ تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ ہو جائے۔

کربلا میں دو نوں کام ہو رہے تھے۔ مجاہدین خود اپنی قربانی کے لیے بیچین تھے، اور جو نہ آسکے انھوں نے کربلا کے لیے اپنے نمائندے بھیجے۔ اگر اُمّ البنین نہیں آئیں تو اپنی گود کے پالے چار بیٹے مولاؑ کے ساتھ کر دیئے۔ میرے شہزادو! میرے بچو! اگر مولاؑ پر وقت پڑ جائے تو پہلے تم قربان ہو جانا۔ مجھے شہزادیؑ کائنات کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دینا۔

اگر حسنِ مجتبیٰؑ کو معلوم تھا کہ میں کربلا میں نہ رہوں گا تو وصیت نامہ مرتب کر دیا۔ بیٹا قاسمؑ! تم تو رہو گے۔ تم میرے بھیا پر قربان ہو جانا۔ اگر عبداللہ بن جعفر کربلا تک حسینؑ کے ساتھ نہ آسکے تو عونؑ و محمدؑ کو ساتھ کر دیا۔ بچو! جب مولاؑ پر وقت پڑ جائے

توتم قربان ہو جانا۔ آقا پر آنچ نہ آنے پائے۔

یہ کربلا میں عجیب وغریب اہتمام وانتظام ہے کہ جو نہ آسکے انھوں نے اپنے فدیے بھیجے۔ انھوں نے اپنے نمائندے بھیجے۔ انھوں نے مولاؑ پر قربان کرنے کے لیے اپنی گود کے پالے اور اپنے دل کے ٹکڑے امام کے ساتھ کر دیئے، یہاں تک کہ کربلا آنے کے بعد وہ وقت آیا جسے عاشور کی رات کہا جاتا ہے۔ جس رات کے بعد یہ طے ہو گیا کہ صبح کو قربانیاں پیش ہونے والی ہیں۔ آخری گفتگو ختم ہو گئی ہے۔ صلح کے راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ امام حسینؑ خیمہ میں داخل ہوئے۔ ثانی زہراؑ نے پوچھا بھیّا کیا طے ہوا۔ آخری گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا؟۔

کہا: بہن مختصر یہ ہے کہ بس یہ آخری رات ہے۔ اس کے بعد بہن اور بھائی میں جُدائی ہو جائے گی۔ اے بہن کل قربانی کا دن ہے۔ کل شام ہوتے ہوتے جب عاشور کا سورج ڈوبے گا تو ہمارے سارے سورج خاک وخون میں ڈوب چکے ہوں گے۔ کل آلِ محمدؐ کی قربانیوں کا وقت ہے۔

اب جو مولاؑ کی طرف سے یہ اعلان ہو گیا تو مائیں اپنے بچوں کو آمادہ کرنے لگیں۔ ہر ماں بچوں میں حوصلۂ جہاد پیدا کرانے کے لیے اپنے لال سے ایک عجیب انداز میں گفتگو کر رہی ہے۔ شہزادی بھی عونؑ ومحمدؑ کو اپنے گود کے پالوں کو بٹھائے ہوئے فرما رہی ہیں:

بیٹا! اتنا تو یاد ہے کہ جعفر طیارؑ کے پوتے ہو۔ لال! اتنا تو معلوم ہے کہ حیدرِ کرارؑ کے نواسے ہو۔ تمھیں اپنے نانا کی جنگ بھی معلوم ہے۔ تمھیں اپنے دادا کا جہاد بھی معلوم ہے اور یہیں شہزادی کا دیا ہوا حوصلہ تھا کہ جب عاشور کا دن آیا اور اس قربانی کا موقع آگیا کہ اب چھوٹے بچے بھی راہِ خدا میں قربان ہو جائیں تو عزادارو ایک مرتبہ شہزادے مولاؑ کی خدمت میں آگئے کہ اِذنِ جہاد مل جائے اور جا کے ماموں پر قربان ہو جائیں۔ مگر کوئی مولاؑ کے دل سے پوچھے، بچوں کو سر سے پیر تک دیکھا۔ یہ معلوم ہے کہ سب کو قربان ہونا ہے مگر ...

رنے کے لیے میدان میں بھیجنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے، جس پر یہ وقت پڑتا ہے وہی جانتا ہے۔ جس نے اس مصیبت کا سامنا کیا ہے وہی اس مصیبت کو پہچانتا ہے۔ ایک مرتبہ جب شہزادیؑ نے یہ منظر دیکھا تو روایات میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ آئیں اور آ کے ماں جائے کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ بھائی سے زیادہ بہن کے انداز کو کون پہچانے گا۔

فرمایا۔ زینبؑ خیر تو ہے، کچھ کہنا چاہتی ہو؟

کہا۔ ہاں بھیا کچھ کہنا ضرور چاہتی ہوں اور اس اعتماد کے ساتھ کہنا چاہتی ہوں کہ آج تک میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے آپ نے کبھی میری بات کو ٹالا نہیں ہے، آپ نے میری بات کو ٹھکرایا نہیں ہے۔

کہا۔ ہاں ہاں، مگر کہنا کیا چاہتی ہو؟

کہا۔ بھیا، بس ایک گذارش ہے کہ ان میرے دل کے ٹکڑوں کو، ان میری گود کے پالوں کو مرنے کی اجازت دیدیجئے۔ یہ میرے بچے میدان میں جائیں اور آپ پر قربان ہو جائیں۔

بہن نے ایسی بات کہی کہ بھائی کیسے انکار کرے۔

کہا، اچھا بہن اگر تم یہ کہتی ہو تو لو میں نے اجازت دے دی۔

عونؑ و محمدؑ میدان میں جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ عباسؑ جیسے استاد نے عونؑ و محمدؑ کو سجا کے تیار کیا۔ بچوں کو گھوڑے پر بٹھایا۔ میدان کی طرف رخصت کیا۔ اس مقام پر بعض شعراء نے صرف حالات کی ترجمانی کرنے کے لیے جو واقعاً شہزادی کے دل کے سچے جذبات ہیں عجب بات کہی ہے۔

جب بیٹے رخصت ہو کر چلنے لگے تو ماں نے بچوں کو ہدایت کی کہ جاؤ میرے لال لڑو، قربان ہو جاؤ، جہاد کرو، ماموں پر فدا ہو جاؤ۔ مگر خیال رکھنا اگر لڑتے لڑتے فرات تک پہنچ بھی جانا تو دیکھو پانی کو مڑ کے نہ دیکھنا۔ ابھی تمہارا بھیا علی اصغرؑ پیاسا ہے، ابھی سکینہؑ پیاسی ہے۔ بچوں کو پانی نہیں ملا ہے۔ ہر طرف سے العطش العطش

کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔

شہزادے میدان میں آئے۔ ایک طرف عونؑ کا جہاد، ایک طرف محمدؑ کا معرکہ۔ روایات میں دونوں کے رجز کا ذکر ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے، تم نے کیا سمجھا ہے، کیا دینِ خدا لاوارث ہو گیا ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں دینِ خدا لاوارث نہیں ہو سکتا ہے۔ میں اپنے ماموں پر قربان ہو جاؤں گا۔

دوسری طرف سے آواز آ رہی ہے۔ ارے ظالمو! تم نے میرے جوشِ جہاد کو نہیں پہچانا ہے۔ جعفرِ طیّار میرے دادا کا نام ہے۔ ہم کو معلوم ہے جب ہمارے دادا نے راہِ خدا میں قربانی دی تو اللہ نے انھیں دو پَر عطا کر دیے اور وہ جنّت میں پرواز کر رہے ہیں۔ ہم بھی اگر قربان ہو جائیں گے تو پروردگارِ عالم ہم کو بھی پرواز عطا کرے گا۔
اِدھر ایک بھائی کا جہاد اُدھر دوسرے بھائی کا جہاد۔ مشغولِ جہاد ہیں۔ چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ اِدھر سے تلوار چل رہی ہے اُدھر سے زخموں پر زخم لگ رہے ہیں۔ وار پر وار ہو رہا ہے کہ ایک مرتبہ زخموں سے چور ہو کر بچّے گھوڑے سے گرنے لگے اور مقتل سے ایک آواز آئی، مولا مولا!

بس جیسے ہی آقا کے کانوں میں آواز آئی، کہا بھیّا عباسؑ اُٹھو، چلو میرے ساتھ۔ حسینؑ عباسؑ کو لے کر میدان میں آئے۔ اِدھر عونؑ کا جنازہ اُدھر محمدؑ کا لاشہ۔ بھیّا آؤ، میں اکیلے دونوں کو نہ اٹھا سکوں گا۔ عباسؑ تم میرے ساتھ چلو مقتل میں آئے، ایک کو حسینؑ بن علیؑ نے اُٹھایا، ایک کا لاشہ عباسؑ نے اٹھایا۔ لے کر چلے خیمہ میں لا کر درِ خیمہ کے قریب دونوں بچّوں کے لاشوں کو رکھ دیا۔ ایک مرتبہ فضّہ آئیں شہزادیؑ کے پاس، اور آ کے گذارش کی۔ چلئے آپ کے لال آئے ہیں، چلئے عونؑ و محمدؑ آئے ہیں۔

شہزادیؑ خاموش....!

فضّہ نے کہا، چلئے بی بی عونؑ و محمدؑ آئے ہیں۔ آپ کے لال واپس آئے ہیں۔

فرمایا، میں نہ جاؤں گی۔ میں نے کیا انھیں اس لیے بھیجا تھا

واپس آجائیں، میں نے تو بھیا پر قربان ہونے کے لیے بھیجا تھا؟

فضہ نے کہا بی بی چل کے ذرا دیکھ تو لیجیے۔

اب جو شہزادی آئیں، دیکھا بچّوں کے لاشے۔ ایک مرتبہ سر سجدہ میں رکھ دیا۔ پروردگار! تیرا شکر ہے کہ میرے بچّے، میرے بھیا پر قربان ہو گئے۔ بہن بھائی کے سامنے شرمندہ نہ ہوئی۔ شاباش میرے بچّو! تم نے میری تربیت کی لاج رکھ لی۔ تم نے ماں کو بھائی کے سامنے سرخرو بنا دیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

مجلس ۷

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ ۔ اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفس مطمئن پلٹ آ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے، ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔"

سورہ مبارکہ فجر کی ان آخری آیات کریمہ کے ذیل میں "کربلا شناسی" کے عنوان سے جو معروضات آپ کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے آج ان کے ساتویں مرحلہ پر انصار امام حسینؑ کے بارے میں کچھ باتیں آپ کے سامنے گذارش کرنا ہیں۔ مسائل سب تفصیل طلب ہیں اور وقت بہر حال مختصر اور محدود ہے اس لیے میں حسب روایات اپنی گفتگو کا ایک خاکہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ تفصیلات پر آپ غور کریں اور کتابوں کا مطالعہ کریں تاکہ واقعًا اس عظمت سے باخبر ہو سکیں جو عظمت اپنے کردار سے انصار حسینؑ بن علیؑ نے حاصل کی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ہر انسان کے ساتھیوں میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور بُرے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کچھ صاحبانِ کردار ہوتے ہیں جو کردار کی بنا پر اچھے لوگوں کے ساتھ آ جاتے ہیں اور کچھ صاحبانِ غرض ہوتے ہیں جو بڑی شخصیتوں سے اپنے مفادات کے لئے وابستہ ہو جاتے ہیں اور بڑی شخصیتوں کے

پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ نیتوں کو پہچاننے کے بعد بھی انھیں اپنے سے الگ نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جانتے ہیں کہ ان کے رہنے میں بھی فساد ہے اور الگ کر دینے میں بھی فساد ہے۔ مگر شاید الگ کر دینے میں فساد زیادہ ہوگا۔ ساتھ رکھنے میں اتنا بڑا فساد نہ ہوگا اس لئے کہ جب تک اپنے قبضہ میں رہیں گے کسی نہ کسی مقدار میں تو کردار کنٹرول میں رہے گا۔

یہ میں نے اس لیے گذارش کی ہے تاکہ میں اس کے بعد جو قرآن مجید کے آیات کریمہ کے ذیل میں تاریخ نصرت آپ کے سامنے پیش کروں تو کسی انسان کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ نعوذ باللہ ہم انبیائے کرامؑ کے ساتھ رہنے والوں سے یا انبیائے کرام کی محفل میں حاضر ہونے والوں سے کوئی خصوصی اختلاف رکھتے ہیں۔ نہیں۔ ہر نبی کے ساتھ، ہر ولی کے ساتھ اور دنیا کے ہر بڑے آدمی کے ساتھ دونوں طرح کے کردار ہمیشہ رہتے ہیں۔ جو اچھے کردار والے ہیں وہ بھی نظر آتے ہیں، جو بُرے کردار والے ہوتے ہیں وہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی اچھے کردار والے نمایاں ہو جاتے ہیں اور کبھی بُرے کردار والے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کبھی اچھے کردار والوں کا اچھا کردار نمایاں ہوتا ہے اور کبھی بُرے کردار والے بھی نیک کردار بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن مجید کو ایک مکمل سورہ نازل کر کے حقائق کو بے نقاب کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

جو تاریخ ہمارے سامنے پیغمبرانِ اولو العزم، اولیائے خدا، خاصانِ پروردگار اور ان کے ساتھیوں کی ہے اس میں ایک بڑا عجیب و غریب مرحلہ ہے جس کا عرض کرنا بھی بعض اوقات شاید مصالح کے خلاف ہو جائے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ قرآن مجید نے جب جب انبیاء کے ساتھیوں کا جن کو اصطلاحاً اصحاب کہا جاتا ہے یا ان کے مددگاروں کا یا ان کی محفل میں حاضر ہونے والوں کا تذکرہ کیا ہے تو کہیں یہ احتیاط نہیں برتی گئی ہے کہ جو اچھے ہیں ان کے تذکرے کو نقل کیا جائے اور جو بُرے ہیں ان کے تذکرے کو دبا دیا جائے، حالانکہ ہماری آپ کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اگر ہمارے ساتھ کچھ لوگ جو نامناسب افراد ہیں اور ساتھ لگ گئے ہیں اور ہمیں ان کا ساتھ رہنا اچھا نہیں لگتا ہے مگر مصلحتاً ہم ان کو ہٹانا بھی نہیں چاہتے ہیں، ان کو دور کرنا بھی نہیں چاہتے ہیں تو ہم

یہ نہیں چاہتے ہیں کہ جہاں ہمارا ذکر کیا جائے وہاں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جائے اس لیے کہ مبادا کسی کو ان کا ذکر سننے کے بعد ہمارے بارے میں غلط فہمی ہو جائے کہ یہ کیسے عالم دین ہیں جن کے ساتھ یہ جہلا لگے ہوئے ہیں۔ یہ کیسے نمازی، متقی، پرہیزگار ہیں جن کے ساتھ ایسے بدکردار لگے ہوئے ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ اگر غلط افراد کسی بنیاد پر آ گئے ہیں اور ہمیں یہ پسند نہیں ہیں تو ہمارے تذکرے کے ساتھ جو نیک کردار ہیں ان کا ذکر کیا جائے لیکن جو بُرے کردار والے ہیں ان کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا ذکر ہمارے واسطے باعث بدنامی ہو جائے۔ مگر نہ جانے کیا مصلحت کردگار ہے کہ پروردگار نے جب بھی اپنے نیک بندوں کا ذکر کیا ہے، ان کے ساتھ رہنے والے اگر نیک کرداروں کا ذکر کیا ہے تو ان کے ساتھ لگ جانے والے بدکرداروں کا بھی ذکر کیا ہے ورنہ کتنی آسان سی بات تھی کہ پروردگار عالم تذکرۂ آدمؑ میں ہابیل کے کمالات، ان کے تقویٰ، ان کے تقدس، ان کی پاکیزگیٔ نفس کا ذکر کرتا اور یہ بتاتا ہی نہیں کہ آدمؑ کا ایک بیٹا قابیل بھی تھا۔

اس لیے کہ ظاہر ہے کہ آج ہمارے ساتھ اتنی آسانی ہے اگر ہمارا کوئی بیٹا غلط نکل جائے نالائق نکل جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیا کریں ہم تو مجلسوں میں لگے رہ گئے وہ ظاہر ہے کہ لڑکوں کے ساتھ رہا۔ لوگوں کے ساتھ رہا۔ لوگوں نے بہکا دیا، گمراہ کر دیا۔ یعنی ہزار تاویل کر کے اپنا بھرم باقی رکھ سکتے ہیں مگر جناب آدمؑ کیا کہیں۔ اگر کوئی جناب آدمؑ سے پوچھے کہ آپ کا بیٹا نالائق، قاتل، اپنے بھائی کا خون بہانے والا ایسا نکل گیا تو جناب آدمؑ کیا کہیں؟ ماحول بہت خراب تھا۔ سوسائٹی بہت خراب تھی۔ اسکول کے لڑکوں نے گمراہ کر دیا۔ دفتر والوں نے بہکا دیا۔ وہاں تو نہ کوئی اسکول ہے نہ کالج ہے۔ نہ دفتر ہے نہ ماحول ہے۔ نہ سوسائٹی ہے۔ ایک باپ ایک ماں۔ وہ معصوم یہ پاکیزہ کردار خاتون۔ وہ نبی خدا خلیفۃ اللہ اور یہ بھی ایک انتہائی نیک کردار خاتون۔ ایسی جگہ پر رہنے والا انسان قاتل اور وہ بھی غیروں کا قاتل نہیں، اپنے بھائی کا قاتل نکل جائے تو ظاہر ہے کہ جناب آدمؑ سے اگر کوئی پوچھے تو کیا صفائی دیں وہ ہماری طرح کی تقریر تو نہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری طرح کے بہانے بھی نہیں بیان کر سکتے ہیں۔ مگر پروردگار عالم نے اس کے بعد بھی جہاں تذکرہ کیا وہاں یہ اعلان کیا کہ ہم آدمؑ کے دونوں

بیٹوں کا ذکر کر رہے ہیں" اذ قربا قربانا" جب دونوں نے قربانی پیش کی اور اس کے بعد اگر ہابیل کے نیک کردار ہونے کا ذکر ہے تو قابیل کے بدترین کردار اور اس کی سفاکیت اور جلادیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی قدرت یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ چاہے تمہیں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ایک ایسا نیک بندہ بھی تھا کہ جس کا بیٹا نالائق نکل گیا مگر ہم روز اول سے اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ کوئی رشتوں کے دھوکہ میں نہ آجائے، کسی کو یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ اب تو یہ نبی کا بیٹا ہے اس کو تو مقدس ہونا ہی چاہیے۔ نہیں ہر ایک کے کردار کو الگ الگ جانچ کے دیکھو، ہر ایک کے کردار کو پرکھ کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ آدمؑ جیسے معصوم کا بیٹا ہو مگر نالائق ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ کسی نالائق باپ کا بیٹا ہو مگر ایسا ہو جو اپنا بنا لینے کے قابل ہو۔

لہٰذا تاریخ جناب آدمؑ میں اللہ نے جناب آدمؑ کے اس بیٹے کا تذکرہ بھی کیا جو قاتل تھا، سفاک تھا، خوں ریز تھا، جلاد تھا، نااہل تھا۔ اس کے بعد تاریخ جب آگے بڑھی؛ جب جناب نوحؑ کا ذکر آیا تو وہاں بھی اللہ نے ایک تذکرہ اور بڑھا دیا۔ اور جب نالائقوں کا تذکرہ شروع کیا تو ایک تذکرہ اور بڑھا دیا۔ اب صرف نوحؑ کے بیٹے کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کہتا ہے۔ پروردگار عالم نے یہ دو مثالیں بیان کی ہیں" اِمْرَاَتُ نُوْحٍ وَّامْرَاَتُ لُوْطٍ" (نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی زوجہ) "کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ" (یہ ہمارے دو نیک کردار بندوں کے گھر میں تھیں) "فَخَانَتٰهُمَا" (انھوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی) "فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا" (تو زوجیت سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا)۔

تو پروردگار! اگر نوحؑ کا بیٹا نالائق نکل گیا تھا تو اسی کے تذکرہ کو دبا دیا ہوتا اور اگر بیٹے کا ذکر نہیں دب سکتا تھا اور نالائق نے دبنے ہی نہیں دیا کہ کہیں پستی میں ڈوب گیا ہوتا تو شاید بات دب جاتی مگر پہاڑ پر جا کر خود ہی اپنے کو نمایاں کر دیا ہے تو اب کہاں کیسے کوئی دبائے۔ پہاڑ تک اگر نہ گیا ہوتا تو ہم جیسے بااخلاق لوگ کوئی نہ کوئی تو دبانے کا انتظام کر ہی لیتے مگر پہاڑ پر جا کر اپنے کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کو دبا دینا نہ ہمارا

کام ہے نہ آپ کے بس کا کام ہے۔ نہ تاریخ یہ کام کرسکتی ہے نہ محدث یہ کام کرسکتا ہے۔ اب اس کو دبانا تو ایک موجوں کے بس میں تھا انھوں نے دبا دیا۔ ایک طوفان کے امکان میں تھا اس نے دبا دیا تو خیر نوحؑ کا بیٹا تو نمایاں ہوگیا تھا وہ نمایاں رہ جاتا مگر جو بات پردہ کی تھی وہ تو پردہ میں رہ جاتی۔ زوجہ کا ذکر تو قرآن میں نہ آتا کہ زوجہ بھی نالائق تھی اس نے کردہ تو واقعتاً بات پردہ کی تھی تو پردہ کی بات پردہ ہی میں رہ جاتی، مگر پروردگار عالم نے کہا اگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس سے نسبی رشتہ ہے۔ اگر میں نوحؑ کے بیٹے کا ذکر کرکے یہ اعلان کرسکتا ہوں کہ جس سے نبی کا نسبی رشتہ ہے وہاں نسبی رشتہ کردار کی ضمانت نہیں بن سکتا ہے تو زوجہ سے تو کوئی نسبی رشتہ بھی نہیں ہوتا ہے وہ تو سببی رشتہ ہوتا ہے۔ آج قائم ہوا کل ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ لازم نہیں ہے کہ ٹوٹ جائے مگر ٹوٹ بھی سکتا ہے مگر بیٹا، چاہے بیٹا مرجائے، چاہے باپ مرجائے، رشتہ نہ ٹوٹتا ہے اور نہ ٹوٹنے والا ہے اسی لیے آج تک اس نالائق کو نوحؑ کا بیٹا ہی کہتے ہیں۔ اتنی دیر سے میں پسرِ نوحؑ ہی کا ذکر کر رہا ہوں۔ یعنی اتنا زمانہ گذر گیا، ہزاروں سال گذر گئے وہ ڈوب گیا۔ مگر کہا جاتا ہے کہ پسرِ نوحؑ۔ یہ رشتہ ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ مگر زوجیت کا رشتہ تو اتنا آسان ہے کہ دو لفظوں میں آتا ہے اور دو لفظوں میں چلا جاتا ہے۔ بلکہ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ آنے میں لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے جانے میں تو اتنی ضرورت بھی نہیں ہوتی ہے۔ خالی غصہ آجائے دو پتھر بھی توڑ دو۔ جب بھی یہ کام ہو ہی جائے گا۔ تو ایک ایسا رشتہ جو اتنی آسانی سے ٹوٹ جاتا ہو اس کی نسب کے مقابلہ میں کیا اہمیت ہے۔ اس کا کیا وزن ہے۔ تو ظاہر ہے کہ پسرِ نوحؑ کا تذکرہ اس بات کی علامت ہے کہ ایمان و کردار نہیں تو نسبی رشتہ بیکار ہے اور زوجۂ نوحؑ کا تذکرہ اس بات کی علامت ہے کہ ایمان اور کردار نہیں تو سببی رشتہ بھی کام آنے والا نہیں ہے۔

تو پروردگار عالم نے جب ہر جگہ دونوں طرح کے تذکرے کیے ہیں اور دامنِ قرآن میں ان کرداروں کو محفوظ کردیا ہے تو ایک خالی ہم ہی سے کیا مطالبہ ہے کہ جتنے اچھے کردار ہیں بیان کیجیے اور جو نالائق ہیں ان کا ذکر نہ کیجیے

یہ آج ایک نیا فلسفہ نکلا ہے۔ گو حضورؐ کے ساتھ کچھ منافقین لگ گئے تھے جن کو تاریخ پہچانتی ہے اور نہیں پہچانتی ہے تو قرآن پہچنوا رہا ہے " اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ " ان کا تذکرہ چھوڑ دو۔ ان کی بات نہ کرو، ورنہ حضور کی بدنامی ہو جائے گی کہ یہ کیسے پیغمبر تھے کہ ان کے ساتھ منافقین آ کے بیٹھ جاتے تھے۔ میں نے کہا بھائی اگر بدنامی کا راستہ یوں ہی کھل گیا تو یہ خالی ایک پیغمبرؐ کی بات نہیں ہے۔ خدا سے پوچھو کہ اگر زوجہ نوحؑ و لوطؑ کا ذکر آ گیا تو دنیا کہے گی کہ یہ کیسے پیغمبرؐ تھے کہ ان کی زوجہ ایسی تھی۔ جب پسر نوحؑ اور پسر آدمؑ کا ذکر آئے گا تو دنیا کہے گی یہ کیسے پیغمبرؐ تھے جن کا بیٹا ایسا ہو گیا۔ جب کعبہ میں بتوں کے قبضہ کا ذکر آئے گا تو دنیا کہے گی یہ کیسا اللہ کا گھر ہے جس میں بت آ کے بیٹھ گئے۔ جب آسمان پر ملائکہ کا ذکر آئے گا تو دنیا کہے گی کہ یہ کیسے معصوم فرشتے تھے کہ ابلیس ان کے ساتھ آ کے بیٹھ گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کو پاکیزہ کردار کہو کہ ملک بدنام نہ ہونے پائے۔ بتوں کو خدا کہہ دو تاکہ کعبہ بدنام نہ ہونے پائے۔ بدکرداروں کو نیک کردار کہہ دو تاکہ نیک کردار بدنام نہ ہونے پائیں۔

یہ تو ایک انتہائی بچکانہ مطالبہ ہے۔ طفلانہ فکر ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن پروردگار عالم نے یہ چاہا کہ انسانیت کو ہوشیار کر دیا جائے اور انسان کو بتا دیا جائے کہ جس کردار کو دیکھنا ہو اس کا اپنا کردار دیکھو اس کے اپنے اعمال دیکھو، اس کا اپنا ایمان دیکھو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسبی شرافت ایک شرافت ہے مگر اس کے بچانے کی ذمہ داری خود صاحب نسب پر ہے۔ سببی شرافت بھی ایک شرافت ہے کسی بڑے شوہر کی زوجہ ہونا کوئی معمولی کام نہیں ہے یا کسی بڑی زوجہ کا شوہر ہونا یہ بھی کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ کتنے شوہر اپنی زوجہ سے پہچانے جاتے ہیں، اور کتنی زوجہ اپنے شوہر سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ اپنا اپنا مقدر ہے۔ یہ بھی ایک شرف ہے انسان کا، مگر اس شرف کا بچانا اس شوہر کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اس شرف کا بچانا اس زوجہ کی اپنی ذمہ داری ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ ہر اچھی زوجہ کے شوہر کو نیک کردار بنائیں یا ہر اچھے شوہر کی زوجہ کو پاکیزہ کردار بنائیں۔ یہ اس شوہر یا زوجہ کی

ذمہ داری ہے کہ اگر بن جائے گا تو ہم اس کے نیک کردار کا اعلان کر دیں گے، اور نہیں بنے گا تو ہم اعلان نہ بھی کریں تو ہمارے نہ کہنے سے وہ پاکیزہ کردار نہیں ہو جائے گا ہر دَور میں دونوں طرح کے کردار رہے ہیں انبیاءؑ کے ساتھ، اولیاء کے ساتھ، مرسلین کے ساتھ، خاصانِ خدا کے ساتھ، ہر جگہ دو طرح کے کردار رہے ہیں اور قرآن مجید نے دونوں طرح کے کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ میں ساری تفصیلات نہیں گذارش کروں گا۔

اسی لیے میں نے یہ تمہید عرض کی ہے تاکہ اس نکتہ کو روزِ اوّل آپ ذہن میں رکھیں کہ ہر اچھے انسان کے ساتھ، ہر بڑے انسان کے ساتھ، نبی کے ساتھ، ہر ولی کے ساتھ "کَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا" ہر نبی کے ساتھ دشمن لگے ہوتے ہیں، شیاطین جن، شیاطین انس، ہر طرح کے لوگ۔ تو ہر اچھے انسان کے ساتھ دونوں طرح کے لوگ پائے گئے، اور قرآن مجید نے بار بار دونوں طرح کے انسانوں کا ذکر کیا تاکہ انسان ہوشیار رہے اور اسے معلوم رہے کہ آدمؑ بہترین تھے مگر ان کا ایک بیٹا نالائق تھا۔ نوحؑ بہترین تھے مگر ان کا بیٹا اور ان کی زوجہ نالائق تھی اور آگے جہاں تک آپ چلے جائیں گے تذکرے آپ کو دونوں طرح کے ملیں گے۔ میں ساری تاریخ اگر قرآن کی سناؤں گا تو شاید دس بیس دن بھی کم پڑ جائیں گے۔ ایک گھنٹہ کی ایک تقریر میں تو یہ مسائل حل بھی نہیں ہو سکتے ہیں، لیکن اب ان دونوں تذکروں کے ساتھ میں جلدی جلدی آپ کو دو چار مواقع سُنا دینا چاہتا ہوں جو قرآن مجید میں ہیں تاکہ نہ تاریخ کا جھگڑا رہے، نہ حدیث کا۔ حدیث میں ایک پریشانی یہ ہے کہ ضعیف ہے یا قوی۔ معتبر ہے یا غیر معتبر۔ تاریخ میں جھگڑا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی ہے یا اُن کی لکھی ہوئی ہے۔ قرآن تو اللہ ہی کا لکھا ہوا ہے جس کو ماننا ہو مانے، نہ ماننا ہو نہ مانے۔ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں نہ کوئی آیت اِن کی لکھی ہوئی ہے، نہ کوئی آیت اُن کی لکھی ہوئی ہے۔ قرآن مجید کا تقدس یہ ہے کہ اس میں ایک کلمہ کا نہ اضافہ ہوا ہے اور نہ ایک کلمہ کی کمی ہوئی ہے اور نہ ہو سکتا ہے "اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" اگر یہ دو دو پیسہ کے انسان، اگر یہ معمولی انسان، یہ جاہل انسان، اگر یہ حافظِ قرآن ہوتے واقعاً سب بدل گیا ہوتا لیکن خدا نے کہا ہے تو حافظِ قرآن

اس کے واقعی حافظ تو ہم ہیں۔ اس کے واقعی حفاظت کرنے والے ہم ہیں۔ یہ حفظ کر کے حافظ بنتے ہیں، ہم حفاظت کر کے حافظ ہیں۔ لہٰذا قرآن کے حافظ حقیقی ہم ہیں، بچانے والے ہم ہیں۔ نہ اس میں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے نہ کمی ہو سکتی ہے۔

اگر کہیں تم سنو۔ اگر کہیں یہ باتیں تمہارے سامنے آئیں چاہے تاریخ میں ہوں چاہے حدیث میں ہوں، چاہے صحیح کتاب میں ہوں چاہے غلط کتاب میں ہوں جہاں ایسی کوئی بات آئے سمجھو جھوٹ ہے۔ اگر کتاب صحیح بھی ہے تو بات غلط ہے۔ جہاں قرآن مجید میں کمی یا زیادتی کی بات کی جائے وہ یقیناً غلط ہے۔ یقیناً مہمل ہے۔ اسلام میں کوئی گنجائش اس بات کی نہیں ہے کہ قرآن مجید میں ایک لفظ کے اضافہ کا عقیدہ پیدا کیا جائے یا ایک لفظ کی کمی کا عقیدہ پیدا کیا جائے۔

انسان یہ کام نہیں کر سکتے ہیں، جانور بے چارے کیا کریں گے۔

بعض نادان تو یہاں تک سوچ لیتے ہیں کہ جانوروں نے قرآن کو کم کر دیا ہے۔ استغفراللہ انسانوں کے بس کا کام نہیں۔ سلاطین کے بس کا کام نہیں ہے۔ حکام کے بس کا کام نہیں ہے۔ جنھوں نے سب کچھ بدل ڈالا وہ بھی قرآن کو نہ بدل سکے۔ جنھوں نے ساری دنیا میں طرح طرح کے انقلابات پیدا کر دئے وہ بھی قرآن مجید میں کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکے۔ اس کا محافظ حقیقی اور اس کا حافظ حقیقی پروردگار ہے۔

تو قرآن مجید میں تذکرے جو موجود ہیں ان کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ایک لفظ ہے اگر آپ متوجہ ہو جائیں۔ پڑھیے قرآن مجید تذکرہ جناب آدمؑ کے ساتھ تو اصحاب کا ذکر آتا بھی نہیں ہے اس لیے کہ ان کے ساتھ کہاں ساتھی، ان کے ساتھ کہاں مخلصین یا منافقین، دو بیٹے تھے ایک کا حال وہ اور ایک کا حال یہ۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے جناب شیثؑ جیسا بیٹا دیا اور نسل آدمؑ آگے بڑھ گئی۔ لیکن اس کے بعد جو نمایاں تاریخ اور نمایاں تذکرہ قرآن مجید میں ملتا ہے انبیاء میں وہ جناب نوحؑ کا تذکرہ ہے کہ جناب نوحؑ کے ساتھ جو افراد تھے طوفان کو دیکھا۔ پانی اُبل رہا ہے، پانی برس رہا ہے۔ قیامت آ رہی ہے۔ ایسے حالات میں یہ ایک لکڑی کی کشتی کیا کرے گی۔

اس طوفان سے یہ لکڑی کی کشتی کیا بچائے گی۔ یہ بھی سوچتے رہ گئے۔ اور جتنی دیر میں سوچتے رہے اتنی دیر میں طوفان نے اپنا کام کر دیا۔ لیکن کچھ وہ تھے جنھوں نے لکڑی کی کشتی سہی، چھوٹی سہی، معمولی سہی، مگر اعتبار کیا۔ بنانے والا نبی اور بن رہی ہے حکم خدا سے۔ خود یہ بھی قرآن مجید میں ہے کہ اللہ نے جناب نوحؑ کو وحی بھیجی "اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ" کشتی بناؤ کیسے بناؤ۔ ہمارے اشارہ سے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے۔ ہماری نگرانی میں تو بنوانے والا خدا اور بنانے والا نبی۔ یہی راز تھا نجات دلانے کا، یہی راز تھا جو کشتی وجہِ نجات بن گئی، ورنہ جو جہاں تھا سب ڈوب گئے، سب ہلاک ہو، برباد ہو گئے۔ مگر جو کشتی میں آگئے وہ نجات پا گئے اور قرآن مجید نے جو اب نجات کا اعلان کیا تو یہ ایک لفظ ہے میری طرف سے یاد رکھیے گا۔ میرا لفظ نہیں قرآن کا ہے۔ لیکن جس رُخ کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں اس طرف متوجہ رہیں۔ کتنے ڈوبے۔ مجھے نہیں معلوم۔ کتنے ہلاک ہوئے۔ مجھے نہیں معلوم۔ یہ معلوم ہے کہ جو بچے ہیں وہ اقلیت میں تھے۔ یہ طے ہے جو بچ گئے ہیں وہ اقلیت میں تھے۔ جو ڈوبے ہیں وہ اکثریت میں تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا ہے اور طوفانِ نوحؑ آج تک آواز دے رہا ہے کہ اکثریت کے دھوکہ میں نہ رہنا۔ اکثریت کے غرور میں نہ رہنا۔ نوحؑ کے ساتھیوں کا حشر دیکھ لیا۔ اب جو آگئے وہ بچ گئے مگر جب ان کے بچ جانے کا ذکر قرآن مجید نے کیا تو لفظیں بدل دیں "فَاَنْجَيْنٰهُ" ہم نے نوحؑ کو بچالیا۔ اس کے بعد میں منتظر تھا کہ شاید پروردگار "فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحَابَهٗ" کہے گا کہ ہم نے نوحؑ کو اور اصحابِ نوحؑ کو بچالیا مگر اب جو قرآن دیکھا تو لفظیں بدل گئیں یہ نہیں ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اور ان کے اصحاب کو بچالیا۔ نہیں "فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ" ہم نے نوحؑ کو نجات دی اور سفینہ کے اصحاب کو بچالیا۔ تو سفینہ کسی پیغمبر کا نام تو نہیں ہے۔ سفینہ کسی ولیِ خدا کا نام تو نہیں ہے۔ سفینہ ایک کشتی ہے۔ تو جو سفینہ پر آگئے تو وہ نوحؑ ہی کے اصحاب تو ہیں۔ پروردگار نے کہا۔ ہیں تو انھیں کے اصحاب۔ لیکن جب نجات کا اعلان کروں گا تو اصحابِ نوحؑ کہہ کر نہیں۔ اصحاب نبی کہہ کر اعلان نہیں کروں گا۔ اصحاب سفینہ کہہ کر اعلان کروں گا تاکہ قرآن پڑھنے والے جب نجات تلاش کریں تو پہلے اپنے کو اصحاب

بعد نجات تلاش کریں۔ اب میں کہوں گا سرکارِ دو عالمؐ! اگر ہم اصحاب سفینہ میں شامل ہونا چاہیں تو ہم کیا کریں۔ پیغمبرؐ نے کہا "مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِی کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوحٍ" میرے اہل بیت کی مثال سفینۂ نوحؑ کی ہے۔ اگر اصحابِ سفینہ بننا چاہتے ہو تو آجاؤ۔ اس کشتی نجات پر سوار ہو جاؤ۔ نجات تمہارے واسطے ہے۔

تو نجات روزِ اوّل جناب نوحؑ ہی کے اصحاب کے لیے تھی، کسی غیر کے اصحاب کے لیے نہیں۔ مگر وہ اصحابِ نوحؑ جن کو قرآن نے اصحابِ سفینہ بنادیا ہے تو جب نجات دینے کا اعلان کرنا ہوا تو جب تک اصحابِ نبی کو اصحابِ سفینہ نہ بنادیا اس وقت تک نجات کا اعلان نہیں کیا۔ ہم آج اسی اعلان کو دُہرا رہے ہیں اور جو قرآن مجید نے کہا ہے وہی کہہ رہے ہیں۔ جو قرآن نے سکھایا ہے وہی ہم نے سیکھ لیا ہے۔ اب کسی نے قرآن سے ہٹ کے کوئی طریقہ توریت یا انجیل سے سیکھا ہو تو ہمیں نہیں معلوم ہے۔ قرآنی طریقہ یہی ہے کہ جب نجات کا اعلان ہوتا ہے تو اصحابِ سفینہ کہہ کر اعلان ہوتا ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اچھے بھی تھے، بُرے بھی تھے مگر جو اصحاب میں اصحابِ سفینہ نہ بن سکے وہ غرق ہو گئے اور جو سفینہ والے بن گئے وہ نجات پا گئے۔

دوسرا ذکر قرآن مجید نے کیا جناب موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کا جب جناب موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر چلے شرِ فرعون سے بچانے کے لیے اور فرعون نے تعاقب کیا۔ اب آگے آگے موسیٰؑ اپنے ساتھیوں کے ساتھ، پیچھے پیچھے فرعون اپنے لشکر کے ساتھ۔ چلتے چلتے وہ جگہ آگئی جہاں سامنے دریا دکھائی دیا۔ اب اصحاب موسیٰؑ کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ آگے دریا پیچھے فرعون اب جائیں کہاں۔ ہر بیچارے فوجی کے واسطے یہی پریشانی ہوتی ہے کہ میدانِ جنگ میں جانے کے بعد آگے بڑھے تو اُدھر والے ماریں گے اور پیچھے ہٹے تو اِدھر والے۔ یہ بھی ایک قانون ہے کہ فوجی کو بھاگنے کا اختیار نہیں ہے۔ اگر کوئی فوجی محاذِ جنگ پر جانے کے بعد بھاگنے کا ارادہ کرے تو جو کمانڈر یا ذمہ دار ہوتا ہے وہ

نے جو آپ کو حرام کی روٹی کھلائی ہے جائیے معاف کر دیں گے۔ ایسا کوئی قانون نہیں ہے اگر آپ بچ کر بھاگنا چاہیں گے تو جو آپ ہی والے ہیں وہی آپ کو زندہ نہیں جانے دیں گے اس لیے کہ ہم میدان تک لے آئے ہیں ملک کو بچانے کے لیے۔ ملک کے لیے قربانی دینے کے واسطے۔ آگے بڑھو۔ چاہے مارے جاؤ، ہم بھاگنے نہیں دیں گے۔ آج ساری دُنیا کا قانون یہی ہے۔ آج کوئی حقِ نمک کو فراموش کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جب تک کھانے کا وقت آئے اطمینان سے کھاتے رہو اور جب میدان میں لڑنے کا وقت آئے تو جب چاہے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ آج دنیا میں کہیں کسی ڈیفنس منسٹری میں اتنی گنجائش نہیں پائی جاتی ہے لہٰذا انسان آئے میدانِ جہاد میں تو جہاد کرے۔

اب جو اصحاب موسیٰؑ چلے تو ان کے لیے ایک پریشانی پیدا ہو گئی کہ پیچھے ہٹیں تو لشکرِ فرعون آرہا ہے، آگے جائیں تو گویا ان کے خیال میں ڈوب مریں۔ اب کیا کریں۔ لہٰذا گھبرا گئے۔ اب قرآن مجید نے یہیں پر اس لفظ کو دوہرایا ہے۔ گھبرا کے اصحابِ موسیٰؑ نے موسیٰؑ سے کہا، "مُوسیٰ اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ" موسیٰؑ! ہم تو پکڑے جائیں گے۔ اب تو ہم فرعونیوں کی گرفت میں آگئے اس لیے کہ آگے جانے کا راستہ نہیں ہے اور پیچھے جائیں کہاں۔ فرعون آرہا ہے۔ ہم پکڑے جائیں گے یعنی ساری پریشانی یہ ہے کہ دشمن کے قبضہ میں آجائیں گے۔ دشمن کے محاصرہ میں آجائیں گے۔ دشمن کے گھیرے میں آجائیں گے تو آجاؤ گے تو آجاؤ مار ہی تو ڈالے گا۔ ایمان تو نہیں چھین لے گا۔ صحابیت تو نہیں چھین لے جائے گا۔ کردار تو نہیں چھین لے جائے گا۔ ارے جان ہی تو لے جائے گا، جانے دو جان کو۔ ایک دن اس کو جانا ہے ہی۔ آج نہیں تو کل مر جاؤ گے۔ غنیمت جانو کہ ایمان کی راہ میں مرو گے۔ کردار کی راہ میں مرو گے۔ صحابیت کی راہ میں مرو گے مر جانے میں کیا پریشانی ہے۔ مگر گھبرا کے کہا موسیٰؑ اب بچانے کی کوئی تدبیر کرو۔ یعنی آئے ہیں موسیٰؑ کے ساتھ مگر فکر فقط اپنی جان کی ہے۔ جناب موسیٰؑ نے نیل میں راستے بنا دیے حکمِ پروردگار سے۔ اور بچ کے نکل گئے۔ خوش ہیں الحمد للہ۔ جان بچ گئی۔ غور کیا آپ نے؟ یہ خوشی ہے کاہے کی۔ کہ جان بچ گئی۔ یعنی یہ پرانے دور ... چلا آ ...

رہو فکر خالی اپنی جان کی رکھو۔

تو "قَالَ اَصْحَابُ مُوسٰی" اصحابِ موسیٰؑ نے کیا کہا "اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ" اب تو ہم گرفت میں آ گئے۔ گھیرے میں آ گئے۔ پکڑ جائیں گے۔ ظالم تو پہنچ ہی رہے ہیں۔ بس ہمیں لے لیں گے۔ اب کیا کریں گے؟ موسیٰؑ نے بچانے کا ایک راستہ بنا دیا، وہ بھی عجیب راستہ بنایا۔ دریا میں راستہ بنایا۔ اور بارہ راستے بنائے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہی بچنے کا راستہ ہے کہ اس میں کچھ کمی بیشی نہیں ہو سکتی ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر کے لیے سہی، لوگ بچ کر نکل گئے۔ اب اس کے بعد جو بھی ان کا حشر ہو گا خدا بہتر جانتا ہے۔ خوف، پہچان ہے اصحابِ موسیٰؑ کی یعنی کچھ افراد کی جن کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے۔ خوف کے اعتبار سے۔

اب آئیے ذرا حرص، لالچ اور طمع کو دیکھیں کہ قارون نے اپنا جلوس نکالا اب جو چلا ستر اونٹوں پر جس کے خزانوں کی کنجیاں لادی جاتی ہوں کس شان سے، کس جاہ و جلال سے جلوس نکلا۔ اُدھر قارون اپنا جلوس لے کر جا رہا تھا اپنی دولت، اپنی ثروت، اپنے مال، اپنے جاہ کا مظاہرہ کرنے کے لیے، اِدھر نبی خدا حضرت موسیٰؑ بن عمران کے اصحاب کرام نے دیکھا "یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ" اے کاش یہی مال ہم کو مل جاتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ ارے دیکھو کتنا نصیب والا ہے۔

ڈوب مرو۔ تم صحابی وہ پیسہ والا۔ وہ تم کو نصیب والا دکھائی دے رہا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ قارون کے لشکر والے کہتے ہائے کیا مقدر ہمارا ہے۔ ہماری قسمت میں خالی پیسے لکھے ہوئے تھے۔ یہ موسیٰؑ کے صحابی بن گئے۔ اے قارون نالائق کمبخت تیرے ساتھ آنے کے بعد ہم کو کیا ملا۔ یہ مالِ دنیا جو کل فنا ہو جائے گا۔ یہ موسیٰؑ کے صحابی ہو گئے ہیں۔ صحابیت تو نجات دلاتی ہے۔

بجائے اس کے کہ قارون والے کہتے کہ مقدر اُن کا ہے کہ جن کو شرفِ صحابیت مل گیا ہے۔ ہماری قسمت میں تو خالی مال تھا اُدھر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ آواز اس پارٹی

سے آرہی ہے۔ اِس جماعت سے کاش ہم کو وہ مال مل جاتا۔ اور کیا سند دی ہے لشکر قارون کو اصحابِ موسیٰؑ نے "اِنَّہٗ لَذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ" بڑے نصیب والا ہے۔ یہ حضرات جو جناب موسیٰؑ کے ساتھ ہیں ان کو بڑا نصیب کہاں دکھائی دیا، مالِ دنیا میں۔ اب آپ نے پہچان لیا ان ساتھیوں کو۔ ان کو وہی بڑا دکھائی دیتا ہے جو مالدار ہو۔ اردو زبان میں۔ عربی زبان میں اسی کو غنی کہا جاتا ہے۔

یہ دولت وطمع وحرص کے اعتبار سے عالم ہے اور طاقت کے اعتبار سے وہ عالم ہے۔ پیسہ سامنے آجائے تو یہ قارونی بننے کے واسطے بھی بے چین ہو جائیں۔

اب میں یہیں پر ایک لفظ کہوں گا جو برابر آپ سنتے رہتے ہیں صرف ایک اشارہ ہے لیسے آپ پہچان لیں گے۔ جناب موسیٰؑ جب کوہِ طور پر گئے تو جناب موسیٰؑ نے اپنی جگہ پر جناب ہارونؑ کو چھوڑا اور چلے گئے۔ کیوں چلے گئے؟ قوم کے درمیان ہارون کو ذمہ دار بنا کے گئے یعنی گویا موسیٰؑ یہ چاہتے ہیں کہ جو میری قوم ہے جو میرے اصحاب ہیں۔ میں کہیں بھی رہوں یہ قوم میں رہیں۔ اپنے گھر میں رہیں اور ہارونی بن کے رہیں اسی لئے تو ہارونؑ کے حوالے کر کے گئے تھے۔ ہارونؑ کو ذمہ دار بنا کے گئے تھے تو موسیٰؑ یہ چاہتے تھے کہ ہمارے اصحاب اور ہماری قوم ہارونی بن کے رہے۔ اصحاب کی آرزو کیا ہے کہ جئیں تو قارونی بن کے جئیں۔ غور کیا آپ نے؟ اسی لئے قرآن مجید نے تنقید ضروری سمجھی اور اس تذکرہ کو بیان کرنا اور محفوظ رکھنا ضروری سمجھا تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ نیک کردار اور اچھے لوگ اور بڑی صحبتوں میں رہنے والے قارونی ہونے کو پسند نہیں کرتے ہیں ہارونی ہونے کو پسند کرتے ہیں۔

تو اے سرکارِ دو عالمؐ اب ہم کو تو معلوم ہو گیا کہ جو صناد ید قریش کے ساتھ چلے جائیں گے، جو مکہ کے دولت مندوں کے ساتھ چلے جائیں گے وہ تو قارونی ہو جائیں گے۔ آپ نے کوئی ہارونی بنانے کا بھی انتظام کیا ہے تو پیغمبرؐ آواز دیں گے۔ ہاں ہاں۔ میں انتظام کر کے جا رہا ہوں "یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی" اے علیؑ! تم میرے لیے ویسے ہی ہو جیسے موسیٰؑ کے لئے ہارون تھے۔ اب جسے جسے ہارونی بننا ہے وہ علیؑ والا بن جائے۔

یہ تیسرا تذکرہ۔ چوتھا تذکرہ! بس جلدی جلدی دو ہی لفظ...

ورنہ تذکرے تو بہت ہیں۔

قوم کو ظالموں نے اپنے ظلم سے پریشان کیا اور قوم نے وقت کے نبی سے آ کر کہا آپ پروردگار سے دعا کریں کہ پروردگار کوئی سردار لشکر ہمارے لیے فراہم کر دے اور ہم اس کے ساتھ جا کر اس ظالم سے جنگ کریں اس لیے کہ یہ ظالم ہم کو جینے نہیں دے گا۔ ہم کو رہنے نہیں دے گا۔ نبی خدا نے کہا گھبراؤ نہیں "اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ" اللہ نے تمہارے واسطے طالوت کو بادشاہ بنا کے، سردار بنا کے بھیج دیا ہے۔ اب جاؤ طالوت کے ساتھ مل کر جنگ کرو۔ ان کے ساتھ جنگ کرو گے تو خدا تمہیں فتح دے گا اور اس ظالم کے شر سے نجات پا جاؤ گے۔

لوگوں نے سوال اٹھا دیا کہ یہ طالوت کو بنا کے خدا نے بھیج دیا "اَنّٰی یَکُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا" یہ کیسے سردار ہو جائیں گے، یہ کیسے حاکم ہو جائیں گے "وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ" ان کے پاس تو مال نہیں ہے۔

وہی مال۔ ان کے پاس تو مال نہیں ہے۔ نبی خدا نے سمجھایا ارے مال کی کیا بات ہے "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَیْكُمْ" اللہ نے چُنا ہے۔ عجیب بات ہے کہ نبی سمجھا رہا ہے کہ شرف یہ ہے کہ اللہ نے چنا ہے۔ قوم یہ سوچ رہی ہے کہ شرف یہ ہے کہ پیسے والا ہو۔ پیسے والا ہے تو سب کچھ ہے۔ چاہے کسی نے چُنا ہو۔ غور کیا آپ نے؟۔ اور اگر پیسے والا نہیں ہے تو اللہ کے چُننے کا بھی اعتبار نہیں ہے۔ یہ حال قوم کا ہے۔ نبی نے سمجھایا اگر مال نہیں ہے تو گھبرانے کی بات نہیں ہے "زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" اللہ نے جسم کی طاقت بھی دی ہے اور علم کی وسعت بھی دی ہے۔ اب کیا کمی ہے۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جب کسی قیمت پر کچھ افراد تیار بھی ہو گئے جہاد کرنے کے واسطے اور جناب طالوت اس لشکر کو لے کر چلے "فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ" طالوت لشکر کو لے کر چلے۔ جب لے کر چلے تو وہی صورت حال جو بعینہ موسیٰؑ کی تھی۔ جب موسیٰؑ ساتھیوں کو لے کر چلے تو آگے دریا آ گیا۔ اِدھر جب طالوت ساتھیوں کو لے کر چلے تو سامنے دریا آ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ چلتے چلتے، گرمی کا زمانہ شاید رہا ہو گا لوگ پیاس سے بے دم۔ اب پہنچے دریا

کے کنارے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جہاں آدمی پانی پر ٹوٹ پڑے۔ اس لیے کہ پیاسے آدمی کو پانی مل جائے تو اور کیا چاہیے۔ جیسے ہی پانی کے قریب پہنچے ویسے ہی جناب طالوت نے آواز دی "اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ" ساتھیو ذرا ہوشیار رہنا، یہ دریا پانی کا دریا نہیں ہے۔ یہ امتحانی دریا ہے۔ یہ آزمائش کا دریا ہے۔ یہاں تمہارا امتحان ہونے والا ہے۔ "فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي" اگر کسی نے پانی پی لیا تو پھر اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کتنا عظیم امتحان ہے اگر پانی پی لیا تو "فَلَيْسَ مِنِّي" مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ "وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ" اور جو نہ پیے گا وہی میرا ہوگا "اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ" ہاں ایک چلو پانی کوئی لے لے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر پانی پی لیا تو مجھ سے نہیں ہوگا یہ امتحانی دریا ہے۔ یہ آزمائش کی منزل ہے۔ اب قرآن مجید نے پھر ساتھیوں کا ذکر کیا کہ اتنی وضاحت کے بعد پیو گے تو مجھ سے رشتہ ٹوٹ جائے گا، اللہ والوں سے رابطہ ختم ہو جائے گا، نہیں پیو گے تو میرے کہے جاؤ گے مگر اس کے بعد بھی "فَشَرِبُوا" سب نے پانی پی لیا۔ یعنی بھائیو! پانی پی لو نبی والے رہیں چاہے نہ رہیں۔ اپنا پیٹ بھر لو۔ چاہے اللہ والے رہیں چاہے نہ رہیں۔ بتائیے جب اتنے نالائق افراد ہوں تو ان کا ذکر قرآن کیسے محفوظ نہ کرے اس لیے کہ اگر یہ تذکرے محفوظ نہ ہوں گے تو نیک کردار کیسے پہچانے جائیں گے۔

یہ ایک تذکرہ۔ بس بات آخری مرحلہ پر لے آیا یہ تو پرانے تذکرے ہیں جو قرآن مجید نے محفوظ کیے ہیں۔

آیت مذکورہ جو خود قرآنی دور کا ذکر ہے "اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ" اے نبیؐ والو! تم بھی ذرا اپنے کو پہچان لو۔ جب تم بلندیوں پر پہاڑ کی طرف جا رہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو دیکھتے نہیں تھے "وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ" اور پیغمبر پیچھے آواز دے رہا تھا۔ ارے آؤ، آؤ، آؤ پلٹ آؤ، چلے آؤ اور کوئی مڑ کر دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

تو اصحابِ نوحؑ کا حال دیکھا آپ نے۔ اصحابِ ابراہیمؑ کی کیفیت دیکھی اصحابِ موسیٰؑ کا ذکر قرآن نے بیان کیا۔ اصحابِ طالوت کا ذکر بیان کیا۔

جہاں سے یہ لفظ انصار چلا ہے قرآن میں۔ جب جناب عیسیٰؑ منزل تبلیغ میں آئے تو جناب عیسیٰؑ نے کہا یہ اکیلے تنہا ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے اعوان و انصار و مددگار چاہئیں۔ تو جناب عیسیٰؑ نے آواز دی "مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ" اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار بنے گا۔ کون میرا ساتھ دے گا؟ "قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ" تو حواریین نے جو جناب عیسیٰؑ کے ساتھ تھے ان حواریوں نے کہا "نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ" ہم اللہ کے انصار ہیں یعنی آپ کے انصار ہونا تو بہت چھوٹی بات ہے اللہ کے مددگار، انصار اللہ۔ دین خدا مقصد الٰہی کے ہم مددگار ہیں۔ اس کے بعد تو حواریین نے کیا کیا۔ میں نہ کہوں گا وہ آپ پڑھیں گے۔ تفاسیر و احادیث اور تواریخ میں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا یعنی اب تک لفظ اصحاب استعمال ہوتا تھا۔ اصحابِ موسیٰؑ، اصحاب انبیاء، لیکن جناب عیسیٰؑ کا دور آیا تو اصحابِ عیسیٰؑ نے اپنا نام بدل لیا "انصار"۔ اس لیے کہ عیسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ میرے اصحاب کہاں ہیں۔ جناب عیسیٰؑ نے کہا "مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ" اللہ کی راہ میں ہمارے انصار کون بنیں گے۔ تو حواریین نے کہا "نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ" ہم ہیں انصار۔ تو اب تک اصحاب کا ذکر پڑھ رہے تھے قرآن میں۔ اب انصار کا لفظ آیا تو اس کا حال بھی دیکھ لیا۔ حواریین نے اپنے کو انصار قرار دیا۔

میں نہیں کہتا کہ عیسیٰؑ کے مصائب میں حواریین کا کتنا ہاتھ تھا۔ اتنا جانتا ہوں کہ عیسائیوں کے عقیدے کی بنیاد پر عیسیٰؑ سولی پر چڑھ گئے۔ انصار تماشا دیکھتے رہے۔ نہیں اگر میری بات ضائع ہو گئی تو اتنی دیر کی ریاضت کا کوئی ماحصل نہ ہوگا۔

عیسائیوں کے عقیدہ میں جناب عیسیٰؑ زندہ ہیں یا سولی پر گئے؟

یقیناً سولی پر گئے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے تردید کی ہے "مَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ" جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ غلط کہتے ہیں۔ نہ قتل کیا ہے ان کو نہ سولی پر لٹکایا ہے۔ لیکن عیسائیوں کا عقیدہ یہی ہے کہ انھیں سولی پر لٹکا دیا گیا۔ تو جب یہ سولی پر لٹکائے جا رہے تھے تو یہ حضرات انصار کہاں تھے؟ یہ خالی اصحاب نہیں ہیں۔ اگر خالی اصحاب ہوتے تو کہتے ہم فقط ساتھی ہیں۔ اصحاب کو تو یہ کہنے کا حق تھا کہ ہم فقط ساتھی ہیں، ساتھ تھے۔

اب آپ ہی جارہے ہیں تو ہم بھی جارہے ہیں۔ جو اُحد میں ہوا جب شیطان نے کہا۔ وہ گئے "قَدْ قُتِلَ مُحَمَّدٌ"۔ وہ گئے۔ لوگوں نے سوچا کہ ہم تو ساتھی تھے۔ وہ اُدھر گئے، ہم اِدھر۔ حساب برابر ہے جب وہ گئے تو کس کے ساتھی؟ لیکن جو انصار ہیں، انصار یعنی ساتھ دینے والے، نصرت کرنے والے، مدد کرنے والے تو انھوں نے تو اپنے کو انصار قرار دیا ہے۔ تو جب اُن کو سولی پر چڑھایا جارہا تھا تو یہ انصار کہاں تھے؟ یہ کیا کررہے تھے؟

غور کیا آپ نے؟۔ تو ہم نے تاریخ اصحاب بھی قرآن میں دیکھی اور تاریخ انصار بھی دیکھی ہے۔ اب پانچ لفظوں میں سب سمیٹ دیتا ہوں۔ متوجہ رہیں گے آپ۔ اس کے بعد جب آپ قرآن مجید پڑھیں گے تو آپ کو میری ان ریاضتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ سارے تذکروں کو سمیٹ دینا چاہتا ہوں۔

پہچانئے جو کردار اصحاب قرآن اب تک بیان کررہا تھا اس کی ایک پہچان یہ ہے کہ لشکر دشمن اگر سامنے آجائے تو لرز جائیں گے۔ ہائے ہم تو پکڑے گئے۔

یہ ایک تذکرہ ہے۔ دوسرا تذکرہ۔ جب مال دنیا آجائے تو مال لٹانا کیسا حسرت مال پیدا ہوجائے۔ تیسرا تذکرہ جب پانی سامنے آجائے تو بچنا کیسا، دریا پر ٹوٹ پڑیں۔

چوتھا تذکرہ نبی میدان میں رہ جائے وہ پہاڑ پر چلے جائیں۔

پانچواں تذکرہ کہ نبی کو سولی پر لٹکا دیا گیا اور انصار تماشا دیکھتے رہ گئے۔

جب قرآن میں اصحاب و انصار کی اس تاریخ کو پڑھ لیا تب اس جملے کے معنی سمجھ میں آئے۔ "خدا کی قسم جیسے اصحاب مجھے ملے ویسے اصحاب کسی کو نہ ملے"۔ یہ نہ لشکروں سے ڈرنے والے، نہ مال دنیا پر مرنے والے، نہ دریا دیکھ کے پانی پینے والے، نہ مصیبتوں میں چھوڑ دینے والے اور نہ میدان میں اکیلا رکھنے والے۔

لیکن عزیزو! بس میں نے بات کو یہیں پر تمام کردیا۔ اب مزید کوئی تذکرہ کروں گا تو وقت کو طول ہوجائے گا ورنہ باتیں بہت ہیں جو شاید آئندہ میں گذارش کرسکوں۔

ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آپ نے دیکھا کہ وہ موسیٰؑ کے اصحاب تھے جو دولت قارون کو دیکھ کر حسرت مال پیدا کر رہے تھے۔ یہ حسینؑ کے اصحاب تھے کہ جو کچھ گھر میں ہے سب لٹا دیا جائے۔

وہ موسیٰؑ کے ساتھ والے تھے جن کو یہ پریشانی تھی کہ لشکر فرعون آجائے گا تو کیا ہوگا۔ یہ حسینؑ کے ساتھی ہیں کہ لشکروں پر لشکر آرہے ہیں، فوجوں پر فوجیں آرہی ہیں، دشمنوں کے ساتھ دشمن چلے آرہے ہیں۔ مگر کسی کو نہ خوف ہے نہ دہشت ہے، نہ ہراس ہے۔ کوئی مُڑ کے دیکھتا بھی نہیں ہے کہ کون آرہا ہے اور ان کی حقیقت کیا ہے۔ ایک ایک اکیلا اپنے کو سارے لشکر سے مقابلہ کرنے کے لئے کافی سمجھتا ہے۔

یہاں عالم یہ ہے کہ دریا سامنے ہے مگر نہ دریا پر قبضہ کرنا ہے نہ دریا سے پانی لینا ہے۔ نہ کوئی پرواہ ہے۔ کتنی ہی تشنگی کیوں نہ ہو، کتنی ہی پیاس کیوں نہ ہو۔ اگر آج ہمارا امتحان پیاس ہی سے ہونے والا ہے تو اس امتحانِ محبت میں بھی کامیاب ہی رہیں گے اور جب تک زندہ رہ جائیں گے مولا پر آنچ نہ آنے پائے گی۔

مگر عزیزو! بس ایک لفظ کہنا ہے ان تمام تذکروں سے اس پورے کردار سے ہمیں سبق لینا ہے اس لئے کہ وہ بھی حسینؑ والے تھے، ہم بھی حسینؑ والے ہیں۔ یہ اور بات ہے، ہم وہ حسینؑ والے ہیں جو حسینؑ پر قربان ہو جائیں وہ، وہ حسینؑ والے تھے جن پر دنیا قربان ہو جائے۔

بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے کسی کی راہ میں جان قربان کر دینا یہ آسان کام نہیں ہے۔ اگر انسان سمجھتا ہے کہ اصحابِ حسینؑ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے اور کیسے قربانی کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔

ہمارے سامنے تو اگر چار پیسے کا ذکر آجائے تو بعض لوگ پریشان ہو جاتے ہیں۔ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر پیسہ خرچ کرنا ذرا مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کی راہ میں خرچ کرنا مشکل ہوتا ہے جس سے لیتے ہیں۔

سُن ہی رہے ہیں آپ روزانہ کہ یہ فرشِ عزا آپ ہی کے تعاون سے بچھا ہے،

آپ ہی کے تعاون سے پھلتا ہے۔

ظاہر ہے یہ بار بار کس کو بتانا ہے۔ کون نہیں جانتا ہے مگر یہ تذکرہ اس لئے دوہرایا جاتا ہے کہ بہرحال ہر آدمی جانتا ہے کہ باتیں جو ضروری اور اہم ہوتی ہیں ان کو اگر بار بار نہ دوہرایا جائے تو کام بنتا نہیں ہے۔ یہی کام میں بھی دس سال سے کر رہا ہوں کہ جب باتوں کو ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کو برابر ہر سال دوہراتا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ بغیر تکرار کے کام بننے والا نہیں ہے۔ خدا جانے کون سا جملہ کب کس پر اثر کر جائے اور کون انسان ہے جو اس راہ پر آجائے جو راہ حسینؑ بن علیؑ ہے۔

تو عزیزانِ محترم! آپ کو خود اپنی عاقبت بنانا ہے۔ مجھے کیا کہنا ہے آپ سے۔ حسینؑ تو دونوں کے ہیں۔ میرے جیسے ویسے آپ کے۔ ہر آدمی کو اس امر کا احساس ہے اور ہونا چاہئے کہ آج ہمارے سامنے ادنیٰ مال کی قربانی ہے تو اس کے لئے تیار ہیں۔ کل اگر جان کی قربانی کا وقت آجائے گا تو جان بھی قربان کر دیں گے۔ کہیں سے تو قربانی کا مظاہرہ ہونا چاہئے، کہیں سے تو جذبۂ قربانی کا اظہار ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ جب اصحاب کا یہ عالم ہے کہ جب مسلم بن عوسجہ کے سرہانے سے حسینؑ پلٹ کے چلے۔ دیکھا خیمہ گاہ سے ایک بچہ آ رہا ہے۔ حبیب ساتھ ہیں۔ فرمایا حبیب ذرا اس بچہ کو روکو۔ حبیب نے بڑھ کر روکا۔ مولاؑ کی خدمت میں لے کر آئے۔ کہا بیٹا کہاں جا رہے ہو؟۔ کہا آقا میدان میں جا رہا ہوں۔ خیر تو ہے بیٹا کیا ارادہ ہے؟ کہا مولا آپ کے قدموں پر یہ سر قربان کرنے جا رہا ہوں۔ کہا بیٹا اپنا تعارف کراؤ گے؟ کہا مولا آپ تو جانتے ہیں میں مسلم بن عوسجہ کا بیٹا ہوں۔ کہا مگر بیٹا شاید تمھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ میں تمھارے باپ کے سرہانے سے آ رہا ہوں تمھارا باپ راہِ خدا میں قربان ہو گیا ہے۔ اے لال تمھاری ماں کے لئے تمھارے باپ کا غم بہت کافی ہے۔ اب ماں کے دل کو نیا زخم کیوں دینا چاہتے ہو؟

بس یہ سُننا تھا کہ بچہ تڑپ گیا۔ کہا مولا آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ارے مجھے کس نے سجایا ہے۔ یہ ننھی سی تلوار کمر سے کس نے لگائی ہے مجھے کس نے تیار کر کے بھیجا ہے۔ میری ماں ہی نے مجھے آمادہ کر کے اور مجھے سجا کر بھیجا ہے۔ ابھی حسینؑ کچھ ...

تھے کہ پسِ پردہ سے آواز آئی۔ مولاؑ! ایک بیوہ کا ہدیہ رد نہ کیجئے گا۔

اے عزادارو! جب ساتھ آجانے والوں میں تیرہ برس کے بچے کا یہ جذبہ ہے تو جو بھائی کی نشانی ہو، جو بھائی کی یادگار ہو، جو بنی ہاشم کے گھرانے کا انسان ہو اس کا عالم کیا ہوگا۔ اب تعجب نہ کیجیے گا کہ تیرہ برس کی عمر میں قاسمؑ کے جذبات کیا ہیں؟

ہم نے کربلا میں تیرہ برس کے انصار و اصحاب میں مددگار دیکھے ہیں تو یہ تو حسنؑ کی یادگار ہے۔ یہ تو حسینؑ کی گود کا پالا ہوا ہے۔ یہ تو عباسؑ علمدار کی گود کا کھلایا ہوا ہے۔ اس کا جذبہ کیا ہوگا، اس کا عالم کیا ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے جو پرانی تاریخ پڑھی تو اگر موت سامنے آجائے تو لوگ گھبرا گئے کہ لشکر فرعون آگیا، اور کربلا کی تاریخ پڑھی تو عاشور کی رات، اصحاب کا خیمہ، حسینؑ بن علیؑ کی تقریر، بس یہ زندگی کی آخری رات ہے۔ کل قربانی کا دن ہے۔ اے میرے ساتھیو، میرے شہسوارو، میرے جانبازو! کل تم سب کو راہِ خدا میں قربان ہو جانا ہے۔ حبیب، مسلم، زہیر، بریر، عابس جتنے غلام، جتنے آزاد ہیں سب کو راہِ خدا میں قربان ہو جانا ہے اور تم ہی نہیں میرا عباسؑ، میرا علی اکبرؑ، میرے عونؑ و محمدؑ۔ بنی ہاشم کے جوان میری گود کے پالے سب قربان ہو جائیں گے۔ قربانیوں کا ذکر کر کے حسینؑ بن علیؑ خاموش ہو گئے۔

ایک کمسن شہزادہ محفل سے اٹھا اور خیمہ کے ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ کے زار و قطار رونا شروع کیا۔

بس عزادارو! آپ متوجہ ہیں میرے بچو اور میرے بزرگو! بچو تم تو جانتے ہو کہ تیرہ برس کی عمر کے جذبات کیا ہوتے ہیں، اور میرے بزرگو آپ جانتے ہیں کہ جس کا بیٹا تیرہ برس کا ہوتا ہے اُس ماں، اُس باپ کا جذبہ کیا ہوتا ہے اور خصوصیت کیساتھ میری بہنیں اس مسئلہ پر غور کریں کہ خدانکردہ جب کسی خاتون کا شوہر دنیا میں نہیں رہ جاتا تو اس کے واسطے شوہر کی یادگار، شوہر کی نشانی ہی زندگی کا واحد سہارا بن جاتی ہے اور اگر ایسے بیٹے کے مرنے کا نام آجائے تو ماں کا عالم کیا ہوگا۔

مگر کربلا میں عجب دنیا دیکھی۔ بچہ خیمہ کے گوشہ میں بیٹھا ہوا زار و قطار رو رہا

ہے۔ روتے روتے ایک خیال آیا کہ بابا نے میرے بازو پر ایک تعویذ باندھا تھا اور فرمایا تھا کہ بیٹا جب کوئی سخت وقت آپڑے، جب کوئی مشکل کا وقت آجائے تو اس تعویذ کو کھولنا اور اسے دیکھ لینا ابھی تک تو بچہ سر جھکائے ہوئے رو رہا تھا۔ ہائے میرا مقدر۔ سب کی قسمت میں شرفِ شہادت ہے۔ سب مولا پر قربان ہوجائیں گے مگر یہ میرا مقدر ہے۔ کمسن تھا تو باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ چچا کا سایہ نصیب ہوا تو یہ خیال تھا کہ جب قربانی کا وقت آئے گا تو چچا پر قربان ہوجاؤں گا مگر کہیں دور دور میرا نام نہ آیا۔ کہیں دور دور میرا تذکرہ نہ آیا۔ مگر جیسے ہی تعویذ کو کھولا دیکھا کہ باپ نے لکھا ہے "بُنَیَّ قَاسِمُ اَدْرِكْ عَمَّكَ الْحُسَيْن" اے بیٹا قاسم اگر تمہارے چچا حسینؑ پر کوئی وقت پڑجائے تو بیٹا اپنے چچا کی مدد کرنا۔ بیٹا چچا کا خیال رکھنا۔ بس عزیزو! یہ دیکھنا تھا کہ قاسمؑ اُٹھے اور دوڑ کے آئے چچا کی خدمت میں۔ اب آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں۔ اب لبوں پر تبسم ہے۔ اب دل میں ایک نیا اطمینان ہے۔ آئے چچا کے سامنے۔ کہا بیٹا خیر تو ہے کیسے آئے؟

کہا، آقا! جب آپ نے محضرِ شہادت سُنایا تھا اور میرا نام نہیں لیا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا کیسا مقدر ہے کہ میری قسمت میں آپ پر قربان ہونا بھی نہیں ہے۔ میں رو رہا تھا کہ بابا کی وصیت یاد آئی۔ اب جو یہ تعویذ میں نے کھولا تو یہ مضمون میں نے دیکھا ہے۔ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ ذرا آپ بھی ملاحظہ کرلیں۔

حسینؑ نے دیکھا۔ کہا بیٹا تعویذ لے کر آئے ہو یا اپنی موت کا پروانہ لے کر آئے ہو؟ یہ کیا تحریر لے کر آئے ہو۔ اے بیٹا میں نے ذکر نہیں کیا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمہارا نام محضرِ شہادت میں نہیں ہے۔ اچھا بیٹا تو اب بتائے دیتا ہوں کل وہ قربانی کا دن ہے جب تم کو بھی قربان ہونا ہے اور تمہارے چھوٹے بھیا علی اصغرؑ کو بھی قربان ہونا ہے۔

علی اصغرؑ کا نام سُننا تھا کہ شہزادہ ایک مرتبہ تڑپ گیا۔ اے چچا "هَلْ يَصِلُوْنَ اِلَى الْخِيَام" کیا اشقیا خیمہ میں گھس آئیں گے؟ حسینؑ نے قاسمؑ کو ...

بیٹا۔ میں اصغرؑ کو اپنے ہاتھوں پر لے کر جاؤں گا۔ مگر جی چاہتا ہے آواز دوں قاسمؑ عصر کے ہنگام آؤ۔ اجرکم علی اللہ

بس آخری مرحلہ اور تذکرہ تمام ہو رہا ہے۔ رات تمام ہوئی۔ عاشور کی صبح آئی۔ وقت گذرتا رہا۔ اصحاب کی قربانیاں تمام ہوئیں۔ اب جو دل کے ٹکڑوں اور بنی ہاشم کے شیروں کی قربانی کا وقت آیا تو وہ موقع آگیا جب ماں نے کہا بیٹا جاؤ چچا کی خدمت میں۔ اجازت لو، میدان میں جاؤ اور جا کے قربان ہو جاؤ۔ دیکھو شہزادی بیٹھی ہوئی ہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے بچے قربان ہو جائیں اور تم رہ جاؤ۔ تو میں شہزادی کے سامنے کیسے جاؤں گی۔ میں شہزادی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔

قاسمؑ آئے اور مولاؑ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ جوڑے۔ آقا، چچا، مرنے کی اجازت دیجئے۔ اب مجھے میدان میں جانے دیجئے۔ حسینؑ نے سر سے پیر تک دیکھا۔ جان برادر، میرے بھیا کی نشانی! ارے مجھ سے مرنے کی رضا لینے کے لئے آئے ہو! میرے لال کیسے تمہیں رخصت کر دوں۔ قاسمؑ کا اصرار بڑھتا گیا۔

دو جملے ہیں مقتل میں۔ بس انہیں کو سنانا ہے۔ جب تک آپ سوچتے رہیں گے روتے رہیں گے۔ قاسمؑ نے پھر اصرار کیا۔ میں جانتا ہوں اجازت تو سب کو ملنے والی ہے مگر جو صورت حال کی نزاکت ہے اسے اہلِ دل ہی پہچانتے ہیں۔ قاسمؑ کا اصرار بڑھتا گیا۔ حسینؑ خاموش کھڑے رہے۔ ایک مرتبہ قاسمؑ نے ایک نئی تدبیر اختیار کی۔ کربلا کے حالات میں کسی کا یہ طریقہ میں نے نہیں دیکھا سوائے قاسمؑ کے مقتل میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ قاسمؑ نے چچا سے اجازت لینے کے لئے ایک نیا راستہ نکالا جب دیکھا کہ مولا اجازت نہیں دیتے تو پہلے مولا کے ہاتھوں کو پکڑا اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ چچا مجھے جانے دیجئے۔

جب حسینؑ خاموش رہے کچھ نہ بولے تو ایک مرتبہ بچے نے اپنا سر قدموں پر رکھ دیا۔ اب سر نہ اُٹھاؤں گا جب تک مرنے کی اجازت نہ ملے گی۔

حسینؑ نے قاسمؑ کو کلیجے سے لگا لیا۔ اتنا روئے کہ اِدھر بھتیجا غش میں ہے اُدھر

چچا غش کے عالم میں ہے۔

اربابِ عزا! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کے سامنے کوئی آدمی بے ہوش ہو جائے تو ہوش میں لانے کا کیا طریقہ ہوگا۔ مگر ہائے بیکسی شہزادی زینبؑ کی۔ اِدھر بھائی غش کے عالم میں اُدھر بھتیجا غش کے عالم میں ہے۔ شہزادی نے آنسوؤں کا چھڑکاؤ شروع کیا۔ چچا بھتیجے نے آنکھیں کھولیں۔ کہا بھیّا اب جانے دو قاسمؑ کو۔ حسینؑ نے قاسمؑ کے سر پر عمامہ باندھا اور عمامہ کے دونوں سرے قاسمؑ کے سینے پر لٹکا دیے۔ اگر آپ نے دیکھا ہو اور شریعت کی تعلیمات میں پڑھا ہو تو مستحباتِ کفن میں یہ ہے کہ مرنے والے کو جہاں اور کفن دیا جائے وہاں مستحب یہ ہے کہ اگر مرنے والا مرد ہے تو سر پر عمامہ باندھا جائے اور خیال رکھا جائے کہ عمامے کے دونوں سرے سینے پر ڈال دیئے جائیں۔ گویا حسینؑ سمجھا رہے ہیں کہ بیٹا میں تجھے کفن تو نہ دے سکوں گا میرے لال آ تجھے سجا تو لوں۔ حسینؑ نے قاسمؑ کو تیار کیا۔ بھتیجے کو گھوڑے پر بٹھانا چاہتے تھے۔ اپنے لال کو رخصت کرنا چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ کچھ خیال آیا۔ کہا بیٹا ایک لمحہ کے لئے ذرا ٹھہر جاؤ۔ قاسمؑ نے کہا چچا کوئی نیا حکم ہے؟ کہا ذرا میرے سامنے آؤ۔ قاسمؑ سامنے آئے۔ حسینؑ نے قاسمؑ کا گریبان چاک کر دیا۔ پوچھا چچا یہ کیا؟ کہا بیٹا یہ یتیموں کی نشانی ہے۔ جاؤ میرے لال جاؤ۔ قاسمؑ میدان میں آئے، جہاد تمام ہوا، گھوڑے سے گرے۔ حسینؑ کو پکارا۔ مگر اب جو حسینؑ دوڑ کر چلے اور بھتیجے کے قریب پہونچے تو اِدھر کے سوار اُدھر اُدھر کے سوار اِدھر۔ ایک مرتبہ یہ منظر دیکھا۔ منظر دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔ قاسمؑ نے آواز دی ارے چچا جلدی آیئے۔ حسینؑ پہونچے دیکھا بیٹا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اے میرے لال، اے میرے قاسمؑ اب میں آیا۔ جب چچا تیرے کام نہ آسکا بیٹا۔

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۸

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۰ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۰
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۰ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَهْلِ
بَیْتِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی اَعْدَآئِهِمْ
اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفسِ مطمئن! پلٹ آ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے، ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔"

سورہ مبارکہ فجر کی ان آخری آیات کریمہ کے ذیل میں "کربلا شناسی" کے عنوان سے جو سلسلۂ بیان آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا آج اس کے آٹھویں مرحلہ پر جو باتیں آپ کے سامنے گذارش کرنا ہیں ان کے عرض کرنے سے پہلے یہ یاد دہانی ضروری اور اہم ہے کہ آج اور کل اور پرسوں یہ تین موضوعات واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں انتہائی اہمیت رکھنے والے موضوعات ہیں۔ اس لئے کہ جتنی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں یا پیدا کی جا رہی ہیں ان تمام غلط فہمیوں کا اور ان تمام غلط باتوں کا سرچشمہ یہ تین مسائل ہیں جن پر ان تین دنوں میں گفتگو کرنے کا ارادہ ہے۔ لہٰذا میں آپ تمام حضرات سے گذارش کروں گا کہ آپ ان موضوعات پر پوری سنجیدگی کے ساتھ توجہ فرمائیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ میں بات کم کہوں۔ آپ بات زیادہ سمجھیں اس لئے کہ زیادہ بات کہنے کے امکانات زیادہ روشن نہیں ہیں۔

آج جس بات کو آپ کے سامنے گذارش کرنا ہے وہ واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں

اور امام حسینؑ کے قیام اور اقدام کے بارے میں ان افکار اور ان آرا پر بحث کرنا ہے کہ جو امام حسینؑ کے سامنے پیش کی گئیں اور جن کو امام حسینؑ نے قبول نہیں فرمایا اور نظر انداز کر دیا۔

اگر آپ تاریخ کربلا پڑھیں گے اور کتابوں میں واقعہ سے متعلق حقائق کو جمع کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جس وقت فرزند رسولؐ الثقلین نے اس قیام کا آغاز کیا ہے یا پہلے مرحلہ پر جب مدینۃ الرسولؐ سے چلے ہیں یا دوسرے مرحلہ پر جب حرم خدا کو چھوڑ کر اور حج کو عمرہ سے بدل کر امام حسینؑ نے قدم آگے بڑھایا ہے اس وقت مختلف افراد تھے جنھوں نے امام حسینؑ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا کہ آپ نہ جائیں۔

ان افراد میں جو فی الحال میری نگاہ میں ہیں۔ بارہ افراد وہ تھے جو امام حسینؑ کو یہ مشورہ، بر بنائے خلوص اور بر بنائے محبت دے رہے تھے اور آٹھ افراد وہ تھے جنھوں نے امام حسینؑ کو یہ مشورہ تنقیدی نگاہ سے اور گویا امام عالی مقام کو ان کے غلط فیصلے پر تنبیہ کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ آپ کو قیام نہیں کرنا چاہیے اور آپ کو ایسے اقدام سے باز رہنا چاہیے۔

وہ افراد کہ جنھوں نے بر بنائے خلوص و محبت امام حسینؑ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی ہیں۔ گھر والے بھی ہیں اور باہر والے بھی ہیں نبی کے اصحاب بھی ہیں اور نبی کے بعد والے بھی ہیں۔

اور ان تمام افراد کو امام حسینؑ نے جواب الگ الگ دیا ہے۔ یعنی جس کے ظرف میں جتنی صلاحیت تھی اور جو مسئلہ کو جس مقدار میں سمجھ سکتا تھا امام حسینؑ نے اسی مقدار میں اُسے مسئلہ سے آشنا بنایا۔ اس لئے کہ اسلام کی کھلی ہوئی تعلیم ہے کہ، "کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" دیکھو لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کرنا۔ ہر آدمی ہر بات سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ جو جتنی بات سمجھ سکے اسے بات اسی سطح پر سمجھانی چاہیے۔

اور یہیں سے ایک نکتہ اور بھی ...

وہ وحی پروردگار ہے "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى" میرا پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتا ہے۔ یہ وہی کہتا ہے جو وحیِ پروردگار ہوتی ہے تو نبیؐ کا کلام بھی وحیِ خدا کا نتیجہ ہے اور قرآن مجید کی آیات بھی وحیِ خدا کا نتیجہ ہیں۔ مگر آیاتِ قرآن کو معجزہ کہا گیا ہے اور نبیؐ کے کلام کو معجزہ نہیں کہا گیا ہے۔

آخر فرق کیا ہوگا کہ وحی اُدھر ہی سے آئی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا اشارہ اسی کا ہے تو ایک کلام معجزہ بننے کے لائق ہو گیا اور ایک کلام معجزہ نہ بن سکا۔ اس کے اور جو اسرار ہیں ان میں ایک بنیادی راز یہ بھی ہے کہ جب قرآن کی آیتیں آرہی تھیں تو خدا نبیؐ سے بات کر رہا تھا اور جب نبیؐ کی حدیثیں آرہی تھیں تو نبیؐ عوام سے بات کر رہے تھے۔ اللہ کا مخاطب پیغمبرؐ تھے اور نبیؐ کے مخاطب اُمّت کے افراد تھے۔ تو خدا اس لہجہ میں بات کرتا ہے جو نبیؐ کے شایانِ شان ہے اور نبیؐ اس لہجہ میں بات کرتا ہے جو عوام کے شایانِ شان ہے۔

نبیؐ کے کلام میں، نبیؐ کے افکار میں، نبیؐ کی فصاحت و بلاغت میں کوئی نقص نہیں ہے مگر کبھی کبھی متکلم کے سامنے یہ مجبوری بہرحال پیش آجاتی ہے کہ اگر معمولی سطح کا انسان گفتگو کرنے والا ہو تو اسے بہرحال اسی طرح سمجھانا پڑتا ہے اور اس کی بہترین مثال آپ اپنے گھر میں صبح و شام دیکھتے رہتے ہیں۔ یہی کام آپ کے بزرگوں نے کیا ہے اور یہی کام آپ کرتے ہیں۔

آپ جب اپنے بچے سے بات کرتے ہیں تو جب انتہائی محبت بھرے لہجہ میں بات کرتے ہیں تو لہجہ وہی ہوتا ہے جو صحیح نہیں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آپ کا بچہ دو برس، تین برس کا ہے تو کوئی فصیح و بلیغ گفتگو تو نہیں کرسکتا۔ صحیح الفاظ بھی ادا نہیں کرسکتا۔ تو جب آپ اظہارِ محبت کرتے ہیں تو اپنی فصاحت کو بھول جاتے ہیں، اپنی بلاغت کو بھول جاتے ہیں، اپنے صحیح تلفظ کو بھول جاتے ہیں۔

جیسا تلفظ بچپنے میں وہ بچہ کرتا ہے اسی لہجہ میں آپ بھی بات کرتے ہیں اور بچہ ایسا

کر رہی ہیں اور بزرگ مجھ سے محبت کر رہے ہیں ورنہ اگر آپ فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کریں تو بچہ مانوس نہ ہو سکے گا، اجنبیت محسوس کرے گا تو جب کسی ایسے کو جسے بات سمجھانا ہے اجنبیت سے الگ کر کے محبت کے ماحول میں لانا ہوتا ہے تو اسی کے لہجہ میں بات کرنا پڑتی ہے۔ آپ اپنے بچہ کا لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ نبی اپنی قوم کا لہجہ اختیار کرتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ بچے کو آپ کی محبت پر اعتبار ہو جائے۔ نبی چاہتے ہیں کہ قوم کو ان کی محبت پر اعتبار ہو جائے۔ اب آپ کا بچہ شریف ہوتا ہے تو محبت پر اعتبار کر لیتا ہے اور نہیں کہتا ہے کہ بابا غلط بول رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کا دماغ کچھ ٹھیک نہیں کام کر رہا ہے ورنہ ان کو تو اپنے لہجہ میں بولنا چاہئے۔ اب اگر کسی کو محبت پر اعتبار نہیں ہوتا تو محبت کی ایسی ناقدری کرتا ہے کہ وہ اظہار محبت کر رہا ہے یہ بے چارہ اسے ہذیان سمجھ رہا ہے۔ بہر حال جتنے افراد بھی امام حسینؑ کے سامنے آئے ہر آدمی نے اپنی اپنی فکر کے مطابق مشورہ دیا اور مشورے بھی الگ الگ ہیں۔ کسی نے خط لکھا، کسی نے پیغامبر بھیجا۔ کسی نے براہ راست گفتگو کی۔ کسی نے مدینہ میں مشورہ دیا۔ کسی نے مکہ میں مشورہ دیا اور جب امام حسینؑ نے نہیں مانا اور مکہ چلے آئے تو پھر مکہ تک آئے دوبارہ پھر سمجھانے کے لئے کہ اب بھی شاید اپنی رائے کو آپ بدل دیں اور اب بھی اگر سفر نہ کریں اور عراق کا رُخ نہ کریں تو زیادہ مناسب ہو گا۔

کچھ آپ نے سُنے ہیں اور جو نہیں سُنے ہیں انھیں بھی تمام سننے والے نوٹ کر لیں اور جائیں واقعہ کربلا پڑھیں تاکہ اندازہ ہو کہ یہ ماجرا کیا ہے، یہ واقعہ کیا ہے، یہ داستان کیا ہے؟ خالی دو لفظوں میں یہ کہہ کر بات کو نہیں اُڑایا جا سکتا کہ ایک قوم ہے جو صدیوں سے روتی چلی آ رہی ہے۔ ارے آپ کا بھی تو کوئی مرا ہو گا۔ دو ہی دن روئے ہوتے۔ آپ کے گھر میں بھی تو کوئی مصیبت آئی ہو گی۔ کبھی تو اس کا ذکر کیا ہوتا۔ آپ تو خوشیوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں غم کیا منائیں گے۔

بزرگوں کو یاد کرنے کے لئے حوصلہ چاہئے، کلیجہ چاہئے، احسان شناسی چاہئے۔

گھر والوں میں جن لوگوں نے امام حسینؑ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا کہ فرزندِ رسولؐ! آپ کی جان کو خطرہ ہے آپ نہ جائیں۔ ان میں خواتین میں جناب ام سلمہؓ ہیں جنھوں نے یہ تذکرہ کیا کہ بیٹا تمھارے جد بزرگوار نے مجھے بتایا ہے کہ عراق تمھارے لئے خطرناک جگہ ہے اور فرمایا ہے کہ میرا ایک فرزند عراق میں شہید ہوگا لہٰذا عراق کا تم نے کیوں ارادہ کرلیا۔

امام حسینؑ نے کہا نانی جان اگر آپ کے مشورے کا مقصد یہ ہے کہ میں نہیں جانتا ہوں اور آپ بتانا چاہتی ہیں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ کو تو خالی بتایا ہے کہ عراق کوئی جگہ ہے اور میرا کوئی فرزند ہے جو عراق میں شہید کیا جائے گا۔ کہیے تو میں وہ جگہ بھی دکھلادوں۔ کہیے تو وہ وقت بھی بتادوں، وہ موقع بھی بتادوں، وہ منظر بھی آپ کو دکھلادوں۔ میں ہوں جو شہید ہونے والا ہوں اور میں ہوں جو قربانی دینے والا ہوں۔ مگر وہ وقت آگیا ہے لہٰذا مجھے جانا پڑے گا۔

گھر والوں میں جن مردوں نے امام حسین علیہ السلام کو مشورہ دیا ان میں دو نمایاں شخصیتیں ہیں:

ایک امام حسینؑ کے بھائی جناب محمد حنفیہؓ جن کا ذکر آپ سنتے رہتے ہیں۔ ان تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔ حالات خود آپ پڑھ لیں گے۔ بس مختصر!

جناب محمد حنفیہ امیر المومنینؑ کی اولاد میں معصومینؑ کے بعد کوئی معمولی درجہ کے مالک نہیں ہیں۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ تو خیر امام ہیں، معصوم ہیں۔ مگر اس کے بعد جو علیؑ کی اولاد ہیں ان میں جناب محمد حنفیہؓ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور شجاعت و ہمت کے اعتبار سے تو اتنا پہچان لینا کافی ہے کہ جمل کے میدان میں مولائے کائناتؑ نے پرچم اسلام محمد حنفیہؓ ہی کے ہاتھ میں دیا تھا اور محمد حنفیہؓ کی عمر عباسؑ علمدار سے دس سال زیادہ ہے، یعنی جمل کے موقع پر یا صفین کے موقع پر اس زمانہ میں عباسؑ علمدار کی عمر دس گیارہ سال کی تھی اور محمد حنفیہؓ کی عمر بیس اکیس برس کی تھی۔ واقعۂ کربلا کے موقع پر جناب عباسؑ کی عمر چونتیس سال کی تھی اور جناب محمد حنفیہؓ کی عمر تقریباً چوالیس سال کی تھی۔

بنیاد، بزدلی نہیں ہے۔ ان کے مشورہ کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ ڈر رہے ہیں کہ ہائے کیا ہوگا، اگر کوئی حملہ ہوگیا، جنگ ہوگئی، لڑائی ہوگئی تو کیا ہوگا؟ محمد حنفیہؒ ایک صاحبِ جرأت، صاحبِ ہمت، صاحبِ شجاعت انسان ہیں مگر انھوں نے امام حسینؑ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا کہ بھائی آپ تو جانتے ہیں کہ عراق والوں نے بابا کے ساتھ وفا نہیں کی۔ آپ جانتے ہیں کہ عراق والوں نے بھائی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ لہٰذا اگر آپ چاہیں تو یہیں رہیں اور اگر آپ کہیں جانا چاہتے ہیں تو یمن چلے جائیں۔ کسی اور جگہ چلے جائیں مگر عراق نہ جائیں تو بہتر ہے۔

امام حسینؑ نے ان کو بھی سمجھایا۔ بھیّا مسئلہ جان بچانے کا نہیں ہے، اس وقت دینِ خدا خطرے میں ہے۔ اس وقت اسلام خطرے میں ہے، ایمان خطرے میں ہے۔ لہٰذا وقت آگیا ہے کہ میں جان قربان کردوں مگر ایسے موقع پر آپ کو میرے ساتھ نہیں جانا ہے۔ آپ کو اسی مدینہ میں رہنا ہے۔

اب امام حسینؑ نے کیوں محمد حنفیہؒ کو مدینہ میں روکا اس کے اسباب بھی مختلف روایات میں پائے جاتے ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ محمد حنفیہ بیمار ہو گئے تھے اور میدانِ جہاد میں ان کی آنکھیں زخمی ہو چکی تھیں لہٰذا انھیں روک دیا گیا۔ مگر بعض روایات میں اس کا راز امام حسینؑ کی زبان سے یہ ہے کہ ایک میرا نمائندہ مدینہ میں رہنا چاہئے۔ یہ بڑی قیمتی بات ہے۔

ایک میرا نمائندہ مدینہ میں رہنا چاہئے، اور اس بات کو ہم نے پہچانا اور اسی سے محمد حنفیہ کی عظمت کو پہچانا اس لئے کہ امام حسینؑ کے سفر کی ایک خصوصیت ہے کہ پیغمبرؐ جب ہجرت کر رہے تھے تو نبی وطن چھوڑ کر مکہ سے جا رہے تھے، لیکن جو نبیؐ کے بعد کا صاحبِ منصب اور دین کا ذمہ دار تھا وہ بہرحال بستر پر موجود تھا۔ ہجرت کی رات جب نبیؐ جا رہے تھے تو جو دین کا ذمہ دار ہونے والا ہے یا ہے وہ بہرحال موجود ہے۔ اسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لیکن امام حسینؑ جب جا رہے تھے تو جتنے دین کے ذمہ دار تھے سب امام حسینؑ کے ساتھ تھے۔ عصمت اور امامت کے اعتبار سے تین، اور کمال جلالت کے اعتبار سے دو۔ اس

وقت میں جب واقعۂ کربلا پیش آیا ہے تو تین امام تھے۔ امام حسینؑ تھے وہ بھی موجود تھے۔ امام زین العابدینؑ وہ بھی موجود تھے۔ امام محمد باقرؑ تین برس کے سہی مگر تھے۔ اور یہ تین برس کی عمر صاحبانِ عصمت اور صاحبانِ امامت اور صاحبانِ منصب کے لئے کوئی معمولی عمر نہیں ہے۔ جس کو اللہ منصب دار بناتا ہے وہ گہوارے سے اعلان کرتا ہے۔ جس کو اللہ عہدہ دیتا ہے اس کے لئے قرآن کہتا ہے "اَعْطَیْنَاہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا" ہم نے بچپنے ہی میں انھیں عہدہ دے دیا۔ تو اللہ والوں کی شان الگ ہوتی ہے۔ تو تین تھے صاحبانِ منصب امام معصوم اور سب امام حسینؑ کے ساتھ جا رہے ہیں اور غیر امام میں دو عظیم شخصیتیں ہیں جو بہر حال مذہب کی ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہیں اپنی حدوں میں۔ جناب زینبؑ اور جناب اُمّ کلثومؑ۔ اس کے علاوہ جو شہداء بعد میں راہِ خدا میں قربان ہو گئے یا جو مجاہدین امام حسینؑ کے ساتھ تھے وہ سب امام حسینؑ کے ساتھ چلے گئے۔ نہ مردوں میں کوئی ایسا رہ گیا، نہ عورتوں میں کوئی ایسا رہ گیا۔ عباسؑ علمدار اگر کچھ ذمہ داری امامت کے علاوہ سنبھالتے وہ بھی ساتھ گئے۔ علی اکبرؑ امامت کے علاوہ ذمہ داری سنبھالتے انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ ثانی زہراؑ انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ جناب ام کلثومؑ انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ وقت کے تین امام تھے وہ بھی ساتھ چلے گئے۔ یعنی مدینۃ الرسولؐ شخصیتوں سے بالکل خالی ہو گیا لہٰذا ضرورت تھی کہ کوئی باکمال انسان جو اتنی دیر تک مدینۂ رسولؐ کو سنبھال سکے جب تک ذمہ دارِ مذہب پلٹ کے نہ آئے۔

میں واضح لفظوں میں کہہ سکتا ہوں کہ سال بھر تک تقریباً یا کچھ زیادہ محمد حنفیہؓ نے مدینہ میں وہی کام انجام دیا ہے جو دورِ غیبت کبریٰ میں علماء اسلام انجام دے رہے ہیں۔

گھر والوں میں دوسرے بھائی جناب عبد اللہؓ جو جناب جعفر طیارؑ کے فرزند تھے۔

ظاہر ہے کہ وہ بھی امام حسینؑ کے بھائی ہیں اس لئے کہ جعفر طیارؑ اور مولائے کائناتؑ

ہیں وہ بھی امام حسینؑ کے گھر والوں میں ایک نمایاں کردار کے مالک ہیں۔ انھیں بھی امام حسینؑ نے مدینہ میں چھوڑا۔ انھوں نے بھی مشورہ دیا، گذارش کی آپ نہ جائیں۔

لیکن جب امام حسینؑ نے فیصلہ کر لیا مجھے جانا ہے۔ یہاں کے حالات اس قابل نہیں ہیں کہ میں مدینہ میں رہ سکوں۔ تو جناب عبداللہ بن جعفر نے اپنے دونوں فرزند جناب عون و محمد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ جاؤ جا کر ماموں سے گذارش کرو کہ حالات ناسازگار ہیں۔ انھوں نے اس پیغام کو پہنچایا۔ امام حسینؑ نے کہا کہ میں حالات جانتا ہوں۔ مگر اپنا فرض، اپنی ذمہ داری بھی جانتا ہوں۔ اس کے بعد مکہ میں امام حسینؑ کا قیام تھا تو عبداللہ بن جعفر پھر آئے گذارش کرنے کے واسطے کہ مولا اب بھی غنیمت ہے مکہ جائے امن ہے۔ حرم خدا ہے۔ یہیں آپ ٹھہر جائیں آگے خطرات ہی خطرات ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہمارے خاندان کے ساتھ ان لوگوں نے کیا برتاؤ کیا ہے لہٰذا ان خطرات کی طرف اگر آپ نہ جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی زندگی کے لئے بہتر ہے اس لئے کہ آپ نہ رہ جائیں گے تو دنیا میں کیا رہ جائے گا۔ لیکن امام حسینؑ نے کہا، نہیں میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں اس لئے کہ میرے لئے یہی تعلیم ہے، میرے واسطے یہی ذمہ داری ہے کہ میں چلا جاؤں اور میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔ جب فیصلہ سنا دیا کہ جانا میرا فریضہ ہے تب جناب عبداللہ بن جعفر طیار نے کہا کہ مولا اگر یہ طے کر لیا ہے کہ آپ کو جانا ہے اور حکم ہے کہ مجھے نہیں جانا ہے تو میرے دونوں بیٹوں کو ساتھ لیتے جائیے اگر مسئلہ یہی ہے کہ دین پر قربان ہونا ہے تو پھر ان بچوں کو بھی قربان ہونا چاہئے۔ اگر مجھے نہیں لے جا سکتے ہیں تو ان کو لے جائیے۔ بہر حال جو انسان اپنی فکر کے اعتبار سے جو کچھ سمجھتا ہے گذارش کرتا ہے۔

اس کے علاوہ خاندان ہی کی تقریباً ایک فرد جناب عبداللہ بن عباس ہیں۔ انھوں نے بھی مدینہ میں روکا، مکہ میں روکا، مشورہ دیتے رہے نہ جائیے۔ امام حسینؑ نے انھیں بھی سمجھا دیا۔ خیر آپ کہتے ہیں تو میں اس مسئلہ پر غور کروں گا "اَسْتَخِیْرُ اللّٰہَ فِیْ ذٰلِکَ" میں اللہ سے طلب خیر کروں گا

اس کے مطابق عمل کروں گا۔ یہ مطمئن ہو گئے کہ شاید امام حسینؑ اب نہیں جائیں گے اس لئے کہ ظاہر ہے کہ اللہ تو وہی کہے گا جو خیر ہے اور خیر وہی ہے جو میں سمجھ رہا ہوں۔ مگر صبح کو جب یہ خبر ملی کہ امام حسینؑ تیار ہو گئے ہیں جانے کے واسطے تو گھبرا کے آئے، فرزندِ رسولؐ آپ نے کہا تھا کہ میں استخارہ کروں گا۔ یعنی میں اللہ سے طلب خیر کروں گا جس میں اللہ کی نظر میں بھلائی ہوگی وہی کام کروں گا۔ مگر آپ تو یکبارگی تیار ہو گئے۔ کہا ہاں میں نے یہی تو کہا تھا کہ جس میں خیر ہوگا وہی کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ خیر اسی میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مصلحتِ اسلام اسی میں ہے لہٰذا میں جا رہا ہوں۔

ایک عبداللہ بن مطیع و عبداللہ بن جعدہ اور مسور بن مخرمہ اور نہ جانے کتنے افراد ہیں جنھوں نے امام حسینؑ کو مشورہ دیا۔ یہ دس ناصحین ہیں، مشفقین ہیں، محبت کرنے والے ہیں، جنھوں نے امام حسینؑ سے گذارش کی کہ آپ نہ جائیں تو بہتر ہے۔ جب امام حسینؑ نکل پڑے تو یہی بات فرزدق نے کہی۔

جب فرزدق سے ملاقات ہوئی اور امام حسینؑ نے کہا بتاؤ کوفہ کے حالات کیا ہیں؟

تو فرزدق نے کہا کہ بس مختصر یہ ہے کہ ”قُلُوبُهُمْ مَعَكَ وَسُيُوفُهُمْ عَلَيْكَ“ دل سب کے آپ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں سب کی آپ کے خلاف اٹھیں گی۔ یعنی جب تک معرکہ سامنے نہ آئے سب مولائی ہیں۔ سب حضور کے چاہنے والے ہیں۔ سب محبت کے دعویدار ہیں۔ اور جب معرکہ سامنے آجائے گا تو تلوار اُدھر سے اُٹھائیں گے آپ کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ یہ بے ضمیروں کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ یہ دنیا داروں کا اور زر پرستوں کا ایک اصول ہوتا ہے۔ محبت کا دعویٰ اِدھر کا کرتے ہیں اور حمایت اُدھر کی کرتے ہیں۔ اس وقت موقع نہیں ہے ورنہ میں دو چار مثالیں اس کی بھی گذارش کرتا تو شاید میرے بچے بات کو جلدی سمجھ جاتے اور یہ اندازہ ہو جاتا کہ ایک انداز بے ضمیری کا، ایک انداز نافہمی کا یا ضمیر فروشی کا یہ بھی ہوتا ہے کہ محبت

سے اُٹھے گی۔ دیکھے ہیں ایسے منظر تاریخ میں بہت ہیں اور آپ نے بھی دیکھے اور سُنے ہوں گے۔

بہرحال یہ مشورے امام حسینؑ کے سامنے آتے رہے مگر امام حسینؑ نے سب کو سمجھایا اور اس کے بعد چلے گئے۔ یہ تو ایک قسم تھی۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے کہ جو آئے امام حسینؑ پر تنقید اور اعتراض کرنے کے لئے۔ جن میں نمایاں فرد جناب عبداللہ بن عمر ہیں۔ بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ سمجھ دار زیادہ ہیں۔ انھوں نے کہا دیکھئے کام وہ کیجیے جس میں خیر ہو، بھلائی ہو، نیکی ہو۔

امام حسینؑ نے کہا یقیناً میں وہی کام کروں گا جس میں خیر ہو، بھلائی ہو، جس میں نیکی ہو۔ اس کے علاوہ اور اس سے ہٹ کر کوئی کام انجام دینے والا نہیں۔

کہا، مگر ایک بات سمجھ لیجیے کہ خیر، صلاح، نیکی، بھلائی اسی بات میں ہے کہ آپ بھی اسی راستے پر آجائیں جس پر ساری قوم آگئی ہے۔

فرمایا، یعنی۔

کہا مقصد یہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔ سیدھا سیدھا حساب ہے زیادہ بات کو گردش میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے صاف بتا دیا۔ مقصد میرا یہ ہے کہ آپ بیعتِ یزید کر لیں، جس میں ساری اُمت داخل ہو گئی ہے۔ اسی حلقہ میں، اسی دائرہ میں آپ بھی داخل ہو جائیں، جان بچ جائے گی۔ گھر بچ جائے گا۔ اولاد بچ جائے گی۔ عافیت ملے گی۔ آرام ملے گا۔ انعام ملے گا اور نہ جانے کیا کیا جو ان کو ملا ہو گا وہ سب ملے گا یہ ایک مشورہ ہے۔

دوسرا مشورہ تقریباً اسی سے ملتا جلتا لفظیں بدل کر دوسرے صاحب نے آکے کہا اور انھوں نے مشورہ دیا آپ بیعتِ یزید کر لیں۔ آپ کے لئے بہترین بات ہے۔ لیکن ایک لفظ کا اضافہ کر دیا انھوں نے تو خالی فائدہ کی بات کی تھی۔ انھوں نے ڈرانے دھمکانے کا ذکر بھی شروع کر دیا۔ آپ بیعت یزید کر لیں یہ بہترین بات ہے اور دیکھئے قوم میں فتنہ نہ پیدا کیجیے۔ قوم میں انتشار نہ ڈالیے...

ہے تو اسی میں آپ بھی رہئے ورنہ اگر آپ اس کے خلاف قدم اٹھائیں گے تو ہمیں یہ سوچنے کا موقع ملے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ قوم میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ قوم میں جدائی چاہتے ہیں۔

بہترین اسلام بیعت یزید میں ہے اور جو اس کے خلاف آواز اٹھائے گا گویا قوم میں تفرقہ پیدا کر رہا ہے۔

یہ آواز ایک آدمی کی نہیں، آٹھ آدمی لفظیں بدل بدل کے، شکلیں بدل بدل کے بھی کہتے رہے۔ محرک ایک ہی ہے مگر لہجے بدلے ہوئے ہیں، انداز بدلے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی اپنے اپنے انداز سے سمجھا رہا ہے اور ایک صاحب نے تو دونوں باتوں کو ملا کر یعنی ڈرانے کا لہجہ بھی اور محبت کا لہجہ بھی، فرزند رسولؐ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس دنیا میں آپ سے بلند تر انسان کون ہے؟ آپ پیغمبرؐ کی یادگار، آپ علیؑ کی نشانی آپ خانوادۂ ہاشمی کی جان، آپ عرب کا وقار، آپ کا یہ مرتبہ، آپ کا وہ مرتبہ ہے۔ جب آپ نہ رہ جائیں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ نہ رہ جائے گا۔ بس، ہم چاہتے ہیں کہ آپ رہیں گویا خاندانِ رسالت رہے گا، عرب کا افتخار رہے گا، بنی ہاشم کا وقار رہے گا۔ لہٰذا آپ کو زندہ رہنا چاہیے۔

امام حسینؑ نے کہا، ہاں یہ سب باتیں صحیح ہیں مگر اب فیصلہ ہو چکا ہے لہٰذا مجھے جانا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ عرب کا اور بنی ہاشم کا وقار و افتخار رہے گا اگر میں زندہ رہوں گا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ وقار و افتخار باقی رہے گا اگر میں قربان ہو جاؤں گا۔ یہ تو اپنی اپنی فکر ہے اور اپنے اپنے سوچنے کا ایک طریقہ ہے۔

یہ افراد کہ جو امام حسینؑ کے سامنے آئے ہیں سب کا الگ الگ تذکرہ نہیں کر سکتا ہوں ورنہ بات کو طول ہو جائے گا۔ لیکن اب ان سارے تذکروں کو سمیٹنے کے بعد جو واقعۂ کربلا کے بعد پڑھے لکھے، ضمیر فروش، اہلِ قلم پیدا ہوئے اس بیسویں صدی تک انھوں نے ان باتوں کو جمع کر کے وہی نتیجہ نکالا جو بہت سی زبانوں سے آپ سنتے رہتے ہیں۔ جب اتنے سمجھدار لوگ صحابہ، غیر صحابہ، تابعین، خاندان والے، باہر والے، مرد و عورت یہ سب سمجھا رہے تھے تو سمجھ جانا چاہئے تھا۔ یہی بات وہ ہے جو آج ہر جگہ

اور ہر کارنر سے دوہرائی جارہی ہے اتنے لوگ سمجھ دار پڑھے لکھے جب مشورہ دے رہے تھے تو سمجھ جانا چاہیے تھا۔

سمجھنا کیا چاہیے تھا۔ کیا سمجھنا چاہیے تھا۔ یہ تو سمجھائیے کہ کیا سمجھنا چاہیے تھا اس لئے کہ ظاہر ہے کہ مشورہ دینے والے دو طرح کے ہیں۔ پہلی قسم جو میں نے عرض کی وہ دس گیارہ آدمی وہ ہیں جو فقط یہ کہتے ہیں کہ آپ عراق نہ جائیے۔ وہاں نہ جائیے۔ وہاں نہ جائیے جہاں خطرہ ہے مگر کسی ایک کی زبان پر یہ نہیں آیا کہ یزید کی بیعت کر لیجئے۔ نہ عبداللہ بن مطیع، نہ عبداللہ بن جعدہ، نہ عبداللہ بن عباس، نہ عبداللہ بن زبیر، کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ بیعت کر لیجئے۔ یہی کہتے رہے کہ آپ کی زندگی کی سلامتی اسی میں ہے کہ آپ یہیں رہیں۔ اُم سلمہ نے کہا بیٹا عراق نہ جاؤ مگر یہ نہیں کہا کہ یزید کی بیعت کر لو۔ محمد حنفیہ نے کہا بھیا آپ یمن چلے جائیے۔ کہیں اور چلے جائیے۔ مگر یہ نہیں کہا کہ یزید کی بیعت کر لیجئے۔ یہ دوسرا طبقہ تھا جس میں بعض کا نام میں نے لیا اور بعض تاریخوں میں موجود ہیں آپ پڑھ لیجئے گا۔

تو ایک قسم وہ ہے جن کو میں نے مخلص کہا ہے کہ جو جان بچانے کی فکر میں ہیں کہ مولا کی جان بچ جائے۔ نبی کا نواسہ زندہ رہ جائے۔ مگر اس بات کے فیور میں اور اس بات کی حمایت میں نہیں ہیں کہ حسینؑ معاذاللہ بیعتِ یزید کر لیں۔ یہ وہ ہیں جو حسینؑ سے محبت کرنے والے ہیں مگر یزید کو برحق سمجھنے والے نہیں ہیں۔

یہ دوسرا طبقہ ہے جو آٹھ آدمیوں کا ہے۔ جن کی رائے یہ ہے کہ بیعت کر لیں۔ اسی میں خیر ہے اُمت کے لئے، آپ کے لئے۔ اسی میں بھلائی ہے، عافیت ہے، زندگی ہے، راحت ہے، آرام ہے، انعام ہے، اکرام ہے اور آخرت میں کیا ہے خدا جانتا ہے۔ میں اس لئے بار بار اس لفظ کو دوہرا رہا ہوں کہ کل جو تذکرہ میں آپ کے سامنے عرض کرنے والا ہوں اس کی تمہید آج آپ ذہن میں رکھیں کہ امام حسینؑ جب وطن چھوڑ کے جا رہے تھے یا مکے سے نکلے یا مدینہ سے نکلے تو دونوں موقعوں پر جتنے مشورہ دینے والے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ وہ ہیں کہ جن کو امام حسینؑ سے خلوص ہے، محبت ہے، اُلفت ہے مگر [illegible]

ے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یزید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ یزید کو ویسے ہی فاسق سمجھتے ہیں جیسے امام حسینؑ سمجھتے ہیں۔

وہ یزید کو اسی طرح سمجھتے ہیں جیسے امام حسینؑ۔ مگر جب ایسے لوگ، ایسے نیک کردار افراد کو مشورہ دیتے دیکھا تو کچھ ایسے بھی نااہل تھے جن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس موضوع پر مشورہ چل سکتا ہے۔ اس موقع پر کچھ کہنے کی گنجائش ہے لہٰذا انھوں نے بھی اپنی آواز اس آواز کے ساتھ ملا دی۔ یہ اور بات ہے کہ جب بے جوڑ بات ملائی جائے گی تو ملے گی نہیں۔ اس لئے کہ بے جوڑ بات کا تو خاصہ یہی ہے کہ کیسے ہی ملانا چاہو، کیسے ہی جوڑنا چاہو لیکن چونکہ بے جوڑ ہے اہلِ نظر تو پہچان ہی لیں گے چاہے بات کو بات سے ملایا جائے۔ چاہے آدمی کو آدمی سے ملایا جائے۔ جب بے جوڑ رابطہ ہوگا تو بہرحال پہچان لیا جائے گا اس کو دنیا میں ہر صاحبِ نظر محسوس کرے گا۔

لہٰذا یہ ایک آواز بھی مخلصین کی جس میں منافقین نے یا دوسرے افراد نے یا یزید پرست لوگوں نے اپنی آواز کو ملا دیا اس کے بعد جو طبقہ اہلِ قلم کا یا مصنفین کا پیدا ہوا۔ ان میں جو افراد پیدا ہوئے اس جماعت کی حمایت کرنے والے یہ ان محبت کرنے والوں کے حمایتی نہیں ہیں۔ یہ ان تنقید کرنے والوں کے اور اعتراض کرنے والوں کے حمایتی ہیں اور انھیں کی آواز کو ساری قوم کی آواز قرار دیتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگ کہہ رہے تھے تو امام حسینؑ کو بیعتِ یزید کر لینا چاہیے تھی۔ میں پھر اپنی بات کو دوہرا رہا ہوں۔ کون بڑا آدمی کہہ رہا تھا کہ یزید کی بیعت کر لو۔ یہ صحیح ہے کہ بعض لوگوں نے کہا کہ نہ جائیے اور نہ اٹھیے اور قیام نہ کیجئے مگر قیام نہ کرنا الگ ایک بات ہے اور یزید کی بیعت کر لینا الگ ایک بات ہے۔ آج بھی دنیا میں لاکھوں مسلمان پڑے ہوئے ہیں جو باطل نظاموں کو دیکھ رہے ہیں۔ باطل حکومتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ کافر حکومتیں، یہودیوں کی حکومتیں، عیسائیوں کی حکومتیں مگر قیام نہیں کرتے ہیں، اقدام نہیں کرتے ہیں تو اس کے معنی کیا ہیں کہ یہودیت کو برحق سمجھتے ہیں۔ عیسائیت کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ یا کفار و مشرکین کو صحیح سمجھتے ہیں۔ صحیح سمجھنا الگ ایک بات ہے

اور قیام نہ کرنا الگ ایک بات ہے۔

جن کو اسلام میں بڑی شخصیت کہا جاتا ہے چاہے وہ نبی کے اصحاب مسور بن مخرمہ ہوں۔ چاہے۔ بڑی شخصیت عبداللہ بن عباس ہوں۔ چاہے عبداللہ بن جعفر ہوں۔ چاہے محمد حنفیہ ہوں۔ چاہے اُم المومنین اُم سلمہ ہوں جو اسلام کی بڑی شخصیتیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی امام حسینؑ کو بیعتِ یزید کا مشورہ نہیں دیا تھا اور جن لوگوں نے بیعتِ یزید کرنے کا مشورہ دیا تھا وہ اسلام میں۔ بڑے کہے جانے کے قابل نہیں تھے۔ حد یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر جو انتہائی۔ بزدل آدمی تھے اور رات ہی کے وقت مکہ چھوڑ کر چلے گئے وہ بھی آخر دم تک بیعتِ یزید کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ مقابلہ کیا، مصیبتیں اٹھائیں، خانۂ خدا کو منجنیق سے مسمار کیا گیا غلاف کعبہ جلا دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا مگر بیعتِ یزید کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ تو۔ بزدلی الگ ہے بیعت الگ ہے۔ مشورہ الگ ہے بیعت الگ ہے لہٰذا یہ جو آج کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنے بڑے۔ بڑے لوگوں نے کہا تو امام حسینؑ کو مان جانا چاہئے تھا۔ اتنے۔ بڑے۔ بڑے لوگوں نے بیعت کی بات نہیں کہی، جو بات کہی وہ قیام اور اقدام کے بارے میں کہی۔ اس کا نتیجہ میں آپ کے سامنے خاتمۂ گفتگو میں گذارش کروں گا۔ فی الحال اس فرق کو آپ نگاہ میں رکھیں تاکہ کل کی گفتگو میری واضح ہو سکے۔

اب جو مسئلہ مصنّفین نے اٹھایا ہے۔ جو اہلِ قلم، روزنامہ کے مضمون نگار، چیتھڑے لکھنے والے اور بانٹنے والے بیان کرتے ہیں ان کے پاس ایک ہی نکتہ ہے کہ جب ساری اُمّت نے بیعت کر لی تو امام حسینؑ کو دیکھنا چاہئے تھا کہ مجاریٹی کدھر ہے۔ امام حسینؑ کو دیکھنا چاہئے تھا کہ اکثریت کدھر ہے اسی رُخ پر جانا چاہئے تھا جو اکثریت کا راستہ تھا اسی رُخ پر جانا چاہئے تھا جو مجاریٹی کا راستہ تھا۔

میں ایک عجیب و غریب بات عرض کرنا چاہتا ہوں اور یہ ایک نیا رُخ ہے اسے یاد رکھے گا۔ یہ بیچارے جو امام حسینؑ کو مشورہ دے رہے ہیں کہ امام حسینؑ کو اکثریت کے ساتھ چلنا چاہئے تھا۔ یہ خود اکثریت کے ساتھ نہیں چل رہے ہیں۔ عزیزو! بات یاد رہ جائے گی کبھی بھولئے گا نہیں۔ یہ خود اکثریت کے ساتھ چلیں ورنہ میرا چیلنج ہے چل کے ساری دنیا میں

شمار کر لیں اکثریت حسینؑ کے ساتھ ہے یا یزید کے ساتھ ہے۔

یہ بند کمروں کی کوئی ووٹنگ نہیں ہے۔ بند کمروں کی کوئی کاؤنٹنگ نہیں ہے۔ ارے میدان میں آ کر شاہراہ عام پر گن کے دیکھ لو۔ سارے دنیا میں جہاں چلے جاؤ ہندوؤں سے جا کر پوچھو ان کی اکثریت حسینؑ کے ساتھ ہے یا یزید کے ساتھ ہے۔ عیسائیوں سے جا کر پوچھو جن کے گھر کا پلا ہوا یزید تھا۔ دنیا کے بے دینوں سے، لامذہب افراد سے جہاں چاہیں دنیا میں ان سے جا کر پوچھیں کہ بتاؤ تم حسینؑ بن علیؑ کے چاہنے والے ہو یا یزید کے چاہنے والے ہو۔ جب آپ کو اندازہ ہو جائے اور آپ کو محسوس ہو جائے کہ دنیا میں اکثریت صاحبانِ ہوش، صاحبانِ فراست اور صاحبانِ کمال کی یزید کے مقابلہ میں حسینؑ کے ساتھ ہے۔ میں اور کسی سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں۔ یزید کے مقابلہ میں آج ساری دنیا کی اکثریت امام حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ ہے۔ تو اگر تم حسینؑ کو مشورہ دے رہے ہو تو اپنے مشورہ پر آج خود ہی عمل کر لو۔ کل جو ہونا تھا ہو گیا اب تو اکثریت حسینؑ کے قدموں میں ہے یزید کے مقابلہ میں۔ تو آ جاؤ حسینؑ کے قدموں میں تا کہ تمھاری اکثریت کی لاج تو رہ جائے۔ شریف ہو تو اپنی بات پر قائم رہو۔ چاہے غیروں کی بات مانو چاہے نہ مانو۔

یہ چار چھ مصنّف، دو چار اہلِ قلم، کتابیں مفت کی چھاپ دینے والے اگر یہ یزید کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو کیا ان کا مقابلہ حسینؑ کے چاہنے والوں سے ہو گا۔ یہ مجالس عزا، یہ جلسات، یہ ذکر شہادت، یہ جلوسہائے عزا، یہ ساری دنیا میں چہل پہل، ساری دنیا میں جو آج رونق آپ دیکھ رہے ہیں اس عشرہ محرم میں۔ جا کے شمار کیجئے اس کے بعد ان مسلمانوں سے پوچھئے کہ وہ جن کے ساتھ اکثریت تھی، جن کی بیعت سب نے کر لی، جن کی بیعت کا مشورہ آج آپ امام حسینؑ کو دے رہے ہیں اتنا ہی بتا دو کب دنیا سے گئے اور تم نے کتنا یاد رکھا ہے ان کو۔ دوسروں کو مشورہ تو بعد میں دیا جائے گا۔ تم نے کتنا یاد رکھا ہے۔ تم نے کتنا غم منایا ہے۔ کتنی خوشی منائی ہے ان کے مرنے پر۔ یہی معلوم ہو جائے۔ فقط قلم چلانا، کتاب چھاپ دینا، مضمون نگاری کر دینا یہ بہت آسان کام ہے۔ مگر ضمیر کے خلاف لوٹنے والا کبھی ضمیر کے خلاف اقدام کرنے کی ہمت نہیں کرتا

ہے اس لیے کہ ضمیر اندر سے ملامت کرتا رہتا ہے۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ امام حسینؑ کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ جو اکثریت کر رہی تھی امام حسینؑ کو وہی کرنا چاہیے تھا۔ جان بچ جاتی۔ میرے سننے والے ماشاء اللہ وہ ہیں جو قرآن پڑھنے والے ہیں۔ قرآن حفظ کرنے والے ہیں۔ قرآن دوہرانے والے ہیں۔ ہر طرح کے لوگ ہیں لہٰذا میں ان کو دعوت نظر دے رہا ہوں۔ جائیں مطالعہ کریں قرآن مجید کا۔ پروردگار عالم نے قرآن مجید میں اکثریت کا ذکر اکثریت کے عنوان سے اسّی مقامات پر کیا ہے جہاں اکثریت کا تذکرہ اکثریت کے عنوان سے ہوا ہے اور جب اللہ نے اس اکثریت کو پہچنوایا ہے تو بعض مقامات پر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہے مگر جہاں خدا نے اکثریت کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا ہے وہ فیصلہ ان لفظوں میں ہے "لَا یَعْلَمُوْنَ" اکثریت جاہل ہوتی ہے "یَجْهَلُوْنَ" اکثریت جاہل ہے "لَا یُؤْمِنُوْنَ" اکثریت بے ایمان ہے "لَا یَشْکُرُوْنَ" اکثریت ناشکری ہے، شکر خدا کرنے والی نہیں ہے۔ "وَمَآ اَکْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ" اے پیغمبرؐ! آپ چاہیں تو بھی اکثریت مومن نہیں ہو سکتی ہے۔ "اِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" اے پیغمبرؐ! آپ نے دنیا میں کہ اکثریت کا اتباع کر لیا تو یہ آپ کو بھی راستہ سے ہٹا دیں گے۔

توجہ کر رہے ہیں آپ؟۔ یہ قرآن مجید میں اکثریت کے بارے میں خدائی فیصلہ ہے۔ کہیں "لَا یَشْکُرُوْنَ" کہیں "لَا یَعْقِلُوْنَ" بے عقلے ہیں۔ ان کو عقل سے کیا واسطہ ہے۔ کہیں "لَا یُؤْمِنُوْنَ" ایمان لانے والے نہیں۔ کہیں "لَا یَشْکُرُوْنَ" شکرِ خدا کرنے والے نہیں ہیں۔ کہیں "اَکْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ" اکثریت فاسق ہے۔ کہیں "کَافِرُوْنَ" کافر ہے۔ کہیں بے ایمان ہے۔

یہ تذکرے ہیں قرآن مجید میں اکثریت کے بارے میں، تاکہ مسلمان متوجہ رہے کہ مسلمان، مسلمان ہونے کے بعد، قرآن پڑھنے کے بعد اکثریت کو معیار نہ بنائے میں یہ نہیں کہتا کہ اکثریت غلط ہوتی ہے، اکثریت معیار نہیں ہوتی ہے، اکثریت بنیاد نہیں ہوتی ہے، اکثریت حق کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تو قرآن مجید کا فیصلہ ...

مقامات پر اکثریت کا تذکرہ اکثریت کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ ان میں جہاں اکثریت کو بے ایمان کہا گیا ہے، بے عقل کہا گیا ہے، جاہل کہا گیا ہے، لا یعلمون کہا گیا ہے کافرون کہا گیا ہے، فاسقون کہا گیا ہے۔ جہاں یہ ساری باتیں کہی گئی ہیں وہ اکیاون مقامات ہیں جہاں اکیاون کو یہ سند دی گئی ہے، یعنی اسی کے مقابلہ میں اکیاون پر ایک اکثریت ہے تو بجائے بے دین انسانوں کی اکثریت کے خدائی بیان ہی کی اکثریت کو سمجھ لیا ہوتا کہ جہاں جہاں اکثریت کا ذکر کیا ہے ان میں بھی اکثریت کو لاعلم قرار دیا ہے یا بے عقل قرار دیا ہے یا ناشکرا قرار دیا ہے یا بے ایمان قرار دیا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اکثریت کو معیارِ حق وہی بنائے گا جو جاہل ہوگا، غیر عاقل ہوگا بے دین ہوگا، ناشکر ہوگا، بے ایمان ہوگا، فاسق ہوگا، کافر ہوگا۔

مسلمان اور مومن اکثریت کو معیار حق نہیں بنا سکتا ہے۔

یہ تو میں نے آپ کے سامنے وہ موارد اور وہ مقامات عرض کئے ہیں جہاں اکثریت کا ذکر ہے ورنہ اکثریت کا تذکرہ بغیر لفظ اکثریت کے بغیر لفظ اکثر کے بہت ہے جس میں سے ایک تذکرہ جسے سب جانتے ہیں اس لئے سنا رہا ہوں۔ جب سجدۂ آدم نہ کرنے پر خدا نے ابلیس سے کہا نکل جا تو مردود ہے، تو ملعون ہے۔ نکل جا میری بارگاہ سے۔ تو جب نکالا گیا اور چلنے لگا تو "قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ" اگر مجھے نکال رہا ہے تو تیری عزت وجلال کی قسم، میں سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔

آپ متوجہ ہیں میں نے کیا کہا؟ قرآن مجید کا تذکرہ ہے۔ اس نے کیا کہا "لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ" میں سب کو گمراہ کروں گا "إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ" سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ تو یہ مخلص بندے اگر نکال لے جائیں گے تو بچے گا کیا۔ اگر چند اللہ کے خالص بندے نکال لے جائیں گے تو اقلیت بچے گی یا اکثریت؟ کیا بچے گا۔ اکثریت ہی تو بچے گی۔ یعنی آپ کیا مشورہ دے رہے ہیں۔ چیشرو تو بہت پہلے کہہ چکا ہے کہ میں اکثریت کو گمراہ کر کے رہوں گا تو جو اُدھر کی وراثت کا حامل ہوگا وہ اکثریت پر زور دے گا۔ مگر جو

وارثِ آدم بن کر آیا ہے وہ اکثریت کی اطاعت نہیں کر سکتا ہے۔

بلکہ میرا تو یہ لفظ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حسینؑ نے اس دور کے اکثریت کے فیصلہ کو ٹھکرا کر ہمیں حق دے دیا کہ ہم کہیں "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا وَارِثَ آدَمَ صَفْوَةِ اللهِ" اے آدمؑ کے وارث تجھ پر سلام۔ آدمؑ کے وارث پر ہمارا اسلام۔ اس لئے کہ تم وارثِ آدمؑ ہو اور تمہیں وارثِ آدمؑ اس لئے بنایا گیا ہے تاکہ تمہارے مقابلہ میں آنے والے پہچان لئے جائیں۔

لہٰذا حسینؑ بن علیؑ اپنے نانا کے دین کے ذمہ دار ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ اپنے باپ کے کردار کے ذمہ دار ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ اللہ کی کتاب کے ذمہ دار ہیں۔ لہٰذا اس راہ میں جو قربانی دینا پڑے وہ قربانی دے سکتے ہیں۔ اگر لوگ سکوں کے، دولت کے، جاہ و حشم کے، کرسی اور اقتدار کے خیال میں آکے راہِ حق سے منحرف ہو جائیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر آدمی منحرف ہو جائے لہٰذا اب میں اپنی تقریر کو سمیٹ کے ایک آخری جملہ کہنا چاہتا ہوں باقی تفصیلات آپ خود سوچیں گے اور آپ خود پڑھیں گے۔

تو دو نکتے سامنے آئے:

ایک مخلصین کا مشورہ۔ ایک تنقید کرنے والوں کا اعتراض جو بربنائے اکثریت تھا کہ اکثریت نے بیعتِ یزید کر لی ہے لہٰذا آپ بھی کر لیجئے۔ تو اکثریت کا حال تو ہم نے قرآن میں پڑھ لیا۔ اکثریت کا حشر تو ہم نے قرآن میں دیکھ لیا۔ اکثریت کو ہم نے تاریخ میں دیکھ لیا۔ اکثریت کو ہم نے نہ کبھی معیارِ حق بنایا ہے اور نہ بنا سکتے ہیں۔ جس نے اکثریت کو معیارِ حق سمجھا وہ کبھی راستے پر نہیں آیا۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ چالیس آدمی ایک طرف ہیں یہ اکیلے کہہ رہے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ دعوت ذوالعشیرہ میں سناٹا کیوں تھا اسی لئے کہ جن چالیس کو بلایا ہے یہ سب تو کہہ رہے ہیں کہ جادوگر ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں کہ دیوانہ ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں تین سو ساٹھ خدا ہیں یہ اکیلے ہیں جو وحدہٗ لاشریک کی بات کہتے ہیں تو ہم تو اکثریت کے ساتھ چلیں گے۔ مگر خدا رکھے ایک ایسا بھی اللہ کا بندہ تھا جس نے پہلے ہی دن یہ راستہ بتا دیا کہ حق کے ساتھ چلو اکثریت کے ساتھ نہیں۔ جب سب اکثریت کے چکر میں آکے جادوگر کہہ رہے تھے تو وہ اکیلا کہہ رہا تھا اَنَا یَا رَسُوْلَ اللهِ

اور آج بھی ساری دنیا میں اگر حساب لگایا جائے تو مسلمانوں کے مقابلہ میں اتنی قسمیں جو کفار و مشرکین کی پائی جاتی ہیں وہ بھی بے اکثریت میں ہیں اگر وہ بھی یہی claim کرنا شروع کردیں۔ مسلمانو آؤ مردم شماری کر لو تم زیادہ ہو یا ہم؟ اگر ہم زیادہ ہیں تو تمہارا قانون یہ ہے کہ اکثریت کے ساتھ چلو گے تو کل اگر انھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی تو غلطی کی تھی تم آج کیوں غلطی کر رہے ہو؟ چلے آؤ ہمارے راستہ پر۔ اور ہمارا راستہ کوئی نیا تو نہیں ہے تمہارا ہی تو راستہ ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بھٹک گئے تھے اب واپس چلے آؤ۔ ہاں میں یہ مزاحاً نہیں کہہ رہا ہوں یہ ایک تاریخی تجربہ ہے۔

آپ تو جانتے ہیں کہ اپنا ملک ہی کُفّار و مشرکین کا ملک ہے۔ وہاں ایک مرتبہ یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ ایک شخص کھڑا ہوا کہ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ہم میں ان میں اتحاد ہو جائے، اتفاق ہو جائے، کوئی جھگڑا نہ رہے تو اس کا ایک آسان طریقہ ہے کہ سب پلٹ آئیں اپنے پُرانے مذہب پر۔ سمجھ گئے آپ؟۔ کتنی سادگی سے ایک ہندو نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ متحد رہیں، متفق رہیں۔ مگر کوئی راستہ نکالنا پڑے گا، کوئی فارمولا۔ اور فارمولا بہت آسان ہے۔ یہ سب پہلے ہماری برادری میں تھے، ان کے پیغمبرؐ نے آکے توڑ لیا۔ ان کے پیغمبرؐ نے آکے ان کو ہماری برادری سے الگ کر دیا۔ یہ اُدھر چلے گئے تو یہ الگ ہو گئے۔ اسی لئے جھگڑا پیدا ہو گیا اب پلٹ کے چلے آئیں جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

مجمع میں کوئی ایک سمجھ دار نہیں پیدا ہوا جو اس کی بات کو رد کر سکتا۔ حق و باطل تو الگ ایک چیز ہے وہ سب جانتے ہیں۔ ہر مسلمان پہچانتا ہے مگر بات اس نے ایسی کہی کہ مجاریٹی ہماری کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ آپ ہم سے الگ ہو گئے تھے واپس چلے آئے جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اب سب ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے ہیں۔ بڑے بڑے مقررین اور بڑے بڑے مجاہدین اسلام اور حامیانِ اسلام اور محافظانِ اسلام سب پریشان ہیں۔ اب کیا کریں۔ یہاں تک کہ ایک مردِ مومن نے بطورِ مزاح کہا اے بھائی آپ تو بہت اچھے بولنے والے ہیں۔ خطیب مقرر ماشاء اللہ یہ تو بہترین موقع ہے بولنے کا۔ اس نالائق کا جواب تو دیجئے۔

کہیں لوگ بہک گئے تو بڑی پریشانی ہو جائے گی۔ کہنے لگے ہم سے کیوں کہتے ہیں آپ بھی تو مسلمان ہیں آپ کیوں نہیں جواب دیتے۔ جو ذمہ داری ہم پر ہے وہی ذمہ داری آپ پر بھی ہے۔

انھوں نے کہا غلط کہتے ہیں آپ۔ یہ ذمہ داری صرف آپ کی ہے، ہماری نہیں ہے اس لئے کہ آپ بُت پرستوں سے ملے ہوئے تھے اور ٹوٹ کے آگئے ہیں۔ ہمارا رشتہ بت شکن سے ہے، ہم کبھی ان کے ساتھ تھے ہی نہیں جو الگ ہونے کا سوال پیدا ہو۔

آپ ہم سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم اُن سے الگ ہو گئے ہیں، ہم ان کے ساتھ تھے ہی نہیں ہماری پوری تاریخ گواہ ہے۔ ہماری تاریخ تو کرم اللہ وجہہ محترم و مکرم کی ہے جو کبھی باطل کے سامنے جھکا ہی نہیں۔ جنھوں نے سر جھکا کے اٹھایا ہو وہ جا کے طے کریں کہ اب دوبارہ جھکنا ہے یا نہیں۔

تو عزیزو! قرآن مجید نے اسی لئے واضح کر دیا کہ ایمان پہچانو، کردار پہچانو۔ حقائق پہچانو! اکثریت کی کوئی اہمیت نہیں ہے حق کے مقابلہ میں۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے حقائق کے مقابلہ میں۔

تو جہاں تک اکثریت کا مسئلہ تھا وہ میں نے آپ کے سامنے گذارش کر دیا۔ اب جو آخری جملہ کہنا ہے اور جو واقعتاً اہمیت رکھتا ہے اسے سنجیدگی کے ساتھ سُنیں اور میں تذکرۂ مصائب کو شروع کروں۔

یاد رکھیے گا یہ تو ان کا اعتراض تھا جو تنقید کرنے والے، ہنگامہ کرنے والے اور شور مچانے والے تھے۔ ان کا حال تو قرآن مجید نے واضح کر دیا۔

رہ گئے مخلصین اور محبت کرنے والے جو یہ کہہ رہے تھے۔ حضور نہ جائیے۔ بیعت یزید نہیں کرتے نہ کیجیئے مگر نہ جائیے۔ چاہے وہ ابن عباس ہوں، چاہے ابن جعفر ہوں، چاہے محمد حنفیہ ہوں، چاہے اُم سلمہ ہوں، چاہے کوئی اور ہو جتنے مشورہ دینے والے ہیں ان کے بارے میں ایک جملہ یاد رکھیے گا کہ واقعۂ کربلا میں امام حسینؑ شہید ہو گئے مگر یہ جتنے مخلص مشورہ دینے والے تھے یہ سب زندہ رہے۔ نہیں غور کر رہے ہیں آپ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ابن عباس زندہ تھے۔ اُم سلمہ زندہ تھیں۔ عبداللہ بن جعفرؓ زندہ تھے

زندہ تھے۔ محمد حنفیہ زندہ تھے۔ تنہا امام حسینؑ تھے جو شہید ہو گئے تھے۔ باقی سب زندہ تھے۔ تو جب امام حسینؑ شہید ہو گئے تو مشورہ دینے والوں کو کہنا چاہئے تھا کہ ہماری بات نہ ماننے کا یہ انجام ہوا۔ مگر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حسینؑ کے فرزند حسینؑ کے گھر والے جو زندہ رہ گئے ان کا سر اٹھا رہا اور جو مشورہ دینے والے تھے وہ خاموش ہو گئے۔ یعنی مشورہ دینے والوں کو غلطی کا احساس ہوا، حسینؑ والوں کو اپنی غلطی کا کوئی خیال بھی نہیں آیا۔

عابدؑ بیمار نے کہا کہ میرے بابا نے قربانی دے کر اسلام کو زندہ کر دیا۔

سکینہؑ نے کہا کہ میرے بابا نے قربانی دے کر اسلام کو بچا لیا۔

ثانی زہراؑ نے کہا کہ میرے بھیا نے قربانی دے کر دینِ خدا کو بچا لیا۔ ان کا سر افتخار سے اٹھا رہا۔ وہ اپنے اقدام کو کل بھی صحیح سمجھتے تھے اور آج بھی صحیح سمجھتے رہے ہیں۔ مگر مشورہ دینے والے خاموش ہو گئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نگاہِ امامت جس مستقبل کو دیکھ رہی تھی، اس مستقبل کو ان افراد نے اپنی جلالتِ قدر کے باوجود نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ امامت کی نگاہ اور ہوتی ہے اور اُمت کی نگاہ اور ہوتی ہے۔

اُمت جہاں تک دیکھ سکتی ہے اُس اعتبار سے گفتگو کرتی ہے، اور امامت جہاں تک دیکھ سکتی ہے اُس اعتبار سے قدم اٹھاتی ہے اور امامت کی وسعتِ نظر ہی سے ہم نے امام حسینؑ کے اصحاب کی حالت کو پہچانا ہے "وَاللهِ اِنّی لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفٰی مِنْ اَصْحَابِیْ" خدا کی قسم میرے علم میں میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اصحاب نہیں ہیں۔ "وَلَا اَهْلَ بَیْتٍ اَبَرَّ وَاَوْفٰی مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ" اور نہ کسی کے گھر والے میرے گھر والوں سے زیادہ نیک کردار اور وفادار ہیں۔ تو میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اصحاب نہیں اور میرے گھر والوں سے زیادہ نیک کردار گھر والے نہیں۔ اور ان سب کے سردار کا نام ہے عباسؑ علمدار۔

عباسؑ وفاداروں کا سردار، عباسؑ نیک کرداروں کا سردار۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عباسؑ کا کردار ہے جس پر کتنی نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔

مولائے کائناتؑ کی نگاہ عباسؑ پر۔ بھیا عقیل کسی بہادر خاندان کی خاتون بتاؤ جس

میں عقد کروں اور بہادر بچے پیدا ہوں جو کربلا میں میرے حسینؑ کے کام آئیں۔

اب جو عباسؑ دنیا میں آئے تو علیؑ عباسؑ کو اس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ کربلا میں میرے حسینؑ کا فدیہ بننے والا ہے۔ اسی لئے جب آخری وقت آیا تھا تو مولائے کائناتؑ نے سب کا ہاتھ امام حسنؑ کے ہاتھ میں دیا تھا۔ زینبؑ میں جا رہا ہوں۔ اُمّ کلثومؑ میں جا رہا ہوں۔ محمد حنفیہؓ میں جا رہا ہوں۔ اس گھر کا ذمہ دار یہ میرا لال حسنؑ ہے۔ اور جب اُمّ البنین سامنے آئیں تو کہا بیٹا حسنؑ ذرا حسینؑ کو قریب آنے دو۔ ایک ہاتھ سے حسینؑ کا ہاتھ تھاما، ایک ہاتھ سے عباسؑ کا ہاتھ پکڑا۔ عباسؑ کا ہاتھ حسینؑ کے ہاتھ میں دے کر آواز دی بیٹا میں نے سب کو حسنؑ کے حوالے کیا ہے اور تجھے حسینؑ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ میں کربلا میں نہ رہوں گا مگر جب میرا حسینؑ زغۂ اعدا میں گھر جائے تو عباسؑ، میرے حسینؑ پر قربان ہو جانا۔

علیؑ کی نگاہیں عباسؑ پر ہیں۔ اُمّ البنین کی نگاہیں عباسؑ پر ہیں۔ اسی لئے روایت کا فقرہ ہے کہ جب لُٹا ہوا قافلہ قیدِ شام سے چھٹ کے مدینہ آیا اور بشیر نے آ کر یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ کربلا میں حسینؑ مارے گئے اور حسینؑ کے اہلِ حرم واپس آئے ہیں اور یہ خبر اُمّ البنین کے کانوں تک پہونچی تو تڑپ کے نجف کا رُخ کیا آواز دی والی! آپ کو تو عباسؑ کی وفا پر بڑا ناز تھا۔ آپ اپنے لال کی وفا کا ذکر بار بار کیا کرتے تھے۔ ارے زہراؑ کا لال مارا گیا۔ میرا حسینؑ شہید ہو گیا۔ یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ بشیر نے تڑپ کے کہا۔ اے بی بی یہ نہ کہیے۔ جب تک عباسؑ زندہ رہے حسینؑ پر آنچ نہیں آنے پائی۔

تو علیؑ کی نگاہ عباسؑ پر۔ اُمّ البنین کی نگاہ عباسؑ پر۔

بس تین منزلیں اور مجلس تمام۔

اُمّ کلثوم کی نگاہ عباسؑ پر۔ عاشور کی رات جب مولاؑ ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ میں اپنے علمدار کو ساتھ لئے ہوئے جا رہے تھے اور چھوٹی بہن کے خیمہ میں پہونچے تو کیا دیکھا کہ ایک گوشہ میں بیٹھی ہوئی زار و قطار رو رہی ہیں۔

بہن خیر تو ہے یہ رو کیوں رہی ہو؟ یہ آنسو بہانے کا راز کیا ہے؟

کہا بھیا آپ کو تو معلوم ہے کہ کل قربانی کا دن ہے۔ اُمّ لیلیٰ، علی اکبرؑ

کردیں گی۔ شہزادی عونؑ و محمدؑ کو قربان کردیں گی۔ جناب اُمِّ فروہ قاسمؑ کو قربان کردیں گی۔ مگر ہائے میرا مقدر میں تو صاحبِ اولاد بھی نہیں کہ آپ پر کسی کو قربان کرسکوں۔

یہ سُننا تھا کہ عباسؑ آگے بڑھے۔ بی بی یہ نہ کہیے گا۔ یہ غلام حاضر ہے۔ میں آپ کی طرف سے مولاؑ پر قربان ہوجاؤں گا۔

اُمِّ کلثوم کی نگاہ عباسؑ علمدار پر۔

بس آخری منزل آگئی۔

عزیزو! بنی ہاشم کی قربانیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ وقت آیا جب عباسؑ مولاؑ کے سامنے دست ادب جوڑ کر کھڑے ہوئے۔ آقا اب مجھے بھی اجازت دیدیجئے۔ مولاؑ اب مجھے بھی اجازت دیدیجئے۔

حسینؑ نے فرمایا۔ عباسؑ کیسے جانے دوں؟ "اَنْتَ حَامِلُ لِوَائِیْ" تم میرے علمدار ہو۔ تم میرے لشکر کے سردار ہو۔ اے بھیّا جب تک سردار زندہ رہتا ہے لشکر کی آس بندھی رہتی ہے۔ لشکر کے حوصلے بلند رہتے ہیں۔ بھیّا تمھیں کیسے جانے دوں۔

یہ سُننا تھا کہ عباسؑ نے داہنے دیکھا، بائیں دیکھا۔ مولاؑ وہ لشکر کہاں ہے جس کا میں علمدار ہوں؟ وہ لشکر کہاں ہے جس کا مجھے سردار بنایا گیا ہے؟۔ بس یہ سُننا تھا کہ فرزندِ رسولؐ نے کہا بھیّا اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ مگر بچّوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔ دیکھو خیمہ سے برابر آوازیں آرہی ہیں۔ العطش العطش ہائے پیاس ہائے پیاس۔ بچّوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔

آئے درِ خیمہ پر۔ آواز دی سکینہؑ! بچّی نے چچا کی آواز سُنی۔ دوڑ کر درِ خیمہ تک آئی۔ چچا مجھے یاد فرمایا ہے؟

کہا ہاں۔ میں نے مولاؑ سے میدان کی اجازت مانگی۔ آقا فرماتے ہیں کہ جاؤ بچّوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔ سکینہؑ لاؤ مشکیزہ لاؤ۔ بیٹی جاؤ مشکیزہ لاؤ۔ اب میں جاتا ہوں بچّوں کے لئے پانی کا انتظام کرنے کے لئے۔ سکینہؑ دوڑ کر گئیں۔ مشکیزہ لا کے چچا کے حوالے کیا۔ بچے سکینہؑ کے ساتھ دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ارے سکینہ کا چچا جائے گا تو پانی ضرور لائے گا۔ عباسؑ جائیں گے تو پانی ضرور آئے گا۔ مشکیزہ لے کر چلے۔ یہاں تک کہ میدان میں آئے۔ فوجوں کو

بھگایا۔ فرات تک پہونچے۔ گھوڑا فرات میں ڈال دیا۔ مشکیزہ کو بھرا۔ چلّو میں پانی لے کر آواز دی ظالمو پہچانو! پانی میرے قبضہ میں ہے۔ یہ کہہ کر پانی پھینک دیا مگر میں پانی پی نہیں سکتا کہ میری سکینہؑ پیاسی ہے۔ فرات سے پلٹ کے چلے۔ جب تھوڑی دیر گذری تب شہزادی زینبؑ نے پوچھا۔ اے بھیّا میرا شیر کہاں ہے؟ بھیّا میرا عباسؑ کہاں ہے؟ کہا زینبؑ عباسؑ گئے۔ اب پلٹ کے نہ آئیں گے۔ بس یہ سُننا تھا کہ زینبؑ نے بیساختہ کہا تو میرے بابا نے سچ کہا تھا۔ کہا بہن یہ تم نے کیا یاد کیا۔ کہا بابا میرے بازوؤں کو بوسہ دے رہے تھے اور کہتے جاتے تھے زینبؑ تیرے بازوؤں میں رسیّاں باندھی جائیں گی اب مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ وقت آگیا ہے۔ یہ تو زینبؑ کا عالم تھا۔ اب پلٹ کے حسینؑ جو چلے۔ پرچم ہاتھ میں لئے ہوئے آ رہے ہیں۔ بچّوں نے دیکھا سکینہؑ آگے بڑھی چچا کا استقبال کرنے کے لئے۔ اب جو خیمہ کا پردہ اٹھایا دیکھا علم آیا علمدار نہیں آیا۔ اے چچا تم کہاں رہ گئے۔ حسینؑ نے کہا بیٹی۔ اب چچا کا انتظار نہ کرنا تیرا چچا فرات کے کنارے شانے کٹا کر سو گیا۔

سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس ۹

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ ○ اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفسِ مطمئن! پلٹ آ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے، ہم تجھ سے راضی ہیں۔ آ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

سورۂ مبارکہ فجر کی اِن آخری آیاتِ کریمہ کے ذیل میں "کربلا شناسی کے عنوان سے جو سلسلۂ معروضات آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا وہ اب تقریباً آخری مرحلہ تک پہونچ رہا ہے۔

کل میں نے آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ واقعۂ کربلا سے متعلق یہ تین موضوعات انتہائی اہمیت کے مالک ہیں۔

ایک موضوع کے بارے میں کل میں نے آپ کے سامنے کچھ باتیں گذارش کی ہیں، ایک موضوع کے بارے میں آج گذارش کرنا ہے اور ایک کے بارے میں کل گذارش کر کے بات کو مکمل کر دینا ہے۔

اگرچہ آغازِ مجلس میں بہر حال غیر معمولی تاخیر ہو گئی اور یقیناً اس گرمی میں کچھ نہ کچھ آپ کے ذہنوں میں انتشار ضرور پیدا ہو گا لیکن مسئلہ کی اہمیت اور سنجیدگی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ پوری توجہ کے ساتھ سماعت فرمائیں اور اس موقع کو غنیمت سمجھیں کہ شب جمعہ

بھی ہے۔

اگرچہ بعض علاقوں میں جمعہ کے آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایک دن تعطیل کا ہے تو کم سے کم طلوعِ آفتاب تک ضرور سونا چاہیے، خیر۔

جو مسئلہ آج ہمارے سامنے زیرِ بحث ہے، وہ سنجیدہ ہونے کے علاوہ انتہائی نازک بھی ہے کہ اس میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کے پیدا ہو جانے کا بھی اندیشہ اور خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے اس لئے میں پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ اپنی باتیں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور آپ سے بھی گذارش ہے کہ اتنا ہی سمجھنے کی کوشش کریں جتنا میں کہنا چاہتا ہوں۔ اس سے زیادہ اپنے پاس سے اضافہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں ایک بڑی عام بات ہے جو مختلف حلقوں میں ہر دور میں دوہرائی گئی ہے اور جیسے جیسے واقعہ دنیا میں عام ہوتا جا رہا ہے اور اس کی عظمت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے ویسے ہی ویسے اجنبی افراد کو یہ خیال پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس واقعہ کو سننے کے بعد کوئی نگاہ بلا سبب ہماری طرف اُٹھ جائے اس لئے ہر آدمی کو اس بات کی فکر ہے کہ واقعہ کا رُخ کسی اور طرح موڑ دیا جائے تاکہ کوئی ہماری طرف متوجہ نہ ہونے پائے۔

یہ بیسویں صدی کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ منظر ہم نے روزِ اوّل سے دیکھا ہے کہ وقتِ شہادت تک یزید کو یہی خیال تھا کہ حسینؑ کو قتل کر دیا جائے، ان کے اصحاب و انصار اور اولاد کو تہ تیغ کر دیا جائے، ان کی لاش کو پامال کر دیا جائے، ان کے اہلِ حرم کو قیدی بنا لیا جائے، ان کے گھر والوں کو بازاروں اور درباروں میں لایا جائے اور یہی فتح مبین ہے لیکن جیسے ہی فرزندِ رسولؐ کی قربانی نے دنیا کو یہ محسوس کرایا کہ کتنا بڑا حادثہ تاریخِ اسلام میں پیش آگیا ہے ویسے ہی چند لمحے نہ گذرنے پائے تھے کہ یزید یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اس واقعہ کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا ذمہ دار ابنِ مرجانہ ہے۔

یہ ابنِ مرجانہ کی تلاش کیوں ہو رہی ہے؟ یہ ابنِ مرجانہ کو ذمہ دار کیوں بنایا جا رہا ہے؟

اس لئے کہ یزید روزِ اوّل سارا انتظام اور اہتمام کرنے کے بعد اب یہ پریشانی محسوس کر رہا ہے کہ کہیں دنیا پہچان نہ لے کہ قتل کا ذمہ دار کون ہے۔ اور دنیا کے سمجھدار افراد کا ہمیشہ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی جرم میں یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ کچھ ہمارے بارے میں نہ سوچیں تو فوراً دوسرے کا نام لے لیتے ہیں تاکہ ذہن کا رُخ اُدھر مڑ جائے اور کوئی ذہن ادھر متوجہ نہ ہونے پائے۔

کچھ ایسی ہی پریشانیاں عالمِ اسلام میں پیدا ہوئیں اور کچھ ایسے ہی حالات عالمِ اسلام میں پیدا ہوئے جس کی بنا پر پہلے دبے الفاظ میں اس کے بعد کھلے الفاظ میں یہ کہا جانے لگا کہ آپ جانتے ہیں کہ قتل حسینؑ کا ذمہ دار کون ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ امام حسینؑ کے قاتل کون لوگ تھے۔ اگر انھیں پہچاننا چاہتے ہیں تو بس یوں پہچان لیجیے جو امام حسینؑ کا غم مناتے ہیں، جو امام حسینؑ کے غم میں روتے ہیں۔ یہی ہیں جو قاتل حسینؑ ہیں۔

سُنا ہوگا آپ نے۔ پڑھا ہوگا کتابوں میں۔ لٹریچر میں۔ اب یہ بات بار بار دوہرائی جاتی ہے کہ یہی ہیں قتل کرنے والے۔ جنھوں نے خود ہی قتل کیا ہے اور خود ہی رو رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس کا جواب تو میرے پاس ہے مگر میں اپنی گفتگو کو غیر سنجیدہ نہیں بنانا چاہتا ہوں اس لئے کہ بزرگوں نے ہمیشہ بچّوں کے جھگڑے میں یہ سمجھایا ہے کہ اگر ایک آدمی دیوانہ ہو گیا ہے تو کیا اس کے پیچھے تم بھی دیوانے ہو جاؤ گے۔ اگر ایک انسان ایسی باتیں کر کے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوانا چاہتا ہے تو کیا ہر مسلمان اسی کی طرح کا ہو جائے گا۔

کہ یہ کہہ دے کہ واقعتاً تم نے قتل کیا ہے۔ نہیں جو بات سنجیدہ فکر والے سمجھ سکتے ہیں اور جو بات ہر انسان کے لئے قابلِ قبول ہے اس کے ذیل میں میں چند باتیں رکھنا چاہتا ہوں آپ کے سامنے۔ آپ اسے خود پہچان لیں گے اور سمجھنے والا خود فیصلہ کرے گا۔

یہ بات پیدا کہاں سے ہوئی ہے۔ یہ سوال کہاں سے اُٹھایا گیا ہے کہ یہی وہ افراد تھے جو امام حسینؑ کے یا اُن کے والد محترم کے ماننے والے تھے اور وہی قاتل ہو گئے۔

اس بات میں ایک بنیاد پیدا کی گئی ہے اور وہ بنیاد یہ ہے کہ لشکرِ یزید میں جتنے

آنے والے تھے سپاہی۔ تیس ہزار رہے ہوں۔ زیادہ رہے ہوں۔ جتنے افراد بھی تھے ان میں تقریباً سب کے سب کوفہ سے آئے تھے۔ شام کا کوئی سپاہی نہیں تھا اور اگر رہے ہوں گے تو ناقابلِ ذکر افراد تھے لیکن عموماً جو لشکرِ یزید میں افراد اکٹھا ہوئے تھے فرزندِ رسولؐ کا خون بہانے کے لئے۔ مورخین یہ کہتے ہیں کہ وہ تقریباً سب کے سب کوفہ والے تھے اور چونکہ سب لائے گئے تھے کوفہ سے۔ یا آئے تھے کوفہ سے۔ لہٰذا لوگوں نے اب یہ حساب لگالیا کہ کوفہ وہ جگہ ہے کہ جہاں بیس سال پہلے امام حسینؑ کے والدِ محترم کی حکومت تھی۔ سنہ ۴۰ھ تک کوفہ میں مولائے کائناتؑ کی حکومت تھی اور سنہ ۶۱ھ کے آغاز میں واقعۂ کربلا ہوا۔ تو بیس سال پہلے چونکہ علیؑ وہاں حکومت کر رہے تھے لہٰذا جتنے کوفہ والے تھے وہ سب علیؑ والے تھے۔ توجہ کریں گے۔ سلسلہ کی کڑیاں ملا کر بات کہاں سے کہاں لے جائی جا رہی ہے۔ چونکہ بیس سال پہلے وہاں علیؑ کی حکومت تھی لہٰذا جتنے وہاں تھے سب علیؑ والے تھے اور وہیں سے لوگ لائے گئے تھے کربلا میں۔ اور انہی لوگوں نے علیؑ کے لال کو قتل کیا ہے، لہٰذا سمجھ دار مورخ اب بھی یہی کہہ رہا ہے کہ علیؑ کے بیٹے کو قتل کرنے والے علیؑ والے تھے۔ اس عقل کا میرے پاس تو کوئی علاج نہیں ہے لیکن میں جو باتیں آپ کے سامنے رکھوں گا چاہتا ہوں کہ اگر میرے سننے والے حقائق سے بے خبر ہیں تو جہاں جہاں میری آواز پہونچ رہی ہے وہ ان تاریخی حقائق کو پڑھیں اگر واقعات کا فیصلہ یوں ہی ہوتا ہے کہ چونکہ بیس سال پہلے علیؑ کی حکومت تھی لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوفہ میں جتنے تھے سب علیؑ والے تھے اور چونکہ کوفہ میں سب علیؑ والے تھے لہٰذا جتنے آئے تھے قتل کرنے کے واسطے وہ سب علیؑ والے تھے۔ تو ایک جملہ مجھے بھی کہنے دیجئے کہ اتنا تو یاد رہ گیا کہ بیس سال پہلے کوفہ میں علیؑ کی حکومت تھی لہٰذا سب علیؑ والے تھے اتنا اور بتا دو کہ اسی کوفہ میں عین حالتِ نماز میں جب علیؑ کو قتل کیا گیا تو یہ قتل کرنے والے کہاں کے تھے؟

جن کا جن کا ہاتھ علیؑ کے قتل میں ہے، چاہے وہ ابنِ ملجم ہو، چاہے وہ عورت جو تدبیر کرنے والی ہو، چاہے وہ حاکم کا ساتھ دینے والا ہو، چاہے وہ تلوار فراہم کرنے والے ہوں یا وہ افراد جو زہر فراہم کرنے والے تھے، یہ سب کہاں والے تھے؟۔ باپ اور بیٹے کے مسئلے میں تو آپ نے طے کر دیا کہ باپ کے چاہنے والے تھے جو قاتل ہو گئے لیکن ابھی تو مسئلہ باپ ہی کا باقی ہے کہ

جن کے چاہنے والے آپ نے قرار دیئے ہیں کیا انھیں بھی چاہنے والا کہا جائے گا کہ انھوں نے اپنی محبت میں مولاؑ کا گلا کاٹ دیا۔ محبت میں تلوار چلادی۔ محبت میں فرقِ مبارک کو زخمی کردیا۔

کیا یہ بھی کوئی صاحبِ عقل سوچ سکتا ہے، اس کے معنی کیا ہیں کہ اب دو میں سے ایک بات ماننا پڑے گی یا یہ ماننے کہ کوفہ میں دو طرح کے عناصر تھے۔ دو طرح کے افراد تھے۔

وہ بھی تھے جو علیؑ کے چاہنے والے تھے۔

اور وہ بھی جو علیؑ کو قتل کرنے والے یا قتل میں سہارا دینے والے اور قتل کی سازش کرنے والے۔ قتل کا انتظام کرنے والے۔ قاتل کو تلوار فراہم کرنے والے۔ قاتل کو زہر فراہم کرنے والے تھے۔ جن کے بارے میں خود ابن ملجم نے کہا ہے کہ میں نے اس تلوار کو جس زہر میں بجھایا ہے اگر اس زہر کو سارے اہلِ کوفہ پر بانٹ دیا جاتا تو کوئی ایک زندہ نہ رہ سکتا۔ تو بتاؤ یہ زہر کس کارخانے کا تھا۔

کوفہ میں ایسا کوئی کارخانہ یا ایسی کوئی فیکٹری جہاں ایسا زہر بنتا ہو کہ تلوار کو اگر اس زہر میں بجھا دیا جائے یا سارے کوفہ میں اگر اس زہر کو بانٹ دیا جائے تو کوئی ایک زندہ نہ رہ جائے۔

جب کہ کوفہ کسی چھوٹے موٹے محلّہ کا نام نہیں تھا۔ کوفہ میلوں تک آباد تھا تو وہ زہر کہاں سے آیا تھا؟ یا تو یہ کہا جائے کہ کوفہ میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایسے بھی تھے جو علیؑ کا کلمہ پڑھنے والے تھے اور ایسے بھی تھے جو علیؑ کو قتل کرنے والے تھے۔ اور اب بھی کوفہ ۴۰ھ سے بڑھ کر ۶۱ھ تک آگیا تو دونوں قسمیں باقی رہ گئیں۔ جو کل علیؑ کے قتل کی سازش کررہے تھے وہ آج فرزندِ علیؑ کے قتل میں شریک ہو گئے اور جو کل علیؑ کا کلمہ پڑھنے والے تھے وہ آج کسی نہ کسی طریقہ سے حسینؑ کی نصرت کے لئے آگئے۔ ہم نے اسی کوفہ میں ان ظالموں کو بھی دیکھا ہے جو لشکرِ یزید کے سپہ سالار تھے اور اسی کوفہ سے حبیب بن مظاہر کو بھی دیکھا ہے جو کسی نہ کسی طرح سے نصرتِ حسینؑ کے لئے آگئے۔

اب ذرا ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر تاریخ کا جائزہ لیں۔ مولائے کائناتؑ کی حکومت یقیناً کوفہ میں تھی مگر کتنے دن؟ چار برس کوفہ میں علیؑ کا اقتدار۔ چار برس۔ لیکن اس سے

پہلے کیا کوفہ نہیں تھا۔ پڑھے گا تاریخ میں اور جو پڑھے ہوئے ہیں وہ سمجھیں گے میری بات کو۔ کیا اس سے پہلے کوفہ نہیں تھا۔ کیا علیؑ نے دارالحکومت بنا کے کوفہ بنایا تھا یا کوفہ آباد کیا تھا؟

کوفہ تو اسلام سے پہلے کا شہر ہے لیکن اسلام میں جو کوفہ کی اہمیت پیدا ہوئی ہے۔ جو کوفہ کی عظمت پیدا ہوئی ہے یا کوفہ میں اجتماعیت پیدا ہوئی ہے اور وہ بڑا شہر بن گیا ہے۔ اس کوفہ کو آباد کرنے والا سعد بن ابی وقاص کو قرار دیا جاتا ہے۔ تو کوفہ کو آباد کرنے والا کون؟ سعد بن ابی وقاص، اور اس نے کوفہ کو آباد کیا دورِ خلافتِ ثانی میں۔ اس کے بعد جب دورِ خلافتِ سوم گذر گیا اور حضرت علیؑ کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو علیؑ نے دارالحکومت مدینہ سے منتقل کر کے کوفہ بنایا۔ تو کوفہ ایک آباد علاقہ تھا جو آباد کیا گیا تھا اور فوجی طور پر چھاونی بنایا گیا تھا۔ اتنی بڑی آبادی میں چار سال علیؑ کی حکومت بھی رہی تو جو کوفہ میں تھے وہی تو علیؑ کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ جو کوفہ میں آباد تھے وہی تو علیؑ کے ماننے والے ہو گئے تھے۔

یہ تو ساری دنیا کا قاعدہ ہے کہ جو جس شہر یا ملک میں حاکم ہو جائے گا جو حکومت پرست ہوں گے وہ بہرحال اس کا کلمہ پڑھیں گے۔ لیکن ہمیں یہ بھی پتہ لگانا پڑے گا کہ اگر آج علیؑ آگئے ہیں کوفہ میں اور لوگ علیؑ کا کلمہ پڑھ رہے ہیں تو اس کے پہلے ان کا کوئی کلمہ تھا یا نہیں؟ اس کے پہلے یہ کسی کے چاہنے والے، ماننے والے تھے یا یہ زمین سے اُگنے والے اور آسمان سے برسنے والے لوگ تھے؟

وہ اگر پہلے سے آباد تھے تو ان کا کوئی عقیدہ رہا ہوگا، کوئی نظریہ رہا ہوگا، کوئی ذہنیت رہی ہوگی۔ چار برس علیؑ کی حکومت کی بنیاد پر انھوں نے علیؑ کا کلمہ پڑھا ہے تو ان کے بنیادی عقائد و نظریات کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ جن عقائد و نظریات پر پردہ ڈال کر حکومت پرستی کی بنیاد پر علیؑ کے ساتھ آگئے ہیں۔ توجہ کریں آپ۔ میں اور ذرا واضح کرنا چاہتا ہوں۔

اگر علیؑ حاکم ہونے کے بجائے فقط ایک امام، ایک صاحبِ علم و کمال ہونے کی حیثیت سے کوفہ میں آئے ہوتے اور اہلِ کوفہ علیؑ کا کلمہ پڑھنے لگتے تو ہم کو یہ اندازہ ہوتا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کمال کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جو علم کے پرستار ہیں۔ یہ وہ لوگ جو فضائل کے قدر دان ہیں۔

مگر علیؑ آئے تو بحیثیت حاکم آئے اور بحیثیت حاکم آئے تو علیؑ کے قدردان نہیں پیدا ہوئے۔ حکومت کے قدردان پیدا ہوئے۔ نہیں اس جملے کو نہ سمجھئے گا۔ جو اکثریت پیدا ہوئی ہے وہ حکومت کی قدردان ہے، وہ علیؑ کی قدردان نہیں ہے۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ مولائے کائناتؑ نے کوفہ میں قدم رکھنے کے بعد جو پہلی نماز جمعہ پڑھائی ہے اس نمازِ جمعہ کے پڑھانے کے لئے جب مولائے کائناتؑ مسجد میں داخل ہوئے تو عالم کیا تھا۔ وہی بوسیدہ لباس، وہی پیوندار چادر۔ علیؑ مسجد میں آ رہے ہیں نماز پڑھانے کے لئے، لوگوں سے کہہ رہے ہیں۔ بھائی ذرا راستہ دے دو میں آگے جانا چاہتا ہوں۔

کہا آپ کو بڑا شوق تھا نماز پڑھنے کا تو پہلے آئے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ لوگ پہلے سے آکے جگہ لے چکے ہیں اس لئے کہ نیا خلیفۃ المسلمین، نئے امیر المومنین، نیا حاکمِ وقت آج نماز پڑھانے والا ہے۔ انھوں نے کسی پیش نماز کے پیچھے پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو۔ کبھی نماز پڑھی ہو یا نہ پڑھی۔ مگر جب یہ معلوم ہو جائے کہ حاکمِ وقت نماز پڑھانے والا ہے تو یوں بھی مجمع ہونے والا ہے۔

آپ کو اگر معلوم ہو جائے کہ آج حاکمِ وقت کا لکچر ہونے والا ہے۔ تو مرد عورت کوئی بھی ہو سب اکٹھا ہو جائیں گے۔

ہم دو گھنٹہ بولتے رہیں نہ آئیں گے، لیکن اگر معلوم ہو جائے کہ سربراہِ مملکت کا لکچر ہونے والا ہے۔ وزیر اعظم بولنے والے ہیں۔ فلاں صاحب تقریر کرنے والے ہیں تو چاہے تماشائیوں کا مجمع سہی مگر اکٹھا تو ہو جاتا ہے۔

تو حکومت کی پرستاری کا جذبہ ہر دور میں رہا ہے۔ لہٰذا آج جو مجمع آ رہا ہے سرکاری مجمع ہے۔ اسی لئے کہہ رہا ہے کہ اگر آپ کو نماز پڑھنے کا شوق تھا تو پہلے آئے ہوتے۔ کہا اگرچہ میں دیر سے آیا ہوں مگر راستہ تو دے دو۔ کہا نہیں آگے نہیں جا سکتے آپ پیچھے بیٹھ جائیے۔ ہم اتنی دیر سے جگہ لئے بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ چاہے جتنی دیر سے آئیں آگے بڑھ جائیں؟ یہ نہیں ہو سکتا ہے۔

کہا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ آج امیر المومنینؑ پہلے پہل نماز پڑھانے کے لئے آرہے ہیں۔

ہم ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے آئے ہیں جو حاکمِ اسلامی ہیں۔ جو خلیفۃ المسلمین ہیں جو امیر المومنین ہیں۔ ہم ہرگز جگہ نہیں دے سکتے ہیں۔ ہم ذرّہ برابر ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

مولائے کائناتؑ نے کہا مگر مشکل یہ ہے کہ جس کے پیچھے تم نماز پڑھنا چاہتے ہو اگر مجھے آگے نہ جانے دو گے تو نماز نہ ہو سکے گی۔

کہا مطلب کیا ہے۔ کیا حاکم آپ کے قبضہ میں ہے کہ آپ آگے نہ جائیں گے تو وہ بھی نہ جائیں گے۔ وہ سمجھے کہ جس طرح ہر حکومت اور حاکم کے ساتھ دو چار ایسے آدمی لگے رہتے ہیں جن کی مٹھی میں حاکم ہوتا کہ جہاں کہہ دیا چلے جائیں گے۔ جہاں منع کر دیا نہیں جائیں گے۔ یہ بھی کوئی صاحب ہوں گے جو اتنا رعب و دبدبہ دکھلا رہے ہیں۔ کہ ہم اگر نہ جائیں گے تو نماز نہیں ہوگی۔

کہا آپ کون ہوتے ہیں۔ آپ سے کیا تعلق ہے۔ ان کو آنے دیجئے وہ نماز پڑھائیں گے۔ ہم نماز پڑھیں گے۔ آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کہا مشکل یہ ہے کہ جس علیؑ کے پیچھے تم نماز پڑھنے کے لئے بیٹھے ہو وہ میں ہی ہوں۔

کاہے کو کبھی قوم نے دیکھا ہوگا یہ لباس۔ کہاں قوم نے دیکھی ہوگی یہ پیوند دار چادر۔ کہاں قوم نے دیکھا ہوگا یہ سادہ لباس۔ کون باور کر سکتا تھا کہ یہ ہے خلیفۃ المسلمین۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ یہ ہیں امیر المومنینؑ۔ جو نماز پڑھانے کے لئے آئے ہیں۔ مگر جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ واقعاً یہی علیؑ ہیں جو نماز پڑھانے کے لئے آئے ہیں۔ سارا مجمع کھڑا ہو گیا۔ آیئے حضور تشریف لائیے۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ سب علیؑ کے پرستار ہیں یا حکومت کے پرستار ہیں۔ علیؑ آئے تو راستہ نہ دیا، حاکم آ گیا تو سارا مجمع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب تو آپ کو اندازہ ہوا کہ جو علیؑ کے ساتھ آگے تھے ان کی اکثریت حکومت والی تھی، امامت والی نہیں تھی۔

لہٰذا جس طرح ہر حکومت کے ساتھ وابستہ رہے۔ اب علیؑ حاکم ہو گئے تو ان کے ساتھ بھی وابستہ ہو گئے۔

یہ ایک منظر تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اس کے بعد وقت نہیں رہ گیا ہے کہ میں ان ساری باتوں کو گذارش کروں کہ کوفہ کیا تھا۔ اس کی آبادی کیا تھی۔ اس کے خصوصیات کیا تھے۔ کوفہ کب آباد ہوا ہے۔

جب کوفہ آباد ہوا ہے تو اس وقت کی صورت حال کیا تھی۔ تاریخ کا بیان ہے کہ کوفہ نے اس قدر اہمیت پیدا کر لی تھی کہ جو بدر کے بدریین کہے جاتے تھے وہ بھی اور دیگر اصحاب بھی آ کر کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ مختلف قبائل اِدھر اُدھر سے منتقل ہو کر کوفہ میں آباد ہو گئے۔ کسی قبیلہ کے بارہ ہزار آدمی۔ کسی قبیلہ کے آٹھ ہزار آدمی۔ کسی قبیلہ کے دس ہزار آدمی مختلف علاقوں سے آ کر آباد ہو گئے۔ مختلف قومیں آ کے آباد ہو گئیں۔ مختلف زبان والے آ کے آباد ہو گئے مختلف عقائد اور نظریات والے آباد ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ اسی کوفہ میں اگر آپ عقائد کو دیکھنا چاہیں گے تو کوفہ میں جتنا کاروبار تھا وہ عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ کوفہ میں جتنے سازشی کاروبار تھے وہ سب یہودیوں کے ہاتھ میں تھے۔ کوفہ میں سادے مسلمان بھی تھے اور کوفہ میں خارجی بھی آباد تھے۔

ایسا نہیں ہے کہ کوفہ کسی مخلصین کی بستی کا نام ہو۔ میں اس کی دلیل ابھی آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔

کوفہ کی یہی کیفیت بنیاد تھی کہ مولائے کائناتؑ بار بار اہلِ کوفہ کے حرکات پر ان کے اعمال پر تنقید کرتے رہتے یہاں تک کہ وہ منزل بھی آ گئی جب جناب امیرؑ نے خود یہ فرمایا کہ اگر شام کا حاکم مجھ سے درہم و دینار کا سودا کرنا چاہے تو میں تیار ہوں۔

درہم و دینار کے سودے کے معنی کیا ہیں۔ درہم و دینار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک دینار میں دس درہم۔ اگر حاکمِ شام درہم و دینار کا سودا کرنا چاہے۔ یعنی ہم سے دس لیلے اور اپنی فوج کا ایک دیدے تو ہم اس سودے کے لئے بھی تیار ہیں۔ کیوں؟ اس کا راز خود امیرالمومنینؑ نے اپنے خطبہ میں بیان کیا ہے۔ خطبہ نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ جس نے پڑھا

ہے وہ جانتا ہے، جس نے نہیں پڑھا ہے وہ جا کر دیکھے۔

کسی قوم کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کرنے سے پہلے اس کی تاریخ کو اور اس کے حقائق کو پڑھنا ضروری ہے ورنہ اتہام، اتہام ہے۔ الزام، الزام ہے۔ اس کو نہ حقیقت کہتے ہیں نہ نظریہ کہتے ہیں۔ امیرالمومنینؑ نے جس سودے کی بات کی کہ میں دس دے کر ایک لے سکتا ہوں۔ کیوں؟ کیا اس لئے کہ وہ سب متقی ہیں، پرہیز گار ہیں، وہ صاحبِ ایمان ہیں۔ فرمایا، "تم جانتے ہو کہ میں تمہارا امام برحق ہوں مگر اس کے بعد بھی تم میری اطاعت نہیں کرتے ہو، اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا راہنما باطل پر ہے مگر پھر بھی اطاعت کرتے ہیں۔

غور کیا آپ نے؟۔ میں حق پر ہوں تم جانتے ہو۔ مگر میری بات نہیں مانتے ہو۔ میں تم سے جہاد کے لئے کہتا ہوں تو جہاد کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حکم دیتا ہوں تو عمل نہیں کرتے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا راہنما باطل پر ہے مگر اس کے بعد بھی اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ تو جذبۂ اطاعت ایک قابلِ قدر جذبہ ہے چاہے کسی قوم میں پیدا ہو جائے۔ یہ کوفہ کی صورت حال ہے جو مولائے کائناتؑ نے بیان کی ہے۔ آپ خود اندازہ کریں کہ جن کو دس دے کر ایک لینے پر علیؑ تیار ہو جائیں کیا ان کو بھی علیؑ والا کہا جائے گا۔ اگر یہ علیؑ والے علیؑ کی نگاہ میں ہوتے تو مولائے کائناتؑ ایک ان میں کا دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر ان کو اپنے سے الگ کرنا، اپنے سے جدا کرنا اسی لئے چاہتے ہیں کہ مجھے حاکم دیکھ کر میرے ساتھ آ گئے ہیں۔ یہ وفادار نہیں ہیں۔ اور جو ایسے بے وفا افراد ہیں ان کو علیؑ کا پیرو اور علیؑ کا چاہنے والا کسی قیمت پر نہیں کہا جا سکتا ہے۔

یہ کوفہ کی ماضی کی صورت حال ہے جہاں دونوں طرح کے افراد، دونوں طرح کے نظریات اور دونوں طرح کے افکار موجود تھے۔

اس کے بعد جب امام حسینؑ مدینہ سے چل کر مکہ آئے اور مکہ میں امام حسینؑ نے قیام کیا۔ ۲۸ رجب کو امام حسینؑ نے مدینہ چھوڑا اور ۵ شعبان کو امام حسینؑ مکہ میں آ گئے۔ ۵ شعبان سے ۸ ذی الحجہ تک پورا شعبان کا مہینہ۔ رمضان کا مہینہ۔ شوال کا مہینہ۔ ذی قعدہ کا مہینہ۔ یہ چار مہینہ امام حسینؑ مکہ مکرمہ میں رہے۔ اس چار مہینہ کے دوران جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ فرزندِ رسولؐ

کو اتنا ستایا گیا ہے کہ امام حسینؑ نے وطن چھوڑ دیا ہے اور حرمِ خدا تک آ گئے ہیں۔ تو لوگوں نے جو محسوس کیا ہو اور جتنا محسوس کیا ہو کہ امام حسینؑ کیوں اٹھے ہیں اور امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا ہے۔ ایسے افراد بھی تھے جنھوں نے اس موقع کو بہترین موقع جانا کہ جب ظلم اس منزل پر آجائے کہ نبیؐ کے نواسہ کو وطن میں نہ رہنے دے تو ایسے ظالموں کے خلاف آواز اٹھانا بہت آسان ہے۔ نبیؐ کے نواسے کی مظلومیت کا سہارا لے کر۔ لہٰذا کوفہ میں ایسے افراد بھی پیدا ہوئے جنھوں نے یہ آواز اٹھائی جیسے سلیمان بن صرد، مسیب، حبیب بن مظاہر وغیرہ۔ اور ایسے افراد بھی تھے جنھوں نے اپنے مقصد کے لئے امام حسینؑ کی مظلومیت کو سہارا بنانا چاہا۔

چنانچہ اس چار مہینہ کے دوران امام حسینؑ کے پاس کم سے کم بارہ ہزار خطوط کوفہ سے آئے ورنہ اٹھارہ ہزار خطوط بلکہ اس سے بھی کم عرصہ میں جس کے بعد امام حسینؑ نے جناب مسلمؑ کو رخصت کر دیا تھا۔

ان بارہ ہزار خطوط کا تذکرہ تاریخ میں عدد کے اعتبار سے تو ملتا ہے مگر بارہ ہزار خطوط کسی کتاب میں درج نہیں ہیں کہ ان بارہ ہزار خطوط میں کیا لکھا ہوا تھا، ہاں یہ سب لکھتے ہیں کہ کم سے کم بارہ ہزار خطوط اس عرصہ میں اہلِ کوفہ نے فرزندِ رسول الثقلین امام حسینؑ کے پاس بھیجے۔ جن بارہ ہزار خطوط میں سات طرح کے مضامین کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔ یعنی سات خطوط کے مضامین مختصر یا مفصل موجود ہیں۔

پہلا خط جو امام حسینؑ کے پاس آیا ہے۔ اُس خط کا مضمون یہ ہے کہ فرزندِ رسولؐ ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ ظالم نے دنیا کو چھوڑ دیا ہے یعنی حاکمِ شام نے۔ وہ طاغی و باغی دنیا سے جا چکا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کو اتنا ستایا گیا ہے کہ آپ نے وطن چھوڑ دیا ہے اور مکۂ مکرمہ آ گئے ہیں۔ اب یہی وقت ہے قیام کرنے کا لہٰذا ہم لوگوں نے یہاں اجتماع کیا ہے اور اجتماع کرنے کے بعد یہ طے کیا ہے کہ آپ کو آپ کا حق ملنا چاہیئے۔ اگر آپ قیام کریں گے تو ہم سب آخری سانس تک آپ کا ساتھ دینے کے لئے، آپ کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم اپنے اجتماع کو برقرار

رکھنے کے لئے، اپنے اجتماع کو مستحکم بنانے کے لئے ایک امام، ایک قائد، ایک راہنما کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے درمیان ہو تو ہمارے قیام میں کوئی مانع نہیں ہے۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوں گے بس ہمیں ایک ایسا راہنما چاہیئے، ایک ایسا قائد چاہیے جو ہمارے اس قیام کی قیادت کر سکے۔

یہ ایک مضمون ہے پہلے خط کا جو امام حسینؑ کے پاس آیا اور یہ درحقیقت آج کی زبان میں وہ حسن ظن ہے جو اس میٹنگ میں پاس ہوا تھا جو پہلا جلسہ ہوا تھا امام حسینؑ کی حمایت میں جس میں جناب حبیب بن مظاہر، جناب مسیب، جناب سلیمان بن صرد اور ایسے دوسرے پرستارانِ حق اور معتقدین حقیقت موجود تھے لہٰذا یہ خط امام حسینؑ کے نام روانہ کر دیا گیا۔ جس خط کے بعد امام حسینؑ نے جناب مسلمؑ کو کوفہ کی طرف بھیجا ہے۔

دوسرا خط ٹھیک اسی کے پیچھے پیچھے آیا، اس کا بھی مضمون تقریباً یہی تھا۔

اس کے علاوہ جتنے خطوط آئے ہیں سب میں یہی ہے کہ جلدی آیئے۔ آیئے فرزندِ رسولؐ خرمے پک گئے ہیں۔ نہریں جاری ہیں۔ ماحول بڑا شاداب ہے۔ حالات بہت اچھے ہیں تشریف لایئے۔ العیاذ باللہ

ہم نے کبھی ایک مدت پہلے یہ تجربہ کیا تھا کہ مخلصین جو بعض دیہات میں رہنے والے ہوتے ہیں وہ اظہارِ خلوص و محبت اگر کرنا چاہتے ہیں تو اپنے چاہنے والوں سے جو شہروں میں آباد ہیں یہ کہتے ہیں کہ اب آم کی فصل تیار ہو گئی ہے یا مثلاً گنے کی فصل تیار ہو گئی ہے اب تشریف لایئے۔ تو یہ جو آم کی فصل میں بلاتے ہیں یہ کا ہے کے لئے بلاتے ہیں؟ کوئی مسئلہ پوچھنے کے واسطے بلاتے ہیں یا آم کھانے کے واسطے۔ مثلاً یا جو گنے کی فصل میں بلاتے ہیں وہ گنے کا رس پلانے کے واسطے بلاتے ہیں یا مسئلہ دریافت کرنے کے لئے۔ درحقیقت انھیں معاملات یا دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، ان کا مسئلہ نہ مذہب، نہ عقائد، نہ معلومات، یہ صرف دنیا کے تعلقات کے نبھانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

آیئے ذرا ان دونوں خطوط کا فرق پہچانئے۔

ایک خط آتا ہے کہ ہم کو یہ معلوم ہوا کہ اُس باغی طاغی کا انتقال ہو گیا ہے ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کو وطن سے باہر کر دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ آپ کے علاوہ حقدارِ خلافتِ اسلامیہ کوئی نہیں ہے۔ آپ اُٹھنے کے لئے تیار ہوں ہم جان دینے کے لئے تیار ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے اس اجتماع کے لئے ایک قائد چاہئے اور ہم نے اتنا انتظام کر لیا ہے کہ ہم کوفہ کے حاکم کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ہیں اس لئے کہ یہ نا اہل بادشاہ کا نمائندہ ہے۔

یہ ایک مضمون ہے اور دوسرا مضمون "خرمے پک گئے ہیں۔ نہریں جاری ہیں۔ ماحول شاداب ہے۔ حالات عمدہ ہیں۔ تشریف لائیے۔

آپ ان دونوں مضامین کے پڑھنے کے بعد خود سوچیں۔ کیا دونوں مضامین ایک ہی طرح کے ذہن کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔ نہیں۔ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ اسے آپ پہچان لیں تا کہ میں سلسلہ کو آگے بڑھاؤں۔ تھوڑی زحمت ضرور ہو گی مگر مسئلہ کو حل ہونا ہے تو کیا یہ دونوں مضامین ایک ہی طرح کے ذہن کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔ یعنی وہ آدمی جس کو ایک انقلاب کی فکر تھی، وہ آدمی جس کو قیام کی فکر تھی، وہ آدمی جس کو امام کی فکر تھی، وہ آدمی جس نے نماز جماعت میں جانا چھوڑ دیا تھا کہ پیش نماز نا اہل ہے۔ وہ آدمی جو یہ چاہتا ہے کہ امام حسینؑ آجائیں تا کہ ان کے ہاتھوں پر بیعت کر کے قیام کریں اور اسلام کو زندہ کرنے کی تحریک کو آگے بڑھائیں۔

اس آدمی کو یہ فکر ہو گی کہ خرمے پک گئے ہیں یا کچے رہ گئے ہیں۔ نہریں جاری ہیں یا ان کا پانی خشک ہو گیا ہے۔

یہ دونوں فکریں بتا رہی ہیں کہ پہلا خط دیندار ذہن کی ترجمانی کر رہا ہے اور دوسرا خط دنیادار ذہن کی ترجمانی کر رہا ہے کہ جہاں خرمے چاہئے۔ پانی چاہئے۔ آرام چاہئے۔ نہ امام چاہئے اور نہ ہدایت چاہئے۔ توجہ کی آپ نے؟۔ یہ تو دو ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ اب آئیے دونوں کے دستخط پہچانئے۔ جب پہلا خط آیا تو جن لوگوں نے دستخط کئے ہیں، وہ ہیں جناب سلیمان بن صرد، حبیب بن مظاہر، جناب مسیب اور ایسے ہی دیگر افراد۔ اور جب دوسرا خط آیا تو اس پر دستخط کرنے والے تھے حصین بن نمیر، عمر بن حریث اور شیث بن ربعی جیسے افراد جو کربلا میں

لشکرِ یزید کے سردار تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دونوں طرح کے خط لکھنے والے کربلا میں آ کے اکٹھا ہو گئے۔ سب نہ سہی تو کچھ اس خط والے آ گئے۔ کچھ اُس خط والے آ گئے، اور جو نہیں آ سکے انھوں نے واقعۂ کربلا کے بعد توابین کی جماعت کے ساتھ قیام کر کے اعلان کر دیا کہ ہم شہادتِ حسینؑ کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ یعنی ہم اب بھی حسینؑ کے ساتھ ہیں جیسے کہ پہلے حسینؑ کے ساتھ تھے اور یہ لوگ جو خرمے اور نہروں کی بات کر رہے تھے یہ سب لشکرِ یزید کے سردار اور علمدار دکھائی دے رہے تھے۔ اب دونوں ذہن پہچانیں۔

دیندار ذہن امامت کی بات کر رہا تھا۔ دنیا دار ذہن خرمے اور نہروں کی بات کر رہا تھا۔ جو دیندار تھے وہ حسینؑ کی حمایت میں آئے، جو دنیا دار تھے وہ حسینؑ کی مخالفت میں آئے۔ اب یہ فیصلہ ہر صاحبِ عقل کر سکتا ہے کہ حسینؑ والا کون تھا اور حسینؑ کا مخالف کون تھا۔ کوفہ نے دونوں طرح کے افراد پیدا کئے۔ فرق یہ ہے کہ جو حسینؑ کو امام ماننے والے تھے وہ حسینؑ پر قربان ہو گئے اور جو حسینؑ کو سبز باغ دکھلانے والے تھے انھوں نے حسینؑ کے قتل کا انتظام کیا۔ اب تو پہچان لیا کہ قاتل کا مذہب کیا ہے اور حمایت کرنے والے کا مذہب کیا ہے۔

یہ میں نے چند تاریخی حقائق آپ کے حوالے کر دیے تاکہ یہ باتیں آپ کے ذہنِ عالی میں محفوظ رہیں لیکن اب زیادہ طول دینے کا موقع نہیں ہے اور باتیں بہت سی گذارش کرنا ہیں۔ اب جلدی جلدی دو ایک جملے اور سُن لیں۔

واقعۂ کربلا کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے کہ امام حسینؑ، ان کے اصحاب، ان کے خاندان والے، یہ تھے شہید ہونے والے اور جو بھی قتل کا ذمہ دار ہو اب وہ مورخین خود طے کریں گے۔ اس لئے یزید کہتا ہے کہ ابن مرجانہ، ابن مرجانہ کہتا ہے کہ یزید۔ جو بھی ہو بالآخر قتلِ حسینؑ کا ذمہ دار یا یزید یا ابن زیاد ہے یا ابن سعد ہے یا شمر ہے یا خولی ہے یا سنان ہے۔ جو بھی ہے یہ تو ظاہر ہے، لوگ جانتے ہوں گے۔ جو ان سب کو پہچانتے ہیں وہ جانتے ہوں گے اور جو شہید ہونے والے ہیں ان کو بھی دنیا پہچانتی ہے

امام حسینؑ ہیں۔ ان کے اصحاب و انصار ہیں۔ ان کے خاندان والے ہیں۔ اور ان کی گود کے پالے ہیں۔

اب مجھے ایک بات گذارش کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ بات بڑی نازک ہے، لیکن اس کے بغیر بہر حال بات مکمل ہونے والی نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ علیؑ والے تھے جنھوں نے حسینؑ کو قتل کیا ہے۔ ان سے آج یہ گذارش کرتا ہوں کہ ان پوری چودہ صدیوں میں کسی ایک علیؑ کا کلمہ پڑھنے والے، علیؑ کے ماننے والے کی ایک کتاب، ایک رسالہ، ایک مضمون، ایک حصہ، ایک جملہ کہیں سے ڈھونڈھ کر نکالو کہ کسی نے کبھی یزید کی حمایت کی ہو۔ کبھی شمر کی حمایت کی ہو۔ کبھی ابن سعد کی حمایت کی ہو۔ کوئی تو ان قاتلوں کی تعریف کرنے والا ہوتا۔ اگر قتل کے ذمہ دار علیؑ والے تھے تو کسی نے تو اپنے بزرگوں کی تعریف کی ہوتی۔ کسی نے تو اپنے بزرگوں کی حمایت کی ہوتی۔

جتنے علیؑ والے چودہ صدیوں میں ہمارے سامنے آئے۔ سب حسینؑ کے چاہنے والے، سب اولادِ حسینؑ کے چاہنے والے، سب اصحابِ حسینؑ کے چاہنے والے۔ ہمارے مضامین، ہماری کتابیں، ہماری مجلسیں، ہمارے جلسے، ہمارے جلوس اس بات کا اعلان ہیں کہ ہم حسینؑ والے ہیں۔ ہم نے اس اعلان کی بڑی سنگین قیمت ادا کی ہے مگر اپنے کو حسینؑ والا کہتے تھے۔ کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے اس لئے کہ ہم نے یزید والا اپنے کو کبھی نہیں قرار دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ جو یزید سے بیزار ہے وہ قتل کا ذمہ دار کہا جاتا ہے۔ اور...... اب آگے خلافِ ادب ہے۔ میں کیا کہوں گا جو ہمیشہ یزید سے بیزاری کا اعلان کرتے رہے انھیں قتل کا ذمہ دار کہا جائے اور جو کبھی خلافتِ یزید ثابت کریں۔ کبھی کردارِ یزید ثابت کریں۔ کبھی عظمتِ یزید ثابت کریں۔ کبھی ایمانِ یزید ثابت کریں یہ قتلِ حسینؑ کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

میں صرف بات کو تمام کرتے ہوئے چار جملے، چار لفظیں ہیں جو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں، اس سے ہر انسان خود بات کو پہچان لے گا۔ میں نہ کسی کو ذمہ دار بنا سکتا ہوں اور نہ کسی کو ذمہ دار ٹھہرانا چاہتا ہوں۔ خود جس کا جی چاہے اپنی ذمہ داری قبول کرلے مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر یہ علامتیں ہیں۔

جن کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک لفظ درمیان میں اپنے بچّوں کے واسطے گزارش کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی بہت ہی عجیب و غریب بات ہے کہ اگر آپ کے محلّہ میں آج کوئی قتل ہو جائے۔ خدانکردہ کسی آدمی کو کسی نے قتل کر دیا تو پہلا سوال یہ ہوتا ہے کس نے مارا ہے۔ چاہے کسی کو معلوم ہو یا نہ معلوم ہو۔ مرحوم کے بارے میں کوئی کچھ پوچھے یا نہ پوچھے مگر یہ سوال ہر ایک کی زبان پر آتا ہے کہ قاتل کون ہے؟ ہم نے کہا چلئے گھر والوں سے چل کر پوچھتے ہیں۔ گھر والوں کو معلوم ہوگا۔ ہم کیا جانیں، ہم تو اس محلہ میں رہتے بھی نہیں ہیں۔ ان کے گھر والوں کو معلوم ہوگا کہ ان کا دشمن کون کون تھا۔ ان کا جھگڑا کس سے کس سے چل رہا تھا اور ان کے والد سے کس کس سے اختلاف تھا۔ چلئے چل کر پتہ لگائیں۔ وہاں پہونچے دیکھا بڑا مجمع لگا ہوا ہے اس لئے کہ جس نے جس نے خبر سُنی سبھی آ گئے اور سب اسی تفتیش میں آئے ہیں کہ یہ واقعہ ہوا کیسے؟ قاتل کون ہے؟ سب کو ایک ہی پریشانی ہے۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ ایک نوجوان روتا چلا آ رہا ہے۔ ایک نوجوان گھر سے روتا ہوا برآمد ہوا اور چار آدمیوں نے جب اس کو روتا دیکھا تو مُسکرانے لگے۔ اب جو صاحب ہمارے ساتھ تھے انھوں نے کہا کہ مولانا یہاں تک تو آپ پکڑ لائے۔ یہاں کیا معلوم ہوا" یہاں تو کچھ نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ ایک صاحب کھڑے رو رہے ہیں۔ میں نے کہا اب بھی آپ کو نہ معلوم ہوا۔ یہ جو رو رہے ہیں یہی قاتل ہیں اور یہ جو مُسکرا رہے ہیں یہی ہمدرد ہیں۔

انھوں نے کہا۔ مولانا ہم آپ کو سمجھدار، پڑھا لکھا سمجھ کے آئے تھے۔ یہ نہیں اندازہ تھا کہ گرمی سے عقل بھی ماری جاتی ہے اور انسان کا یہ حال ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ میں نے کیا غلط کہا؟

کہنے لگے عجیب بے عقلی کی بات کر رہے ہیں۔

میں نے کہا ارے خدانکردہ کسی کے بارے میں کچھ کہہ تو نہیں سکتا ہوں لیکن اگر کوئی حقیقت کو نہ سمجھے تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی پر وقت پڑے تو میں آپ سے اتنا پوچھوں گا کہ مُسکرانے والے کو قاتل کہا جاتا ہے یا رونے والے کو قاتل کہا جاتا ہے۔

عزیزانِ محترم! میں نے چار لفظیں گذارش کرنے کا وعدہ کیا ہے، انھیں چار منٹ میں آپ سماعت فرمالیں اور میں بات کو آخری منزل تک لے آؤں۔

پہلی بات جو ابھی میں نے آپ کے سامنے گذارش کی ہے کہ کوئی بھی ہمارا آدمی دورِ قدیم سے لے کر آج تک مولائے کائناتؑ کا ماننے والا، آلِ محمدؐ کا ماننے والا اہلبیتؑ سے محبت کرنے والا کوئی ایک انسان ایسا نہیں ملے گا جس نے کسی صدی میں، کسی دور میں، کسی زمانے میں، کسی ایک قاتل کے بارے میں اپنی اچھی رائے کا اظہار کیا ہو۔ ہمیشہ اظہارِ نفرت کیا ہے۔ اظہارِ بیزاری کیا ہے۔ اب تو دنیا کو اندازہ ہو گیا کہ جو آلِ محمدؐ سے ہمیشہ محبت کا، اُلفت کا اظہار کرتے رہے ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا کردار کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ کس کا ہے؟ میں نہیں جانتا لیکن ایک کردار کل بھی تھا اور آج بھی ہے جو قاتلوں سے ہمدردی رکھتا تھا اور رکھتا ہے، مگر مقتولین سے ہمدردی کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا جملہ آپ کو یاد دلاؤں، جب برادرانِ یوسفؑ جناب یوسفؑ کو کنویں میں ڈال کے چلے آئے اور اپنی دانست میں ان کی زندگی کا خاتمہ کر کے آئے اور آکے بابا کو خبر سُنائی کہ ہم نے یوسفؑ کو سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ بھیڑیا آیا اور اُن کو کھا گیا۔

آپ کا خیال صحیح تھا۔ آپ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ ہونے والا ہے۔ تو جناب یعقوبؑ نے یہ سُنا اور رونا شروع کر دیا۔ اتنا روئے کہ خود قرآن مجید کہتا ہے کہ آنکھیں سفید ہو گئیں۔ تو جو باپ تھا۔ جس کو محبت تھی جس کا فرزند تھا۔ جو اپنے لال کا چاہنے والا تھا۔ وہ اتنا رویا کہ آنکھیں سفید ہو گئیں اور جو کنویں میں ڈال کے آئے تھے اب ان کا بھی کردار سُنئے۔ خود قرآن مجید کہتا ہے کہ انھوں نے باپ سے کہا کہ اتنا زمانہ گذر گیا۔ بوڑھے ہو گئے۔ بارہ بچوں کے باپ ہو گئے، مگر اب بھی ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ "فی ضلالك القديم" وہی پُرانی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

دونوں کردار آپ کی سمجھ میں آگئے یا نہیں؟

ایک کردار جناب یعقوبؑ کا ہے جو اپنے بیٹے کو رو رہے ہیں۔ ایک کردار برادرانِ یوسفؑ کا ہے جو اس رونے کو گمراہی قرار دے رہے ہیں۔ اب بتاؤ یوسفؑ کا قاتل یعقوبؑ کو کہا جائے یا جو رونے کو گمراہی کہہ رہے ہیں انھیں کہا جائے۔

کم سے کم مسلمان اتنا ایمان تو قرآن پر رکھے۔ سب یہ کہتے ہیں کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے۔ اتنا ادراک، اتنا شعورِ قرآن بھی رکھنا چاہئے۔ اس کے بعد جو واقعہ کربلا کے بعد چاہنے والے اٹھے ہیں ان کے بیان کو بھی آپ نے دیکھا ہے۔ اب میں یہاں پر ایک جملہ کہہ کر بات کو تمام کرنا چاہتا ہوں۔

شہادتِ حسینؑ کے وقت بھی آپ نے دیکھا کہ دو طرح کے نظریات تھے۔ امام حسینؑ کے ساتھ بھی اور یزید کے ساتھ بھی۔ واقعۂ کربلا ختم ہو گیا ایک جماعت اب اٹھی کوفہ سے جناب سلیمان بن صرد، جناب مختار، مالک اشتر۔ یہ اٹھے ظالموں سے، قاتلوں سے انتقام لینے کے لئے تو کس کو مارا۔ ابن سعد کو جو قاتلِ حسینؑ تھا۔ کس کو مارا شمر کو جو قاتلِ حسینؑ تھا۔ کس کو مارا۔ ابن زیاد کو جو قاتلِ حسینؑ تھا۔ یعنی یہ جماعت وہ ہے جو حسینؑ کے قاتلوں کو قتل کر رہی ہے۔ جو امام حسینؑ پر ظلم کرنے والوں کو قتل کر رہی ہے۔ اب اس جماعت کے بارے میں بھی دو نظریے ہو گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جو کیا بالکل صحیح کیا۔ یہ ظالم اسی قابل تھے کہ انھیں ایسے ہی ان کے کیفرِ کردار تک پہونچایا جائے اور ایسے ہی تہ تیغ کیا جائے۔ کچھ کہتے ہیں کہ مختار جہنمی ہیں۔ مالک اشتر جہنمی ہیں۔ ارے دیکھے مسلمانوں کو مار ڈالا۔ مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ بھلا ان کی نجات کیسے ہو گی۔ ان کی عاقبت کیسے بنے گی۔ اب آپ کو اندازہ ہوا کہ جب فرزندِ رسولؐ مارا گیا تھا تو کوئی نہیں کہہ رہا تھا کہ یزید کافر ہے۔ نبیؐ کے نواسے کو مارا ہے۔ ابن سعد کافر ہے۔ نبیؐ کے بیٹے کو مارا ہے۔ ابن زیاد کافر ہے۔ نبیؐ کے لال کو مارا ہے۔ مگر جیسے ہی قاتل مارے گئے سب کو مختار کافر دکھائی دینے لگے۔ اب پہچانا آپ نے کس کا رشتہ نبیؐ کے لال سے ہے اور کس کا رشتہ کافروں سے ہے۔

اسی لئے میں ہمیشہ گذارش کرتا ہوں کہ مسلمان باہمی جھگڑوں میں نہ پڑیں۔ یہ

قاتل ہیں۔ وہ قاتل نہیں ہیں۔ جو قاتلِ حسینؑ ہے اس کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ نہ فرقہ اور نہ جماعت۔ ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہا جا سکتا ہے اور پچھلے دور کے مسلمان شاید نہ سمجھے ہوں مگر آج کے مسلمان میں اتنا شعور پیدا ہو گیا ہے کہ جب نبیؐ کے ساتھی سے اختلاف کرنے کے بعد آدمی مسلمان نہیں رہ جاتا ہے تو نبیؐ کے بیٹے کو قتل کرنے کے بعد کیسے مسلمان رہ جائے گا۔ ہم ایسے افراد کو مسلمان نہیں مان سکتے ہیں جو، ہم کہیں کہ اس فرقے کے تھے یا اُس فرقے کے تھے۔ یہ فرقوں میں لڑوانے والے، یہ فرقوں میں جھگڑا ڈالنے والے وہ ہیں جو غیروں کی سازش پر کام کر رہے ہیں اور یہ اپنی طرف سے نگاہ موڑنے کے لیے مسلمانوں کو آپس میں لڑوا رہا ہے۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم تو ایک بات جانتے ہیں کہ جو قتلِ حسینؑ کا ذمہ دار ہو یعنی جو نبیؐ کا خون بہائے اور میں نے غلط نہیں کہا ہے پیغمبرؐ نے خود فرمایا ہے کہ اس کا خون میرا خون ہے، اس کا گوشت میرا گوشت ہے۔ جو نبی کا خون بہائے وہ مسلمان کہے جانے کے قابل نہیں ہے اور بات بہت واضح ہے کل کا میرا فقرہ اگر یاد ہو تو خود ہی حساب لگا لیجیے گا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہم کیوں کہیں کہ مسلمان فرقوں میں بٹ گئے، جماعتوں میں بٹ گئے۔ ایک قاتل ایک مقتول۔ ایک طرف ان کے والے، ایک طرف اُن کے والے۔ ہم تو صاف جانتے ہیں کہ مسلمان صرف ایک تھا اور یہ جو قتل کے ذمہ دار ہیں یہ مسلمان نہیں تھے۔ کچھ فتح مکہ کی مجبوری کی بنا پر کلمہ پڑھ چکے تھے اور کچھ حالات کی نزاکت سے اسلام کا اعلان کر رہے تھے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ مسلمان سب آلِ رسولؐ کے چاہنے والے اور حسینؑ کے پرستار تھے۔ جو باہر والے آگئے ہیں ان کو ان کی جماعت میں واپس کر دو جو جبری کلمہ پڑھنے والے ہیں انھیں کفر کی طرف پلٹا دو۔ جو عیسائی عورت کا بچہ ہے اسے عیسائیوں کے حوالے کر دو۔ جو یہودی عورت کا بچہ ہے اسے یہودی عورت کے حوالے کر دو سارے اختلافات ختم ہو جائیں گے۔

ہم کسی مسلمان کو کسی ایسے مسئلہ کا نہ مجرم بنا سکتے ہیں اور نہ اس پر الزام رکھ سکتے ہیں۔ بھلا کیسے ممکن ہے کہ کوئی نبیؐ کا کلمہ پڑھنے والا ہو اور نبیؐ کی اولاد کا قاتل ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ واقعاً کوئی انسان مسلمان ہو اور اس کے بعد رسولؐ کا گھر اجاڑ دے۔ یہ بات تصور نہیں

کی جاسکتی ہے۔ یہ باہر والے ہیں جو اپنے عیب پر پردہ ڈالنے کے واسطے چاہتے ہیں کہ مسئلہ کو مسلمانوں کے درمیان ایسے جھگڑے میں ڈال دیا جائے کہ قیامت تک لڑتے رہ جائیں کوئی ہم کو مڑ کے دیکھنے بھی نہ پائے ورنہ ہم اس زہر کو بھی پہچانتے ہیں کہ اگر حاکم شام کے دربار میں عیسائی طبیب نہ ہوتا تو ابن ملجم کو ایسا زہر کہاں سے مل سکتا تھا۔

تاریخ کا فقرہ ہے کہ حاکم شام کے دربار میں ایک عیسائی طبیب تھا اور اس کا کام تھا فقط زہر بنانا اور وہ اسی لئے رکھا گیا تھا کہ لوگوں کو زہر کے ذریعہ قتل کر دیا جائے۔ اگر وہ عیسائی طبیب اور ایسا زہر بنانے والا نہ ہوتا تو ابن ملجم کو ایسا زہر کہاں سے مل جاتا اور اگر ایسے افراد نہ ہوتے تو اتنے بڑے بڑے واقعات تاریخ اسلام میں کیسے ہو جاتے۔

یہ باہر والے ہیں۔ کفر والے، شرک والے، عیسائیت والے اور یہودیت والے ہیں جو ہمیشہ اسلام کے دشمن رہے ہیں۔ کوئی اپنے خیبر کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ کوئی اپنے مباہلہ کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ کوئی بدر و اُحد کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ کچھ میں ہمت نہیں تھی۔ نہیں کہہ سکے۔ جس میں ہمت تھی اس نے کہہ دیا کہ کاش میرے بدر کے بزرگ زندہ ہوتے تو خوش ہوتے کہ میں نے بدلہ لے لیا تو جو بدر کے کافروں کا بدلہ لینے والا ہو کیا اسے بھی مسلمان سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ مسئلہ مسلمانوں کے درمیان کا نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اسلام اور کفر کا ہے۔ کفر نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کے اپنے اوپر نقاب ڈال کے چاہا تھا کہ مسلمانوں میں داخل ہو کے خانوادہ رسالت کو تباہ کر دے اور اسلام کی آواز کو دبا دے۔ یہ کفر کی حرکت تھی اور آج بھی اگر کوئی انسان ایسے افراد کی حمایت کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ پیچھے ہاتھ ہیں، کچھ پیچھے طاقتیں ہیں جو ان کے منہ سے کہلوا رہی ہیں ورنہ کسی مسلمان کا ضمیر یہ کہنے کے لئے تیار ہو جائے کہ نبیؐ کے نواسے کا خون بہانے والا۔ زہراؑ کے لال کو قتل کرنے والا سچا مسلمان، واقعی مسلمان اور حقیقی مسلمان ہے یہ کوئی انسان تصوّر بھی نہیں کر سکتا ہے۔ میں نے یہ باتیں آپ کے سامنے گذارش کر دی ہیں اور اس سے زیادہ طویل گفتگو کرنے کا عادی نہیں ہوں لہٰذا اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا ہوں ورنہ مسئلہ کو ایک دیہاتی نے علماء سے اچھا حل کر دیا تھا جب ایک دیہاتی سے

کسی آدمی نے کہہ دیا کہ تم کیوں روتے ہو، تمھارے ہی باپ دادا نے تو مارا ہے۔ تو اس بیچارہ دیہاتی نے بالکل سادہ انداز سے کہا، اچھا وہ جنھوں نے مارا تھا وہ ہمارے باپ دادا تھے؟۔ کہا بالکل۔ کہا تمھارے تو کوئی نہیں تھے۔ ہمارے باپ، دادا، پردادا کوئی بھی رہے ہوں گے۔ تمھارے تو کوئی نہیں تھے۔ تو اگر ہمارے تھے تو ہمارا جی چاہے گا تعریف کریں گے۔ جی چاہے گا لعنت کریں گے۔ تم سے کیا تعلق ہے۔

لیکن جب لعنت کریں گے تو دیکھیں گے کہ آپ کا حال کیا ہوتا ہے اور جب آپ کا ردِ عمل سامنے آجائے گا تو خود ہی واضح ہو جائے گا کہ کون کس کا والا تھا۔

بس عزیزانِ محترم! اس سے زیادہ اب میں گذارش نہیں کرسکتا اس لئے کہ بہر حال میں اپنے بیان کو منزلِ مصائب تک لے جانا چاہتا ہوں۔ اس فرشِ عزا کی اہمیت نہ ہم سمجھیں گے نہ آپ سمجھیں گے اسے وہ ماں سمجھتی ہے جسے اس کی حسرت تھی اور جس کی یہ تمنا تھی۔ جس نے اپنے باپ سے پوچھا تھا۔ بابا جب ہم میں سے کوئی نہ رہے گا تو میرے لال کی صفِ عزا کون بچھائے گا اور پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ خدا ایک قوم پیدا کرے گا تو یہ ذمہ داری ہم پر آپ پر عائد ہوتی ہے۔ وجود کے اعتبار سے، شرکت کے اعتبار سے، تعاون کے اعتبار سے۔ ہر اعتبار سے اگر ذرّہ برابر ہم نے کوتاہی کی اور خدا نکردہ اس وقارِ عزا میں اور اس عظمتِ ماتم میں ذرّہ برابر کمی ہوگئی تو اس کی مسئولیت اور اس کی ذمہ داری روزِ قیامت ہماری اور آپ کی گردن پر رہے گی۔ ہمیں اس دُکھیا ماں کو کیا جواب دینا ہے۔

اس کا اہتمام، اس کا انصرام اور اس کے بارے میں ہر طرح کی ذمہ داری کا احساس ہر آدمی کو ہے اور ہونا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں اور میرے مزاج سے باخبر ہیں کہ میں ہمیشہ قوم کو ان کی ذمہ داریوں سے، ان کے فرائض سے آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ جو حرام باتیں ہیں ان سے روکتا ہوں۔ جو واجب باتیں ہیں ان کی دعوت دیتا ہوں۔ لہٰذا میں اگر آپ سے پیسہ کی گفتگو کروں گا تو یہ آپ کے فریضہ کی بات ہوگی چندہ کی بات نہیں ہوگی۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس فرشِ عزا کو قائم رکھیں، اس وقار کو برقرار رکھیں، اس

عظمت کو برقرار رکھیں جیسے ممکن ہو۔ آپ کے گھر میں کیا ہوتا ہے اور آپ کے گھر میں کتنا غم منایا جاتا ہے وہ آپ کے گھر کا مسئلہ ہے۔ مگر یہ مسئلہ اجتماعی طور پر ہر آدمی کے لئے اہمیت رکھتا ہے اور سب کا فریضہ ہے جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کر رہا ہوں۔

میرے پاس الحمد للہ ہندوستان میں ساڑھے چھ سو اسکول ہیں جن کا پچیس لاکھ روپیہ سال کا خرچ ہے۔ ساڑھے چار سو تنظیم المکاتب کے اسکول پاکستان میں کام کر رہے ہیں جن کا لاکھوں روپیہ سال کا خرچ ہے لیکن آپ بتائیے کبھی میں نے آپ سے پیسے کی اپیل کی ہے۔ آپ تو سال بھر میں منبر کے نیچے آ کے بیٹھتے ہیں۔ میں کبھی اس کا قائل نہیں ہوں۔ میں ہر آدمی کو اس کا فریضہ بتاتا ہوں۔ تعلیم دین کے بارے میں آپ کی ایک ذمہ داری ہے جو خمس و زکوٰۃ سے پوری ہوتی ہے۔ فرشِ عزا کے بارے میں آپ کی دوسری ذمہ داری ہے جس میں آپ کو براہِ راست حصہ لینا ہے۔ آپ کی ذمہ داری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اگر آپ نے چار پیسہ خرچ کر دیئے تو مجھ پر یا کمیٹی یا انجمن پر کوئی احسان کیا ہے۔ آپ نے اپنے فرض کو ادا کیا ہے۔ اور اگر نہیں کیا ہے تو اپنے فرض سے کوتاہی کی ہے جس کا جواب آپ کو روزِ قیامت دینا ہوگا۔

اور یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ پہلی محرم یا اس کے پہلے سے آٹھ ربیع الاول تک ستر مجلسوں کے پروگرام میں کسی صاحب سے پانچ روپئے نکل آئے۔ کسی صاحب سے دس روپئے نکل آئے۔ پانچ روپئے دس روپئے میں تو آدمی کسی کو اپنے گھر میں ایک چائے نہیں پلاتا ہے چہ جائیکہ ستر مجلسوں کا قیام۔ یہ سوال بھی عجیب و غریب پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے لئے کیا کرتے ہیں اور اپنے دین، اپنے مذہب کے لئے کیا کرتے ہیں۔ ہم اپنے لئے کیا کرتے ہیں جن پر کوئی قربان ہونے والا نہیں ہے اور ان کے لئے کیا کرتے جن پر ہم کو قربان ہونا ہے۔ یعنی اگر ستر مجلسوں کے حساب سے ستر درہم بھی ایک آدمی خرچ کرے تو شاید "یہ کچھ" کہا جائے اس لئے کہ "وہ کچھ" ہی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ کیا حقیقت ہے ایک درہم کی ایک مجلس کے مقابلہ میں اگر اپنے گھر میں خدانکردہ کسی کا انتقال ہو جائے اور ایک سوم کی مجلس کرنا ہو تو سیکڑوں ہزاروں خرچ

کرنے کے لئے آدمی تیار ہو جاتا ہے اور جب اجتماعی کام ہوتا ہے تو اپنے فرض کو اور اپنی ذمہ داری کو نہیں سمجھتا ہے۔ میں پھر گذارش کروں گا کہ یہ کوئی چندہ کی اپیل نہیں ہے۔ یہ فرض کا احساس ہے جو میں ہر آدمی میں پیدا کرانا چاہتا ہوں۔ جس میں پیدا ہو جائے وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے۔ میں توجہ اس لئے دلا رہا ہوں کہ کل آنے والی رات عاشور کی رات اور فیصلے کی رات ہے۔ بڑے بڑے فیصلے حسینیت کے بارے میں عاشور کی رات ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم اور آپ بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور یہ سمجھیں کہ یہ ذمہ داری ہم پر ہے چاہے ہمیں کسی سے اتفاق ہو یا اختلاف ہو۔ لیکن فرض کی ذمہ داری ہر مومن پر ہے اور اس کے وقار اور اس کے احترام کو برقرار رکھنا۔ اتنا بڑا کام۔ اتنی آسانی سے نہیں ہو جاتا ہے۔ کتنی ریاضتیں کتنی محنتیں افراد کی شامل رہی ہیں اور کتنا خلوص، کتنا ایثار آپ کا شامل رہا ہے۔ جو آج آپ اتنا بڑا اجتماع دیکھ رہے ہیں کہ دیکھنے والوں کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس دیارِ غربت میں حسینؑ کے چاہنے والے ہیں اور یہ خود ایک بہترین دلیل ہے کہ حسینؑ والا کون ہے۔

ورنہ کس کے گھر میں اس سے اچھی چٹائی نہیں ہے۔

آپ اتنے افراد یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی ایسا غریب مفلس بھی ہے جس کے گھر میں ایسی ہی چٹائی بچھی ہو۔ اس سے اچھے کارپٹ پر لوگ چپلیں پہن کر چلتے ہیں مگر آج یہ فرشِ عزا، حسینؑ ابن علیؑ کی طرف منسوب ہو گیا ہے تو نہ کوئی کپڑوں کی صفائی دیکھتا ہے نہ راحت و آرام۔ اپنے گھر میں ایک لمحہ کے لئے الکٹرسٹی بند ہو جائے تو گھر چھوڑ کے باہر نکل جائیں مگر یہاں ڈیڑھ گھنٹہ دو گھنٹہ تک گرمی میں، شدت کی گرمی میں پسینہ میں ڈوبے جارہے ہیں مگر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کون سا جذبہ ہے؟۔ یہ حسینؑ بن علیؑ کی محبت ہے۔ یہ حسینیت کا ایک جذبہ ہے جو ہر مومن کو یہاں تک کھینچ کر لایا ہے کہ نہ کسی کو فرش کی فکر ہے نہ کسی کو شامیانے کی فکر ہے۔ نہ کسی کو ماحول کی فکر ہے نہ کسی کو آرام کی فکر ہے اور نہ کسی کو سردی گرمی کا خیال ہے اور ہم کیا گرمی کا خیال کریں۔ یہ گرمی کوئی گرمی ہے۔ ہم کیا ماحول کو دیکھیں۔ رات کی ٹھنڈک میں اور ہلکی ہلکی ہوا کا جھونکا جو آجاتا ہے ایسے ماحول میں اگر ہم بیٹھے ہیں تو یہ کوئی گرمی

گرمی کا حال تو ان سے پوچھئے جن کو تین دن سے پانی نہیں ملا۔ گرمی کا حال کوئی ان سے پوچھے جو خیموں میں زندگی گذار رہے تھے۔ دوسری محرم سے دس محرم تک آٹھ دن تک اس ریگستان میں جنھوں نے زندگیاں گذاری ہوں۔ جنھوں نے ان مصائب کا سامنا کیا ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ گرمی کیا ہوتی ہے۔ پیاس کیا ہوتی ہے۔ مصیبت کیا ہوتی ہے۔ ہم تو ان مصائب کا احساس بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر احساس کر لیں واقعتاً تو انسان کا کیا عالم ہو گا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ یہ تو ہلکی سی توجہ پیدا ہو جاتی ہے جو آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ ہلکا سا خیال پیدا ہو جاتا ہے جو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

آج میں اپنے کسی جوان سے پوچھوں کہ تم بتاؤ تمہاری عمر جب اٹھارہ سال کی تھی یا میرے نوجوانو اگر آج تمہاری عمر اٹھارہ سال کی ہے تو تم بتاؤ زندگی کے بارے میں تمہارا جذبہ کیا ہے اور میں اپنے بزرگوں سے پوچھتا ہوں کہ تمہارا بیٹا اگر اٹھارہ سال کا ہے تو تم بتاؤ کہ اپنے بیٹے کے بارے میں تمہارے جذبات کیا ہیں اور میری بہنیں بتائیں کہ اٹھارہ سال کے بیٹے کے بارے میں ان کے جذبات کیا ہیں اور جب اپنے اپنے حالات پر غور کر لینا تو سوچنا لیلیٰ کے پہلو میں کون سا دل تھا۔ دخترِ زہراؑ کے پہلو میں کون سا دل تھا حسینؑ کا کلیجہ کیا تھا کہ جب چاہنے والے کام آگئے تو آواز دی "بُنَیَّ اَکبرُ تَقَدَّم" بیٹے وقت آگیا بیٹا اب قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ۔

بس آپ متوجہ ہیں میں زیادہ گذارش نہیں کروں گا۔ یہ حسینؑ کے حوصلے اور ہمت کا پہلا مظاہرہ تھا کہ کڑیل جوان کو بلایا اور بلا کر کہا "بُنَیَّ تَقَدَّم" میرے بیٹے اب تم جاؤ۔ میرے لال اب تم جاؤ۔ باپ کا حکم ملنا تھا کہ اکبر جن کی رگوں میں خونِ شجاعت جوش مار رہا ہے جو کب سے باپ پر قربان ہونے کے لئے بے چین ہیں فوراً تیار ہو گئے۔ کہا میرے لال مگر یوں نہیں جانا ہو گا۔ پہلے خیمہ میں جاؤ پھوپھی سے اجازت لے کر آؤ۔ سیدانیوں کو سلام کر کے آؤ۔ بیبیوں سے رخصت ہو کر آؤ اس کے بعد میدان میں جانا۔

بس عزیزو! یہ سننا تھا کہ جوان بیٹا خیمہ کی طرف چلا۔ خیمہ میں آئے۔ آ کے پھوپھی کے سامنے دستِ ادب جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ پھوپھی اماں! مجھے مرنے کی اجازت دید یجئے۔

زینبؑ نے اپنے لال کو سر سے پیر تک دیکھا۔ ہاں میرے لال میں نے تمہیں اٹھارہ سال اسی دن کے لئے پالا تھا کہ تم مجھ سے مرنے کی اجازت لینے کے لئے آؤ گے مگر میرا بھیا زغۂ اعدا میں گھرا ہے لہٰذا اکبرؑ میں تمہیں روک نہیں سکتی۔ اگر تم قربان ہو جاؤ اور بھیا تھوڑی دیر بھی بچ جائیں تو میں ایسے کتنے علی اکبرؑ قربان کر سکتی ہوں۔

رخصت کیا سیدانیوں سے رخصت ہوئے۔ سب سے رخصت ہوئے اب خیمہ گاہ سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ بیبیوں نے کہا۔ علی اکبرؑ ایک لمحہ کے لئے ٹھہر جاؤ۔ علی اکبرؑ نے کہا بیبیو! تمہیں تو معلوم ہے کہ وقت کتنا نازک ہو گیا ہے۔ میرا بابا زغۂ اعدا میں گھرا ہوا ہے۔ چاہنے والے سب راہِ خدا میں قربان ہو چکے ہیں جلدی بتاؤ کہ مجھے کیوں روکا ہے۔

کہا ٹھہرو! سیدانیوں نے حلقہ بنایا۔ علی اکبرؑ حلقہ کے درمیان ہیں۔ ایک مرتبہ بیبیوں نے بیک زبان ایک جملہ کہا۔ علی اکبر جاتے ہو تو جاؤ۔ مگر "اِرحَم غُربَتنَا" اے علی اکبرؑ ہماری غربت پر رحم کرنا۔ اے علی اکبرؑ ہماری بیکسی کا خیال رکھنا۔ بس یہ سننا تھا کہ ایک مرتبہ شہزادے نے مڑ کر دیکھا۔ ارے بیبیو! تمہیں اپنی غربت کا خیال ہے میرے بابا کی غربت کا کچھ خیال نہیں ہے۔ مجھے رخصت کرو۔ ارے میرا بابا اکیلا ہوا جا رہا ہے۔ چاہنے والے قربان ہو گئے۔ سیدانیوں نے رخصت کیا۔ علی اکبرؑ درِ خیمہ کے قریب آئے خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ باہر نکلنا چاہتے ہیں مگر راوی کہتا ہے کہ جیسے ہی علی اکبرؑ نے خیمہ کا پردہ اٹھا کر باہر نکلنا چاہا۔ کسی نے دامن پکڑ کر کھینچ لیا۔ علی اکبرؑ واپس چلے آئے۔ پھر خیمہ کا پردہ اٹھا۔ پھر جانا چاہتے ہیں۔ پھر کسی نے روک لیا۔ سات مرتبہ خیمہ کا پردہ اٹھا اور گرا اور اب جو اکبرؑ نکلے تو اس شان سے نکلے جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

بس مجھے ایک جملہ کہنا ہے جہاں تک سوچ سکو سوچنا۔ مجھے مقتل میں کوئی فقرہ نہیں ملا۔ مجھے روایت میں کوئی لفظ نہیں ملا۔ مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پھوپھی نے تو رخصت کر دیا۔ بیبیوں نے تو خدا حافظ کہہ دیا۔ ماں نے تو روکا نہیں۔ یہ کون ہے جو علی اکبرؑ کو بار بار روک رہا ہے۔ نام تو کوئی نہیں ملا مگر ایک خیال یہ کہتا ہے کہ اگر کسی بزرگ نے روکا ہوتا تو بازو

تھاما ہوتا۔ یہ کون ہے جو دامن پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ عجب نہیں کہ چھوٹی بہن نے کہا ہو بھیّا علی اکبرؑ کہاں جا رہے ہو۔

علی اکبرؑ نے دامن چھڑایا۔ باپ کے سامنے آئے۔ باپ نے بیٹے کو تیار کیا۔ گھوڑے پر بٹھایا۔ جاؤ میرے لال جاؤ مگر ایک بات کا خیال رکھنا جب تک میرا تمھارا سامنا رہے بیٹا مُڑ مُڑ کے دیکھتے رہنا۔

علی اکبرؑ چلے۔ میدان میں کچھ دور چلے تھے کہ ایک مرتبہ آہٹ محسوس کی۔ پلٹ کے دیکھا۔ دیکھا ضعیف باپ کمر تھامے چلا آ رہا ہے۔ ارے بابا آپ نے تو رخصت کر دیا تھا۔ آپ کیوں آئے؟ کہا بیٹا اگر تم بھی صاحبِ اولاد ہوتے تو تمھیں اندازہ ہوتا کہ جوان کے میدان میں جانے کے بعد ضعیف باپ کا کیا عالم ہوتا ہے۔ علی اکبرؑ نے روک دیا۔ حسینؑ رُک گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر مقتل سے آواز آئی "یَا اَبَتَاهُ عَلَیْكَ مِنِّی السَّلَامُ" بابا میرا آخری سلام لیجیے۔ حسینؑ گرتے پڑتے چلے۔ آواز دی یا علیؑ! یا علیؑ! میں نہیں جانتا کسے بُلا رہے ہیں۔ شاید باپ کو آواز دیتے ہوں کہ بابا۔ جوان کے سرہانے جا رہا ہوں، یا علی اکبرؑ کو آواز دے رہے ہوں۔ بیٹا اب کچھ سُجھائی نہیں دے رہا ہے۔ تم آواز دو کہ باپ تمھاری آواز کے سہارے آجائے۔ میں کہوں گا مولا۔۔۔۔ بیٹے کو آواز دینے کے واسطے نہ کہیے، آواز کا سارا زور سینے پر پڑتا ہے۔ علی اکبرؑ کے سینے میں برچھی کا پھل ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ علی اکبرؑ کس طرح آواز دیں گے۔

حسینؑ گرتے پڑتے بیٹے کے سرہانے پہونچے۔ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے۔ سانس رُک رُک کر آ رہی ہے۔ ایک مرتبہ علی اکبرؑ نے دم توڑا اور حسینؑ نے مرثیہ شروع کر دیا۔ علی اکبرؑ تمھارے بعد زندگانی دنیا پر خاک ہے۔ بیٹا تمھاری مصیبت تمام ہو گئی اور باپ نرغۂ اعدا میں اکیلا رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

مجلس نمبر ۱۰

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ مَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَھْلِ بَیْتِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ o اَمَّا بَعْدُ!

"اے نفس مطمئن! پلٹ آ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں۔ تو ہم سے راضی ہے ہم تجھ سے راضی ہیں آ میرے بندوں میں شامل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔"

سورۂ مبارکہ فجر کی ان آخری آیاتِ کریمہ کے ذیل میں جو سلسلۂ بیان "کربلا شناسی" کے عنوان سے شروع ہوا تھا آج اس کی آخری کڑی آپ کے سامنے گذارش کرنا ہے۔ اس کے بعد کل دن کی مجلس میں صرف ذکر مقتل ہوگا۔

آج ایک اہم مسئلہ کی طرف اپنے تمام سامعین کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

اب تک میری ساری گفتگو کا تعلق خود امام حسینؑ اور ان کے اقدام سے تھا۔ آج کی گفتگو کا تعلق شہادتِ امام حسینؑ کے بعد ان مراسم عزا سے ہے جو ہر دور میں قائم ہوتے رہے ہیں اور انشاء اللہ صبح قیامت تک قائم رہیں گے۔

وہ لوگ جن کو عزائے سید الشہداء سے کسی بنیاد پر اتفاق نہیں ہے ان کے سامنے چند مسائل ہیں۔ میری شرعی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ناواقف افراد کو واقف بنانے کے لئے یا ذہنی طور پر جن میں قدرے انحراف پایا جاتا ہے انھیں راہِ حق سے آشنا بنانے کے لئے ان اعتراضات کا ایک خلاصہ اور اس کے بارے میں جو وضاحت ہے وہ آپ کے سامنے عرض کردوں۔ اس کے بعد ہر انسان صاحب اختیار ہے "اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ

اِمّا کفُورًا" اللہ کا کام بھی راستہ دکھلا دینا ہے۔ اس کے بعد انسان صاحبِ اختیار ہے چاہے اللہ کا شکر گذار بندہ بن جائے یا نعمت الٰہی کا انکار کرنے والا ہو جائے۔

عزائے سید الشہداء کے بارے میں جو مسائل ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ان کا مختصر تذکرہ آپ کے سامنے پیش کرنا ہے آپ نے بہت سے تذکرے سُنے ہیں اور سُنتے رہتے ہیں اور انشاء اللہ سُنتے رہیں گے۔

پہلا مسئلہ جس نے بہت سے مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے وہ ہے مسئلہ بدعت۔

بدعت کی تعریف عام طور سے یہ کی جاتی ہے کہ ہر وہ چیز جو سرکارِ دو عالمؐ کے بعد ایجاد ہوئی ہے اسے بدعت کہا جاتا ہے اور چونکہ مراسم عزا ء سید الشہداءؑ کی مجالس، ماتم اور یہ ساری چیزیں سرکارِ دو عالمؐ کے بعد ایجاد ہوئی ہیں لہٰذا ان کا شمار بھی بدعت میں ہونا چاہئے اور بدعت ضلالت ہے، گمراہی ہے اور بدعت کا آخری انجام ہلاکت اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

یہ پہلا خیال ہے جو اکثر لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گیا ہے یا پیدا کرا دیا گیا ہے اور اسی لئے بہت سے لوگ بدعت کے خوف سے فرشِ عزا سے دور رہنا چاہتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مبتلائے بدعت ہو جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مبتلائے ضلالت ہو جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا انجام خراب ہو جائے۔

لیکن عزیزو! اس مقام پر جو بات مجھے گذارش کرنی ہے وہ یہ ہے کہ خود علماء کرام اس بات کی طرف ہمیشہ متوجہ رہے ہیں کہ نبیؐ کے بعد ہر ایجاد ہونے والی چیز کو بدعت نہیں کہا جا سکتا ہے ورنہ آج جتنی دنیائے اسلام ہے اور عالم اسلام میں جتنے افراد پائے جاتے ہیں سب کا وجود بدعت ہو جائے گا اس لئے کہ کوئی بھی سرکارِ دو عالمؐ کے دَور میں نہیں تھا۔ گویا کہ اصل وجود جو گمراہی سے بچا تھا وہ صرف ان کا تھا جو حضورؐ کے دَور میں تھے اور اس کے بعد جتنے پیدا ہوتے رہے ہیں یہ سب بدعتی وجود ہیں تو کیا واقعاً ان سب کے وجود کو بدعت کہہ دیا جائے گا یا ضلالت اور گمراہی قرار دیدیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایسا کوئی تصوّر عالمِ اسلام میں نہیں ہے، لہٰذا جو صاحبانِ نظر علماء تھے انھوں نے کہا کہ بدعت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر وہ چیز جو نبیؐ کے بعد پیدا ہوئی ہے اُسے

بدعت کہہ دیا جائے بلکہ بدعت کے معنی یہ ہیں کہ سرکارِ دو عالمؐ کے دَور میں جو چیزیں تھیں ان کا فیصلہ تو خود پیغمبرؐ نے فرما دیا تھا کہ یہ جائز ہے، یہ ناجائز ہے، یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، اس کی شریعت میں گنجائش ہے اور اُس کی گنجائش نہیں ہے۔ نبیؐ کے بعد جو چیزیں ایجاد ہوئی ہیں اگر کوئی انسان ان چیزوں کو بغیر شریعت کی اجازت کے شریعت میں داخل کرنا چاہے تو اس دخل اندازی کا نام بدعت ہے اور یہ بہر حال ضلالت ہے، گمراہی ہے غلط ہے اور یقیناً حرام ہے۔ نہ فقط وہ چیز جو نبیؐ کے بعد ایجاد ہوئی ہے بلکہ ہر وہ چیز جس کا مذہب میں دخل نہیں ہے اور اس کو مذہب میں داخل کیا جائے مثلاً نبی نے جائز بتایا آپ اسے حرام کر دینا چاہتے ہیں۔ نبیؐ نے حرام کیا آپ اسے حلال کر دینا چاہتے ہیں۔ شریعتِ پیغمبرؐ کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ قانونِ الٰہی میں تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ شریعت میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم، کوئی اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ عمل بہر حال حرام ہے، ناجائز ہے، گمراہی ہے۔

لیکن میں اس ذیل میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بات بالکل صحیح ہے مگر اس میں نبیؐ کے بعد کی قید کیا ہے کہ حضورؐ کے بعد اگر شریعت میں اضافہ کیا جائے تو حرام ہے۔ حضور کے بعد شریعت تبدیل کی جائے تو حرام ہے۔ سو سال کے بعد یہ کام ہو تو حرام ہے۔ ہزار سال کے بعد یہ کام ہو تو حرام ہے۔ اس میں تو زمانے کی کوئی قید نہیں ہے اگر نبیؐ کے دَور میں بھی یہ کام کیا جائے گا جب بھی حرام ہی رہے گا۔ اگر نبیؐ کے دو سال کے بعد یہ کام ہو گا جب بھی حرام ہی ہو گا۔ دس سال کے بعد ہو گا جب بھی حرام ہی ہو گا۔ ہم تو روزِ اوّل سے یہی احتجاج کرتے چلے آئے ہیں کہ ہم نے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ حلالِ محمدؐ کو حرام بنا سکے یا حرامِ محمدؐ کو حلال بنا سکے۔

اب یہاں پر دو باتیں ہیں :

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ دنیا کی مثال نہ دیں۔ دینداری میں اور دین کے معاملات میں جو چیزیں پیدا ہو رہی ہیں ان کو بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ سرکارِ دو عالمؐ کے دَور میں ہوتا تھا۔ دنیا میں آپ کچھ بھی کریں۔ داڑھیاں بنائیں، مونچھیں بنائیں۔ مانگ

بنائیں۔ کچھ کریں مگر یہ سب دنیا کے معاملات ہیں ان میں آپ کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن جو دینی مسائل ہیں ان کو ویسے ہی رکھیں جیسے وہ سرکارِ دو عالمؐ کے دَور میں تھے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ اگرچہ ہمارا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم سے مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ دینی معاملات کو ویسے ہی رکھیں جیسے سرکارِ دو عالمؐ کے دَور میں تھے۔ آپ کا سارا زور اس بات پر ہے کہ جیسے سرکارِ دو عالمؐ کے دَور میں تھے جتنی جلدی ممکن ہو اسے مٹا دیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں میں ان کے احترام کا جذبہ پیدا ہو جائے اور بدعت کا خطرہ ختم ہو کے شرک کا خطرہ پیدا ہو جائے کہ یہ دوسری نئی پریشانی ہے۔

لہٰذا اب اگر آثار کو باقی رکھنا ہے تو کون سا ایسا اثرِ مذہب ہے جو حضوؐر کے دَور میں ایسا ہی تھا جیسا کہ آج ہے۔ آج کے دَور میں جو مسجدیں بنی ہوئی ہیں کیا ایسی ہی حضوؐر کے دَور میں تھیں۔ کیا یہ سب سرکارِ دو عالمؐ کی ہدایت کے مطابق تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ تو خالص مذہبی مسئلہ ہے۔ مسجد تو اللہ کا گھر ہے، نہ آپ کا گھر ہے نہ میرا گھر ہے۔ اس میں آپ کی اور ہماری تختیوں کا کیا کام ہے۔ ہماری آپ کی ریاستوں کا کیا کام ہے۔ ہمارے آپ کے تذکرے کا کیا کام ہے لیکن چونکہ ہمارا نام آگیا ہے لہٰذا اسے بدعت نہ کہا جائے البتہ اگر کسی اور کا نام آجائے گا تو وہ بھی بدعت کہا جائے گا۔

عزیزو! بات ایک ہے۔ شریعت کے معاملات میں دخل اندازی، شریعت میں تغیر و تبدل، یہ کسی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ مگر پہلے شریعت کو پہچاننا ہوگا اور شریعت کے پہچاننے کے لئے ایک قانون کو یاد رکھنا ہوگا جو ایک قرآنی قانون ہے اور ایک سرکارِ دو عالمؐ کا بنایا ہوا قانون ہے اور دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اسلام۔

یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ اگر شریعت میں جتنی چیزیں جائز ہیں اور جتنی چیزیں حرام کی گئی ہیں ان دونوں کی فہرست اگر بنائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ناجائز چیزیں بہت محدود ہیں اور ان کے مقابلہ میں جو جائز ہیں وہ بے شمار ہیں۔ مثلاً دنیا میں جتنے جانور پائے جاتے ہیں، جن کا گوشت حلال کیا گیا ہے ان کے مقابلہ میں وہ کتنے ہیں جن کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔

دنیا میں کتنی کھانے پینے کی چیزیں ایسی ہیں جو حلال ہیں اور ان کے مقابلہ میں وہ کتنی ہیں جو حرام ہیں۔

کتنے شربت حلال کئے اور ایک شراب کو حرام کیا گیا۔

کتنی چیزیں کھانے کی حلال کی گئیں اور دو چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا تو جن کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا وہ بہت محدود ہیں اس پوری کائنات کے مقابلہ میں جن کو حلال اور جائز قرار دیا گیا ہے۔

اسی لئے شریعت نے ایک آسان راستہ نکالا کہ ہم جائز کی فہرست بنائیں گے تو بہت طویل ہوگی۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ فہرست ناجائز کی بنادیں۔ بس ان سے اپنی جان بچالو تو باقی سب تمہارے لئے حلال ہے۔

اتنی مخلوقات کے درمیان جس کو پاک بنایا۔ صرف کافر نجس ہے۔ اتنے جانوروں کے درمیان ایک کتا اور سور نجس ہے۔ تو چونکہ نجس کی مقدار بہت تھوڑی تھی لہٰذا سب کو بتا دیا کہ یہ دس گیارہ بارہ چیزیں نجاسات میں ہیں باقی کل دنیا اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور پاک و پاکیزہ دنیا ہے۔

تو چونکہ طہارتیں زیادہ ہیں لہذا نجاستیں گنوادی گئیں۔ حلال زیادہ ہیں لہٰذا حرام گنوادیا گیا۔ تو جو کم تھا اس کو بتادیا گیا باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ اب نبیؐ نے اس کو ایک لفظ میں اعلان کردیا "کل شیءٍ للث مطلق"۔ سرکارِ دو عالمؐ کا یہ ارشادِ گرامی متفق علیہ ہے "کل شیءٍ للث مطلق حتّٰی یرد فیہ نہی" یعنی ہر چیز میں تم کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے جب تک ہماری طرف سے ممانعت نہ آجائے۔ جب ہم منع کردیں گے تو حرام، لیکن جب تک ہم منع نہ کریں تمہارے واسطے حلال ہے۔

اس کے معنی کیا ہوئے کہ ہم ہر قدم پر یہ دیکھتے رہیں کہ حضور نے کہیں منع تو نہیں کیا ہے۔ اگر حضور نے منع کردیا ہے تو وہیں پر رُک جانا چاہئے اور اگر منع نہیں کیا ہے تو جب حضورؐ نے خود آزاد بنادیا ہے تو کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی انسان کسی چیز کو جائز کہتا ہے تو اس سے دلیل مانگنے کا حق نہیں ہے کہ حضورؐ نے کہا ہے "کل شیءٍ للث مطلق" جب تک ہم منع نہ کردیں جائز کہنے کے واسطے دلیل درکار نہیں ہے۔ دلیل تو ناجائز کرنے کے لئے ہے، حرام کرنے کے لئے ہے۔

تو جو حرام کہنے والے ہیں ان سے پوچھیے حضورؐ نے منع کب کیا تھا۔ یہ عجب اُلٹی بات ہے کہ ہم سے پوچھو کہ حضورؐ نے جائز کب کیا تھا۔ تو جہ کی آپ نے ؟ ہم نے کُرتا پاجامہ پہنا آپ ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ حضورؐ نے کہاں فرمایا ہے کہ کُرتا پہنو۔ نہیں اگر آپ مجھے منع کر رہے ہیں تو بتائیے حضورؐ نے کہاں منع کیا ہے۔ ایک صاحب نے کوٹ پینٹ بنوایا ان سے نہیں پوچھ سکتے ہیں آپ کہ حضورؐ نے کہاں اجازت دی ہے۔ لوگ کہیں گے جو کہتا ہے کہ ناجائز ہے اس سے پوچھو حضورؐ نے کہاں منع فرمایا ہے۔ ایک آدمی قالین پر بیٹھا ہے اس سے نہ پوچھو کہ کب حضورؐ نے جائز قرار دیا ہے۔ اُس سے پوچھو جو نہ بیٹھے کہ حضورؐ نے منع کہاں کیا ہے۔ ایک آدمی موٹر میں بیٹھے اس سے نہ پوچھو کہ جائز کب کیا گیا ہے۔ جو نہ بیٹھے اس سے پوچھو کہ حرام کب کیا گیا ہے۔ ایک آدمی مائک پر تقریر کرتا ہے اس سے نہ پوچھو کہ حضورؐ نے جائز کب کیا ہے۔ جو منع کرے اس سے پوچھو حرام کب کیا ہے۔ تو جائز کی دلیل نہیں مانگی جاتی ہے۔ دلیل حرام کی مانگی جاتی ہے۔ چونکہ مسلم کے ذہن میں حرام کہنے کی دلیل نہیں مل رہی تھی لہٰذا ذہنی افلاس کے شکار افراد نے سوچا کہ جائز کو مبتلائے دلیل بنا دیا جائے۔ یہ بھول گئے کہ سرکارِ دو عالمؐ کا اعلان مطلق ہے کہ جب تک پابندی ثابت نہ ہو جائے عمل جائز ہے۔

اب پابندی لگانے والوں کو چاہئے کہ حضورؐ کی طرف سے کوئی دلیل لائیں ورنہ ہم نے تو اُمّت کو اتنا جری دیکھا ہے کہ حضورؐ نے جس کو حرام کہا ہے اس کو بھی حلال بنا دیا اور جس کو حرام کہا اس کو بھی حلال بنا دیا۔

خدا نے جو قانون بنایا حالات کا قانون بنایا۔ اسی لئے جب کسی نے کہیں کسی حلالِ خدا کو حرام سمجھنے کا ارادہ کیا یا لوگوں کو خیال پیدا ہوا کہ شاید انھوں نے حلالِ خدا کو حرام بنا دیا ہوگا تو پروردگار نے فوراً سوال کر لیا "قل من حرم زينة الله" جس زینت کو اللہ نے حلال کیا ہے اس کو حرام کرنے والا کون ہے۔ حد یہ ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے بعض مصالح کی بنا پر بعض چیزوں کے استعمال کو چھوڑ دیا تو حضورؐ نے حلالِ خدا کو حرام نہیں بنایا مگر پروردگارِ عالم ارشاد فرماتا ہے "يَاَيُّهَا النبي لم تحرم ما احل الله لك" جو چیز اللہ نے حلال بنائی ہے وہ چیز حرام کیسے ہو جائے گی۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کسی حلال کو حرام بنانا

چاہتا ہے یا کسی کے بارے میں خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں اس نے حلال کو حرام تو نہیں بنایا تو خدا ٹوک دیتا ہے کہ یہ حلال ہے حرام نہیں ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ ہم نے حلال بنایا ہے اور ہم نے حرام کو واضح کر دیا ہے۔ جو چیزیں ہم نے حرام بنا دی ہیں وہ حرام ہیں اس کے علاوہ کسی انسان کو ہمارے حلال کو حرام کرنے کا حق نہیں ہے اور جو جس چیز کو حرام کرنا چاہتا ہے اس سے دلیل کا مطالبہ کیا جائے گا کہ بتاؤ دلیل کیا ہے حرام ہونے کی۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک صاحب نے کہا کہ یہ رونے کا جواز کیا ہے؟ امام حسینؑ پر رونے کا جواز کیا ہے۔ تو میں کل کہہ چکا ہوں کہ آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں یہ پوچھئے جناب یعقوبؑ سے کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ آپ کا بیٹا زندہ ہے۔ آپ کو تو علم ہے کہ بیٹا ابھی زندہ ہے آپ کس لئے رو رہے ہیں۔ یوسفؑ تو کہیں قتل نہیں ہوئے ہیں۔ یوسفؑ کی زندگی کا خاتمہ تو نہیں ہوا ہے خالی کنوئیں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ آپ کیوں رو رہے ہیں۔

اگر کوئی بُرا کام تھا تو پروردگار کو روکنا چاہئے تھا نہ کہ سیرتِ یعقوبؑ جزوِ قرآن بنا دیا جائے۔

معاذ اللہ اگر کسی مسلمان کے خیال میں یعقوبؑ سے غلطی ہو گئی ہے تو اللہ کو چاہئے تھا کہ اس کا نبی تھا پردہ ڈال دیتا۔ پیغمبر تھا اس بات کو چھپا دیتا مگر خدا نے اس قانون کو، اس سیرت کو قرآن مجید میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ مومنین کو اندازہ ہو جائے کہ وہ یوسفؑ جو ابھی زندہ ہیں ان کے فراق میں حضرت یعقوبؑ رو رہے ہیں تو یہ کوئی فعل حرام نہ کوئی بدعت ہے اور نہ کوئی ناجائز عمل ہے۔

اس کے بعد جب تاریخ اسلام شروع ہوئی تو اسلام کے دوسرے معرکہ میں پیغمبرؐ کے چچا جناب حمزہؑ کام آئے اور ان کو نبیؐ نے اپنے دور میں سید الشہداء قرار دیا۔ لیکن جب جناب حمزہؑ میدانِ اُحد میں شہید ہو گئے اور مدینہ میں خبر آئی تو ہر گھر میں ماتم و کہرام برپا ہو گیا۔ پیغمبرؐ نے دیکھا کہ ہر گھر میں مرنے والوں کے رونے والے موجود ہیں۔ ہر گھر میں ورثا موجود ہیں جو اپنے اپنے شہیدوں اور اپنے اپنے مرنے والوں کو رو رہے ہیں

باپ کا حکم ملا۔ اصغرؑ نے اپنی سوکھی زبان ہونٹوں پر پھرائی۔ یہ منظر وہ تھا جس کو دیکھ کر پوری فوج میں کہرام مچ گیا۔ ابن سعد نے جب یہ منظر دیکھا تو آواز دی "حُرْمِلَةُ اِقْطَعْ کَلَامَ الْحُسَیْنِ" حرملہ نے دوش سے کمان اُتاری۔ ترکش سے تیر نکالا۔ تیر چلہ کمان میں جوڑا۔ علی اصغرؑ کے گلے کو نشانہ بنایا۔ بچّے کے گلے پر تیر لگا۔ حسینؑ نے اپنے لال کو دیکھا۔ لبوں پر تبسم ہے۔ ارے بابا میں مُسکرا کے جا رہا ہوں۔ حسینؑ نے بچّے کو سنبھالا۔ لے کر چلے درِ خیمہ کی طرف۔ درِ خیمہ پر پہونچے آواز دی رباب! اپنے لال کو لے جاؤ۔

بس اولاد والو! میں نے مقاتل میں دیکھا ہے کہ اب جو خیمہ میں آواز پہونچی تو اِدھر سے رباب چلیں اُدھر سے سکینہ چلیں۔ مگر روایت کا انداز کہتا ہے کہ رباب بعد میں آئیں سکینہ پہلے آئیں۔ بچّی دوڑ کے آئی، بابا علی اصغر کو پانی پلا لائے؟ ارے سکینہ بھی تو آپ کی بچّی ہے۔ رباب درِ خیمہ پر پہونچی، حسینؑ نے عبا کا دامن اُلٹا۔ ارے میرے لال کیا تجھ جیسے بچے بھی نحر کر دیئے جاتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ○

ہے پتھر ہے اور اگر کسی آدمی کی آنکھ سے آنسو نہیں بہتے ہیں تو یہ آنکھیں، آنکھیں کہے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ اسی لئے سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ دنیا میں سب کو روتے دیکھا ہے صرف اندھے کو روتے نہیں دیکھا ہے، اس لئے کہ رونا خود بینائی کی علامت ہے۔ اگر بینائی سلب ہو جائے تو پھر آنکھوں میں آنسو نہیں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ایک نکتہ ہے جس کی طرف آپ متوجہ رہیں کہ حضورؐ نے خود گریہ فرمایا ابراہیمؑ کے مرنے پر۔ اب آئیے نبیؐ کے بعد بلکہ نبیؐ کی زندگی میں جب نبیؐ کا فرزند زہراؑ کا لال حسینؑ پیدا ہوا تو میں اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ گذارش کر رہا ہوں اور دو یا تین کتابوں کا حوالہ دیتا ہوں اور حوالے تو بہت ہیں ایک کتاب حاکم نیشاپوری کی کتاب ہے مستدرک۔ مستدرک کے معنی اگر حضرات نہیں جانتے ہیں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ پرانے زمانے میں علماء کا طریقہ تھا اور آج بھی یہ طریقہ ہے کہ اگر کسی ایک کتاب میں، ایک ذخیرے میں، ایک مجموعہ میں ساری باتیں ایک طرح کی نقل کی گئی ہوں اور کچھ باتیں رہ گئی ہوں جو اس وقت نہیں مل سکیں اور بعد والے نے تلاش کر لیا تو پھر اس کتاب میں شامل نہیں کرتا کیونکہ وہ کتاب دوسرے مصنف کی ہے اور اس نئے مجموعے کو بنام مستدرک پیش کرتا ہے یعنی وہ کمی جو اس میں رہ گئی تھی اس کمی کو میں پورا کر رہا ہوں تو اس کتاب کو اس میں ملا دیجئے گا۔ آپ کو تلاش کرنے میں زحمت نہ کرنی ہو گی۔

حاکم نیشاپوری نے ایک کتاب لکھی ہے "مستدرک"۔ موضوع کیا ہے وہ ساری حدیثیں جو جناب محمد بن اسماعیل بخاری اور مسلم بن حجاج دونوں حضرات کے قوانین اور شرائط کی بنیاد پر صحیح تھیں لیکن اتفاق سے ان کی صحیح کتاب میں نہیں درج ہو سکیں۔ حاکم کی نگاہ میں صحیح نہیں، میری آپ کی نگاہ میں نہیں۔ بخاری و مسلم کے مقرر کئے ہوئے شرائط کی بنیاد پر جو حدیثیں، روایتیں صحیح تھیں اور اتفاق سے ان کی کتاب میں درج نہ ہو سکیں یا ان کی نظر سے نہ گذری ہوں گی ان ساری روایتوں کو تلاش کیا اور یہ واضح کیا کہ یہ روایت دونوں بزرگوں کے شرائط کی بنا پر صحیح ہے۔ یہ روایت امام بخاری کے شرائط کی بنا پر صحیح ہے۔ یہ روایت امام مسلم کے شرائط کی بنا پر صحیح ہے، یعنی اگر ان کے شرائط آپ کی نگاہ میں ہیں تو ان شرائط کی بنیاد

بھر یہ حدیث، یہ روایت صحیح ہے۔ فرق یہ ہے کہ ان کی کتاب میں نہیں ہے۔ اس کے مستدرک میں ہے لہٰذا اس کو کہتے ہیں مستدرک۔

اس کے بعد دوسری کتاب محدث کبیر طبرانی کی ہے "مجمع الزوائد"۔

یہ چند کتابیں ہیں جن کا میں حوالہ دے رہا ہوں تاکہ پڑھنے والے پڑھیں کہ امام حسینؑ کی ولادت کے بعد چند دنوں تک یہ سلسلہ برقرار رہا۔ راویوں کے نام بھی نوٹ کر لیں۔

ایک راوی ہیں اُمّ المومنین جناب اُمّ سلمہ۔ ایک راوی ہیں جناب زینب بنت جحش پیغمبرؐ کی زوجہ۔ ایک راوی ہیں جناب اُمّ الفضل۔ ایک راوی ہیں اُمّ المومنین جناب عائشہ۔ یہ سب راوی ہیں کہ سرکارِ دو عالمؐ اپنے شہزادے حسینؑ کو گود میں لئے ہوئے تھے۔ مختلف روایات کے الفاظ الگ الگ ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضورؐ کی گود میں آ کر حسینؑ بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا کہ نبیؐ کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا نبیؐ گودی میں لئے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا نبیؐ کی پُشت پر آ کر حسینؑ بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا نبیؐ کے سجدے میں حسینؑ آ گئے۔ لیکن جب حسینؑ نبیؐ کے پاس آئے تو پیغمبرؐ اپنے لال کو کلیجہ سے لگانے کے بعد رونے لگے۔ جب نبیؐ نے گریہ کیا تو جتنے راوی ہیں سب نے سوال کیا۔

کبھی اُمّ سلمہ نے پوچھا خدا کے حبیب آپ کیوں رو رہے ہیں؟۔ کہا اُمّ سلمہ! میں اپنے حسینؑ سے اظہارِ محبت کر رہا تھا کہ جبرئیل آ گئے۔ کہا خدا کے حبیب! جس حسینؑ سے آپ محبت کر رہے ہیں یہ آپ کا لال کربلا میں مارا جائے گا۔ یہ آپ کا لال ایک دن شہید ہو گا اس لئے میں رو رہا ہوں۔

اُمّ الفضل کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ زینب بنت جحش کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ اُمّ المومنین جناب عائشہ کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ سب نے نبیِ اکرمؐ سے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اور سب سے پیغمبرؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جبرئیل امینؑ نے آ کر خبر دی ہے کہ یہ میرا حسینؑ ایک دن قتل کیا جائے گا۔

کیا انتظامِ قدرت ہے، حسینؑ شہید ہوں گے نبیؐ کے بعد۔ حسینؑ شہید ہوں گے نبیؐ کی وفات کے پچاس سال کے بعد۔ کتنا آسان تھا کہ حسینؑ پر رونے کو بدعت کہہ دیا جاتا۔

اس لئے کہ شہید ہی ہوں گے نبیؐ کے بعد تو رونے والے روئیں گے بھی نبیؐ کے بعد اور بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا کہ حسین پر رونا بدعت ہے اس لئے کہ نبی کے زمانے میں ایسا کوئی کام نہیں تھا۔ قدرت نے جبرئیل امین کو بھیج کر نبیؐ کے سامنے شہادتِ حسینؑ کا ذکر کر کے نبیؐ کو سعادتِ گریہ دے کر واضح کر دیا کہ بعد کا مسئلہ نہیں ہے۔ شہادت سے پہلے نبیؐ نے غمِ حسینؑ میں گریہ کر کے ماتمِ حسینؑ اور گریہ بر حسینؑ کو اپنی سنّت بنا دیا ہے۔ اب کتنا نااہل ہے وہ انسان جو سُنّتِ پیغمبرؐ پر حرف لے آئے۔

اس کے بعد جب گھر میں رو چکے تو حضور باہر تشریف لائے اور اس بزم میں آئے جہاں اتنے افراد تھے۔ جناب عمر، جناب حذیفہ، جناب عمّار، جناب ابوذر یہ پانچ حضورؐ کے صحابی موجود تھے۔ جب نبیؐ باہر آئے، لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ کا چہرہ اُداس ہے، غم کے آثار نمایاں ہیں جیسے ابھی کہیں سے رو کے آ رہے ہیں۔

اصحاب جب نبیؐ کے چہرہ کو اُداس دیکھیں گے تو بے چین تو ہو ہی جائیں گے۔ اصحاب نے کہا حضورؐ یہ آپ کا چہرہ اُداس کیوں ہے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے آثار کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ کہا تم کو نہیں معلوم۔ ابھی جبرئیل امین آئے تھے اور جبرئیلؑ نے یہ خبر سُنائی ہے کہ ایک دن میرا حسینؑ شہید کیا جائے گا۔ بتاؤ جس کا لال شہید ہونے والا ہو وہ نہ روئے تو کیا کرے۔ یعنی پہلے بات پیغمبرؐ نے گھر کے اندر بیان کی۔ جب باہر آئے تو یہی خبر پیغمبرؐ نے باہر بیان کی۔ اندر کے مجمع کا نام ہے مجمع ازواج۔ باہر کے مجمع کا نام ہے مجمع اصحاب۔ اور دونوں جگہ پر ذاکر ہیں پیغمبرؐ، خالی سامعین بدل گئے۔ مگر کل کسی سامع نے نہ کہا کہ حضورؐ نہ روئیں۔ گریہ نہ فرمائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولؐ نے حسینؑ پر رونے کو بھی اپنی سُنّت بنا دیا ہے اور مجمع میں ذکر مصائب کو بھی اپنی سیرت قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں عورتوں کا مجمع ازواج سے اچھا نہ ملے گا اور مَردوں کا مجمع اصحاب سے اچھا نہ ملے گا اور جب اتنے بڑے بڑے مجمع میں مجلسِ حسینؑ ہو جائے تو عام مسلمانوں کے مجمع کی کیا قیمت ہے۔

اب ایک مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ جناب اُمِّ سلمہ سے جب نبیؐ نے بیان کیا تو ان کو وہ خاک بھی دی جو خاکِ مقتلِ حسینؑ تھی اور جناب زینب بنتِ جحش کو بھی وہ خاک کھلائی

جو جبرئیل نے لا کے دی تھی۔ جناب اُمّ الفضل کو بھی وہ خاک دکھلائی جو جبرئیلؑ نے انھیں لا کے دی تھی۔ ابن عباس کو بھی وہ خاک دکھلائی جو جبرئیلؑ نے لا کر دی تھی اور اُمّ المومنین عائشہ کے سامنے بھی نبیؐ نے وہ خاک دکھلائی جو جبرئیل نے لا کے دی تھی۔

بس اتنا فرق ہے کہ سب میں آخری روایت کے علاوہ جس میں اصحاب شامل ہو گئے ہیں ہر روایت میں اس خاک کا ذکر ہے "تربتِ حمراء" یعنی جبرئیلؑ نے سُرخ مٹی لا کر دی۔ بس آخری روایت میں "تربتِ بیضاء" سفید مٹی ہے۔ میں نے یہ آپ کو اس لئے سُنایا ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ روایت پر میری نگاہ ہے اور اس نکتہ کو بھی یاد رکھیں کہ ہر ایک کی روایت میں تربتِ حمراء سُرخ مٹی کا ذکر ہے اور اس روایت میں سفید مٹی کا ذکر ہے۔ اس میں پیغمبرؐ، جبرئیلؑ اور خدا کی کیا مصلحت ہے۔ کوئی نہیں جانتا ہے کہ ہر جگہ سُرخ مٹی کا ذکر آیا ہے اور اس روایت میں سفید مٹی کا ذکر ہے ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ سُرخ اور سفید مٹی میں فرق یہ ہے کہ وہی مٹی خونِ تازہ سے پہلے سفید ہے اور وہی مٹی خونِ تازہ کے مل جانے کے بعد سُرخ ہو جائے گی۔ اب اس میں نبیؐ کی مصلحت کیا ہے کہ سب کے سامنے وہ مٹی رکھی ہے جو شہادت کے بعد کی ہے اور ایک روایت میں اس مٹی کا ذکر آیا ہے جو شہادت سے پہلے کی ہے مگر خاکِ کربلا ہے۔

لانے والا کون ہے؟ جبرئیلؑ ہیں۔ ہماری برادری کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ جبرئیلؑ فرشتۂ معصوم ہے اور معمولی فرشتہ نہیں ہے بلکہ سید الملائکہ ہے۔ اتنا بڑا معصوم فرشتہ کیا بغیر مرضیٔ خدا کے چُپکے سے کربلا کی مٹی اٹھا کے لے آئے گا اور حضورؐ کو خوش کرنے کے لئے دیدے گا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ اگر مرضیٔ پروردگار شامل نہ ہوتی تو جبرئیلؑ کی مجال تھی جو خاک اٹھا کر لے آتے۔ تو خدا کی مرضی تھی جب ہی ملک معصوم لے آیا اور جب نبیؐ کے سامنے لا کر رکھا تو حضورؐ نے لے کر رکھ لیا یا ایک روایت کی بنا پر اُمّ سلمہ کے حوالے کر دیا۔ حضورؐ نے جبرئیلؑ سے یہ بھی نہ کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ کربلا کہاں ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ میرا حسینؑ کہاں شہید ہوگا بلکہ جو مٹی لا کے دی اس کو حضورؐ نے لے لیا۔ اصحاب کو دکھایا۔ ازواج کو دکھایا اور اُمّ سلمہ کے حوالے کر دیا کہ اسے شیشے میں رکھو، جب تک یہ

خاک خاک رہے سمجھو میرا حسینؑ زندہ ہے اور جب یہ خاک خون ہو جائے تو سمجھو کہ میرا حسینؑ شہید ہو گیا ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس خاک کو شیشے میں بچا کے رکھنے کو کیا کہا جائے کہ ام سلمہ رکھے رہیں ابھی کب تک رکھے رہیں ابھی میں نے ذکر کیا کہ نبیؐ کے بعد واقعۂ کربلا پچاس سال کے بعد پیش آیا یعنی وہ شیشہ جس میں جناب اُم سلمہ نے وہ خاک رکھی تھی وہ اُم سلمہ کے پاس پچاس سال تک محفوظ رہا۔ ہائے دس دن اگر تابوت رکھا جائے۔ دس دن اگر ضریح رکھی جائے تو کتنی بڑی پریشانی عالم اسلام میں پیدا ہو جاتی ہے کاش کوئی اُم المومنین اُم سلمہ کو سمجھاتا، کوئی پیغمبرؐ کو مشورہ دیتا کہ حضورؐ اگر گھر میں یہ خاک یوں ہی شیشہ میں رکھی رہی تو ایک نئی بدعت رائج ہو جائے گی۔ مگر نبیؐ نے رکھوا دیا اور اُم سلمہ رکھے رہیں اور خاک نے اپنا اثر دکھلا دیا کہ اگر خاک خون میں نہ بدلی ہوتی تو شاید کسی کو یقین بھی نہ آتا کہ یہ کہاں کی خاک ہے۔

فرق یہ ہے کہ مٹی میں صلاحیت تھی تو شہادت حسینؑ کا یہ اثر ہو گیا کہ مٹی خون بن گئی۔ کتنا گیا گذرا یہ انسان ہے کہ جس پر شہادتِ حسینؑ کا کوئی اثر نہ ہوا، ایسا انسان کیا اشرف المخلوقات کہے جانے کے قابل ہے جس میں جمادات کے برابر بھی احساس نہیں پایا جاتا ہے۔

یہ سب وہ باتیں ہیں جن کو صرف مجھے یاد دلانا ہے ورنہ آپ میں سے کون ایسا ہے جن کو یہ حقائق نہیں معلوم ہیں۔

اب ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا ہے کہ ٹھیک ہے۔ چلئے۔ اگر امام حسینؑ شہید ہو گئے تو آپ غم منائیے مگر شہید ہوئے عاشور محرم کے دن تو عاشور کے دن جتنا رونا ہو رو لیجئے۔ ایک دن کی شہادت کا اثر دس دن تک کیوں ہے۔ شہادت تو ایک دن کا واقعہ ہے ایک وقت کا واقعہ ہے یہ ایک دن کے واقعہ کا اثر دس دن پر کیوں کر ہو گیا۔ یہ اسلام میں ایک اضافہ ہے۔ میں کہوں گا کہ یہ اضافہ نہیں ہے۔ اگر کہنا ہے تو کہیئے کہ یہ اسلام میں کمی ہے۔ اس کو اضافہ نہیں کہہ سکتے ہیں اس کو کمی کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ جب جناب خدیجہؑ اور جناب ابوطالبؑ کا انتقال ہجرتِ پیغمبرؐ سے پہلے ہوا تو ساری تاریخیں متفق ہیں کہ پیغمبرؐ نے اس پورے سال کا نام عام الحزن کہہ دیا۔ عام الحزن کے معنی ہیں رنج کا سال۔ تو کوئی حضورؐ سے پوچھتا کہ حضورؐ سال سے کیا مطلب ہے؟ کیا جناب خدیجہؑ کا انتقال ایک سال تک ہوتا رہا۔ کیا خدیجہؑ کوئی ایسی بیمار

تھیں کہ بستر پر ایک سال تک لیٹی رہیں۔

خدیجہؑ کا انتقال تو ایک دن کا واقعہ ہے ایک وقت کا واقعہ ہے۔ حضورؐ کو رونا ہے تو ایک دن بیٹھ جائیے اور صبح سے شام تک رو لیجیے۔ کام ختم ہو جائے گا۔ مگر نبیؐ نے ایک وفاتِ خدیجہؑ کی بنیاد پر پورے سال کو عام الحزن قرار دے دیا اور ابھی مورخوں میں ہمت نہیں ہوئی نام بدلنے کی۔ اب اس کے بعد کچھ زیادہ مل جائے تو شاید رائے بدل جائے۔ لیکن ابھی تک تو اس سال کو عام الحزن ہی کہا جاتا ہے کہ نبی کا رکھا ہوا نام ہے۔ تو مجھے پھر ایک جملہ کہنا پڑے گا کہ وہ خاتون جس نے اسلام کی راہ میں مالی قربانی دی ہے۔ دیکھیے خدیجہؑ نے جان کی قربانی نہیں دی ہے اگرچہ خدیجہؑ کے کردار پر ہماری جانیں قربان ہیں۔ زہراؑ کی مادرِ گرامی ہیں۔ ان کے کردار کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ہے نہ مردوں میں اور نہ عورتوں میں مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ خدیجہؑ نے اسلام کی راہ میں جان کی قربانی نہیں دی ہے مال کی قربانی دی ہے۔

اب میں ہر منصف انسان سے، ہر انصاف پسند مسلمان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو انسان راہِ خدا میں مال قربان کرے وہ جب اس دنیا سے چلا جائے تو نبیؐ اس کے غم میں پورے سال غم مناتے رہیں اور جو انسان فقط انسان نہیں بلکہ نبیؐ کا نواسہ بھی ہے۔ نبیؐ کا لختِ دل بھی ہے آہ اگر پورا گھر قربان کر دے تو آپ کو دس دن کے غم میں کوئی نیا رُخ نظر آ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سُنّتِ پیغمبرؐ کو دنیا نے پہچانا ہی نہیں۔ سیرتِ پیغمبرؐ کو دنیا نے محسوس ہی نہیں کیا ہے کہ سیرتِ پیغمبرؐ کیا ہے اور طریقۂ پیغمبرؐ کیا ہے، حالانکہ واقعہ پچاس سال کے بعد پیش آنے والا ہے مگر نبیؐ نے ساری مثالیں اور ساری نظیریں اپنی حیات میں پیش کر دی ہیں۔

اور جب خود سرکارِ دو عالمؐ کا انتقال ہوا ہے تو ہم نے خود اصحاب کو بھی، ازواج کو بھی۔ دونوں کو حضورؐ کے غم میں سر و سینہ پیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ جائیے محدّثِ دہلوی سے پوچھیے کہ وہ کون اصحاب تھے، وہ کون چاہنے والے عاشق تھے کہ جنھوں نے نبیؐ کے مرنے کے بعد حضورؐ کے انتقال پر اپنا سر و سینہ پیٹ لیا۔ "مدارج النبوہ" حوالہ دے رہا ہوں جائیے طبری اور کامل جیسے مورخوں سے پوچھیے کہ ازواج و مخدرات کون تھیں جنھوں نے نبیؐ کے مرنے کے بعد سر و سینہ پیٹ لیا۔ آج ہمارا ہاتھ سینہ پر پڑ جائے تو عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے۔ کل سرکارِ دو عالمؐ

کی رحلت کے بعد چاہنے والے یوں غم منارہے تھے کہ یہ سیرتِ اصحاب بھی ہے اور سیرتِ ازواج بھی ہے۔ اب اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کا کوئی رشتہ نہ پیغمبرؐ سے ہے، نہ اصحاب سے ہے، نہ ازواج سے ہے۔ اپنے گھر میں کوئی مذہب کسی نے بنا لیا ہو تو اس کی ذمہ داری کسی آدمی پر نہیں ہے ورنہ یہ ساری تاریخیں، یہ سارے واقعات ہمارے سامنے موجود ہیں۔

بس ایک ہی شبہ ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیا جاتا ہے کہ ایک روایت ہے جس روایت کا فیصلہ اسی دور میں ہو گیا تھا جب ایک صحابی اور ایک زوجۂ پیغمبرؐ کے درمیان جھگڑا ہوا اور بات کا آخری فیصلہ ہو گیا کہ ایسی روایتوں کی کوئی بنیاد اسلام میں نہیں ہے۔

روایت یہ ہے کہ جب کوئی زندہ کسی مرنے والے کو روتا ہے تو روتا ہے وہ جو زندہ ہے اور فرشتے بجائے اس کو مارنے کے مرنے والے کو مارتے ہیں۔ "ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ" یعنی گھر والے اگر روتے ہیں تو میّت پر عذاب ہوتا ہے لیکن میں یہاں بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ گویا پیغمبرؐ اپنے بیٹے کے عذاب کا انتظام کر رہے تھے جو ابراہیمؑ پر رو رہے تھے اور پھر یہ کون سا قانونِ عدل ہے کہ جرم کرے زندہ اور سزا لے مُردہ کو اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ ایسی کوئی روایت ہے تو روایت میں ایک لفظ ہے "اھلہ"۔ میں بس اتنی گذارش کر سکتا ہوں کہ اگر ہم پر کوئی پابندی عائد ہوتی ہے تو بھائی یہ کام آپ کر دیجئے اس لئے کہ اگر سارا عذاب گھر والوں کے رونے سے ہوتا ہے تو باہر والوں کے رونے سے تو نہیں ہوتا ہے۔ تو آپ تو یہ کام کر ہی سکتے ہیں آپ کو تو کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن ایسا کوئی قانون عدل و انصاف نہیں ہے۔

ہاں البتہ آج ہی میں نے ایک نئی تحقیق سُنی ہے جو اتفاقاً اسی موضوع سے متعلق ہے لہٰذا آخری جملہ کہہ کر بات کو یہیں پر تمام کر دینا چاہتا ہوں۔ اس روایت کا فیصلہ تو روزِ اوّل ہو گیا تھا جب کہ روایت سامنے آئی اور صحابی پیغمبرؐ میں اور زوجۂ رسولؐ میں بحث ہو گئی کہ اس روایت کی بنیاد کیا ہے اس لئے کہ روایت قوانینِ الٰہی کے خلاف ہے اور حوالے میں قرآنی آیت بھی آئی کہ قرآن مجید نے فیصلہ کر دیا ہے کہ "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی"

کوئی آدمی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ تو اگر یہ رو رہا ہے، کوئی گناہ کر رہا ہے تو اس کا بوجھ مرنے والا کیوں اٹھائے گا۔ اور جو روایت آیتِ قرآن کے خلاف ہو وہ قابلِ قبول نہیں ہوتی ہے لیکن اس آیت کا ایک نیا مفہوم نکالا گیا ہے اور بعض لوگوں نے فرمایا ہے کہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کے لئے کوئی کارِ خیر نہیں ہو سکتا ہے۔ سُنا آپ نے؟ ایک صاحب نے نئی تحقیق نکالی ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ مرنے والے کے لئے کوئی کارِ خیر نہیں ہو سکتا ہے اس لئے کہ اگر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی کسی مرنے والے کے لئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اس کا عذاب کم ہو گیا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ دو رکعت نماز پڑھ دیں گے تو اس کا عذاب کم ہو جائے گا۔ اگر ہم مثلاً قرآن خوانی کر دیں گے تو عذاب کم ہو جائے گا۔ اگر اس کی طرف سے صدقہ دیدیں گے تو عذاب کم ہو جائے گا۔ اس کا روزہ ادا کر دیں گے تو عذاب کم ہو جائے گا۔ اس کا حجِ بدل کر دیں گے تو عذاب کم ہو جائے گا۔

وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات جو آپ لوگ سوچتے ہیں کہ عذاب کم ہو جائے گا' یہ آیت کے خلاف ہے۔ حالانکہ عزیزو! آیت کا مضمون یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کارِ خیر کرنے والا جو مرنے والے کے لئے کارِ خیر کر رہا ہے اس ایصالِ ثواب اور کارِ خیر کا مضمون کیا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی آدمی مر گیا۔ میں ایک متفق علیہ مسئلہ گذارش کر رہا ہوں۔ تلاوت کے بارے میں جھگڑا پڑ گیا۔ نماز کے بارے میں جھگڑا پڑ گیا۔ مگر حجِ بدل تو ابھی تک اسلام میں زندہ ہے اور رہے گا۔ حجِ بدل کے معنی کیا ہیں کہ مرنے والے کے ذمّہ حج تھا۔ زندہ آدمی چلا گیا۔ اس نے حج کر دیا تو اس کے حج کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا گناہ ہلکا ہو گیا یا ختم ہو گیا۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ خدا نے اس کا گناہ اٹھا کے حاجی صاحب کی گردن پر رکھ دیا کہ کیوں گئے تم، وہ کمبخت مر گیا تھا جہنمی، جانے دیتے جہنّم میں۔ تم کو بڑا خیال پیدا ہو گیا اس کی نجات کا۔ اب جاؤ اس کو نجات دیدیں گے تم کو نجات نہیں دیں گے۔

ہے کوئی مسلمان یہ سوچنے والا۔ ہے کوئی مسلمان یہ قبول کرنے والا کہ اس کے

جج بدل کر دینے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ جہنّم سے بچ جائے گا اور ان کو جہنّم میں پھینک دیا جائے گا؟۔ نہیں۔ تو معنی کیا ہوئے۔ معنی یہ ہیں کہ ان کے کارِ خیر سے اس کا عذاب ختم ہو جائے گا نہ کہ عذاب منتقل ہو جائے گا۔ تو جو قرآن کی آیت نے کہا تھا کہ ایک آدمی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اِدھر کا بوجھ اُدھر نہیں جائے گا۔ یہی ہم بھی کہتے ہیں۔ اس میں کون سی خرابی ہے۔

جس کو قرآن نے منع کیا ہے وہ عذاب کا منتقل ہونا ہے، اور جس کو شریعت نے ثابت کیا ہے وہ عذاب کا برطرف ہونا ہے۔ جو آدمی منتقل ہونے اور برطرف ہونے کا فرق نہیں جانتا ہے اسے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا حق کیا ہے۔ اگر قرآن پڑھنے کا شوق ہے تو پہلے قرآن فہمی کا شعور پیدا کیجیے، قرآن فہمی کا سلیقہ سیکھئے تاکہ یہ اندازہ تو ہو سکے کہ اسلام نے کسے جائز قرار دیا ہے اور کسے ناجائز قرار دیا ہے۔

بس عزیزانِ محترم! یہ چند باتیں ضروری تھیں میرے موضوع کے مکمل ہونے کے لئے اس لئے میں نے بطور فہرست ان باتوں کو گذارش کر دیا تاکہ جو لوگ پڑھنا چاہتے ہیں وہ پڑھیں اور مطالعہ کریں اور اس کے بعد دیکھیں کہ غمِ حسینؑ کوئی ایجادِ بندہ نہیں ہے کوئی سرکارؐ کے بعد کی بدعت نہیں ہے بلکہ سرکارِ دو عالمؐ نے خود اپنی زندگی میں اس غم کی بنیاد رکھی ہے۔ جبرئیل امینؑ نے آ کے مقتل پڑھ کے سُنایا ہے۔ پیغمبرؐ نے آنسو بہائے ہیں۔ اصحاب روئے ہیں۔ ازواج پریشان ہوئی ہیں۔ پیغمبرؐ نے خاکِ کربلا کو جبرئیل سے لے کر اُمّ سلمہ کے پاس محفوظ رکھا ہے اور صحیح ترمذی کی روایت کی بنا پر جناب اُمّ سلمہ نے روزِ عاشور اس خاک کو دیکھا ہے اور بعض صحابہ کی روایت کی بنا پر جناب ابنِ عباس نے پیغمبرؐ کو روزِ عاشور باحال پریشان خواب میں دیکھا ہے اور پوچھا ہے کہ حضورؐ یہ آپ کا کیا عالم ہے تو آپ نے فرمایا ابنِ عباس تمھیں کیا خبر۔ میں تو لُٹ گیا۔

یہ سرکارِ دو عالمؐ کے دَور کی باتیں ہیں۔ حضورؐ نے اس غم کی بنیاد کو رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انقلابات آتے رہے حکومتوں کے تختے اُلٹتے رہے۔ تباہ ہونے والے تباہ ہوتے رہے مگر سلسلۂ غم قائم تھا۔ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ کسی باطل کی بنیاد ہوتی تو فنا ہو گئی ہوتی۔ نبیؐ کی بنیاد کو کون فنا کر سکتا ہے۔ سرکارؐ کی رکھی بنیاد کو کون ہلا سکتا ہے۔ ہر انسان جو صاحبِ انصاف

ہے، جو صاحبِ شرف ہے، جو مسلمان ہے جو صاحبِ ایمان ہے وہ اس غم کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ میں تو بعض وقت تعجب کرتا ہوں، اسی ملک میں دیکھئے، کتنی بڑی انتظامیہ ہے۔ اس ملک میں کام کرنے والے ہیں۔ ان کو اس غم کی اہمیت کا احساس ہے۔ جگہ کا انتظام۔ ٹرافک کا انتظام۔ ہر طرح کا انتظام۔

راستہ روک دیا جائے حسینؑ کا غم منایا جا رہا ہے۔ آنے والوں پر راستہ سے گذرنے والوں پر پابندی عائد کر دی جائے کسی اور راستے سے جاؤ۔ یہاں نبیؐ کے نواسے کا غم منایا جا رہا ہے۔

جو صاحبانِ اقتدار ہیں جو مسئولین ہیں۔ جو ذمہ دار ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں حکومت ہے ان کو اس غم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ان کو نبیؐ کے لال کی عظمت کا خیال ہے۔ ان کو حسینؑ ابن علیؑ کی جلالت کا اندازہ ہے اور دو دو پیسے کے آفیسروں کا یہ حال ہے کہ عاشور کو چھٹی نہیں ملے گی تم تو اپنی ہی حکومت کے غدار ہو۔ حسینؑ سے کیا وفا کرو گے ان باتوں کی اہمیت کو حکومت سمجھتی ہے۔ اگر تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے ہو تو تم کس کے کام آئے۔ نہ مذہب کے کام آئے نہ حکام کے کام آئے۔ کسی کے کام نہ آئے۔ دیکھو دنیا والے جو صاحبانِ شرافت ہیں وہ کیسے جانِ پیغمبرؐ کو پہچانتے ہیں اور کیوں نہ پہچانیں گے سب کے نبیؐ کا نواسہ ہے۔ سب کے نبیؐ کا لال ہے۔

تو عزیزانِ محترم! ساری دنیا کو یہ احساس ہے اور میں نے ایک دن آپ کے سامنے عرض کیا تھا کہ ہم سب تو مسلمان ہیں، جو غیر مسلم ہیں جن کے پاس انسانیت کا درد ہے، جو مظلومیت کی قدر و قیمت جانتے ہیں آپ ان قوموں میں جاکے دیکھیں اور جن کو تجربہ نہیں ہے وہ ہندوستان جاکے دیکھ لیں۔ وہاں آپ دیکھیں گے ہندوؤں کی باقاعدہ انجمنیں ہیں، جو غمِ حسینؑ میں روتے ہیں۔ نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ سینہ زنی کرتے ہیں۔ سکھوں کی انجمنیں ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر صرف اس بنیاد پر کہ ایک انسان تھا جس نے مظلوموں کی آواز اٹھائی ایک انسان تھا جس نے انسانیت کا خون۔ برداشت نہیں کیا۔ انسانیت کو تباہ نہیں ہونے دیا لہٰذا جب تک انسانیت زندہ رہے گی حسینؑ بن علیؑ کا احسان باقی رہے گا، جو شعور رکھنے والے ہیں۔ جو ادراک رکھنے والے ہیں۔ جو سمجھنے والے ہیں وہ ان حقائق کو خوب سمجھتے ہیں اور خوب پہچانتے ہیں۔

لیکن بہر حال میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ اگر حالات یا ضرورت کی بنیاد پر کسی آدمی

کو کام پر جانا پڑے تو ضرور جائے۔ اس لئے کہ سارے ادارے اور سارے مراکز بند کردیئے جائیں تو یہ بھی نہیں ہوسکتا ہے عاشورِ محرم یقیناً غم کا دن ہے۔ حزن کا دن ہے۔ الم کا دن ہے۔ رونے کا دن ہے۔ غم منانے کا دن ہے۔ مگر اس کے بعد بھی اگر سارے کام معطل کردیئے جائیں گے تو کوئی بیمار اگر خدانخواستہ دم توڑ رہا ہے اور طبیبوں کو چھٹی دے دی گئی۔ اسپتالوں کے دروازے بند کردیئے گئے، تو اس غریب کا علاج کون کرے گا۔ اس لئے کچھ کام ایسے ہیں جن کو بہرحال باقی رکھنا پڑتا ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جن کو بہرحال زندہ رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں چونکہ روایات میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ یہ دن کمانے کا دن نہیں ہے، یہ دن ذخیرہ کرنے کا دن نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی کام اگر آپ کے ذمہ ہے، اخلاقی اعتبار سے یا مذہبی اعتبار سے تو آپ اپنے کام کو انجام دیں مگر اس خیال کے ساتھ کہ جو پیسہ آپ کے ہاتھ میں آئے گا اس کو راہِ حسینؑ میں خرچ کردیں گے۔ اس کام کو اپنا فریضہ سمجھ کر آپ نے انجام دیا ہے کہ آپ نہ کریں گے تو مریضوں کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی یا دوسرے انسانوں کی زندگی خطرے میں ہے۔ آج بھی کوئی کمانے کا دن ہے۔ آج بھی کوئی ذخیرہ کرنے کا دن ہے اور ہم کیا ذخیرہ کریں گے۔ آج تو جو اسلام کا ذخیرہ تھا وہ لٹ گیا۔ ہم کیا جمع کریں گے جس دولت کو اسلام نے جمع کرکے رکھا تھا وہ عاشورِ محرم کے دن کربلا کے میدان میں لٹ گئی۔

بس عزیزانِ محترم! میں اپنے گذارشات کو تمام کرچکا اور اب میں تذکرہ مصائب کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ عاشور کی رات ہے لہٰذا بہرحال تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اب سے لے کر کل رات تک یہ تذکرہ مسلسل آپ کے سامنے ہوتا رہے گا۔ اس مجلس کے بعد چار بجے اذانِ صبح سے پہلے پھر مجلس ہوگی۔ اس کے بعد گیارہ بجے انشاء اللہ ذکرِ مقتل ہوگا اس کے بعد شام غریباں کی مسلسل مجلسیں ہیں۔ سارے تذکرے آپ کے سامنے آتے رہیں گے مگر میں حسبِ وعدہ اپنی آخری ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے تین چار جملے اپنے تمام سامعین کرام اور اپنے تمام محبت کرنے والوں سے گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ عزیزو! یہ غمِ حسینؑ ایک امانت ہے اور پروردگار نے یہ امانت ہمارے حوالے کی ہے لیکن اس حسینؑ نے جس کا غم ہم مناتے ہیں اِس شریعت کو، اِس دین

کو، اِس مذہب کو اپنی امانت بنا کے ہمارے حوالے کیا ہے اس کو بچانے کے لئے حسینؑ نے اتنی بڑی قربانی دی ہے لہٰذا ہم نے اگر غمِ حسینؑ کو اپنے امکان بھر باقی رکھا ہے۔ اپنے امکان بھر اس میں حصہ لیا ہے تو ہم کو شریعتِ حسینؑ، دینِ حسینؑ، مذہبِ حسینؑ کی بقا میں بھی اسی شان سے حصّہ لینا ہوگا جس شان سے، ہم نے غمِ حسینؑ کو اپنے کلیجہ سے لگایا ہے۔

میں بارہا گذارش کر چکا ہوں اور آج پھر یاد دلانا چاہتا ہوں جن حضرات کو نہیں معلوم ہے ان کے معلومات میں اضافہ کے لئے اور جن کو معلوم ہے ان کی یاد دہانی کے لئے۔ ہمارے فطری قانون کے اعتبار سے کوئی عمل اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوتا ہے جب تک عمل تقلید کی روشنی میں انجام نہ پائے لہٰذا اگر مومن تقلید سے نا آشنا ہے تو اس کا فرض ہے کہ تقلید کے معنی دریافت کرے اور زندگی میں جو عمل کرے سارے اعمال و افعال کو مجتہدِ اعلم کی تقلید کی روشنی میں انجام دے تاکہ عمل ہو شریعتِ حسینؑ بن علیؑ پر۔ عمل ہو قانونِ اسلام پر جس کو حسینؑ نے قربانی دے کر بچایا ہے۔ اور باعتبار مالیات آپ جانتے ہیں کہ خمس آلِ محمدؐ کا حق ہے جس کو دنیا نے نہیں دیا ہے، جس پر دنیا نے پابندی عائد کر دی ہے۔ یہ حق آلِ محمدؐ وہ ہے جس کے ادا کرنے والے صرف ہم ہیں، آپ ہیں۔ آلِ محمدؐ کے غلام اور ان کے چاہنے والے ہیں — ہر وہ انسان مرد یا عورت جس کا کوئی بھی ذریعۂ معاش ہے۔ جس دن سے اس کی آمدنی کا آغاز ہوتا ہے جب وہ دن پھر پلٹ کے اگلے سال آتا ہے اور سال پورا ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے مالیات کا حساب کرنا ہوتا ہے اور بیس پرسینٹ نکالنا ہوتا ہے۔ اس میں سے آدھا حق ساداتِ آلِ محمدؐ ہے جو اولادِ رسولؐ پر خرچ کیا جاتا ہے۔ آدھا حقِ امامؑ ہے جو راہِ امام میں صرف کیا جاتا ہے۔ یعنی مجتہد کے حوالے کر دیا جاتا ہے یا جس کے بارے میں وہ کہتا ہے اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ راہِ مذہب میں ہمارا سرمایہ خرچ ہو اور ہماری عاقبت اور نجات کا سامان ہو سکے۔ یہی ہماری ذمہ داری ہے اور اسی کا احساس ضروری ہے۔ اس کے بعد باعتبارِ فرائض و واجبات اور باعتبارِ محرمات دو تین باتیں اور گذارش کرنا ہیں تاکہ جن کو نہیں معلوم ہے ان کو معلوم ہو جائے۔ آپ کو دنیا کے سیلاب میں نہیں بہنا ہے۔ آپ کو ماحول اور معاشرہ کا اتباع نہیں کرنا ہے۔ آپ کو دینِ خدا کا اتباع کرنا ہے۔

آپ کو مذہب حسینؑ بن علیؑ کا اتباع کرنا ہے۔ دینِ خدا میں نہ ناچ جائز ہے نہ گانا جائز ہے نہ ایسے دیگر خرافات جائز ہیں۔ اگر کسی گھر میں خدا نکردہ ان جرائم نے، ان برائیوں نے کسی راستہ سے گھر بنا لیا ہے تو اگر اس گھر میں حسینؑ بن علیؑ کو مہمان بلانا ہے تو ان محرمات کو گھر سے باہر نکالنا ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ اسی گھر کا ٹی وی ناچ گانا بھی نشر کرتا رہے اور اسی گھر میں ماتمِ حسینؑ کی صدا بھی بلند ہوتی رہے۔ یہ حسینیت سے بے وفائی ہے۔ حسینؑ نے اپنے نام کے لئے جان نہیں دی ہے۔ حسینؑ نے اپنے دین کے لئے جان دی ہے۔ اگر دین ہی پامال ہوگیا تو نام کا فائدہ کیا ہوگا۔ وہ اہلِ دنیا ہیں جو نام کے لئے مرا کرتے ہیں اللہ والے دینِ خدا کے لئے جان دیتے ہیں۔ اپنے نام کے لئے جان نہیں دیتے لہٰذا یہ بات آپ کے ذہنِ عالی میں رہے۔ ایسے کام ہمارے گھروں میں، ہمارے معاشرہ میں ہرگز نہیں ہونے چاہیے جو حسینیت کے خلاف ہوں۔ جو دینِ خدا کے خلاف ہوں۔ جو شریعتِ پیغمبرِ اسلام کے خلاف ہوں۔ اور میں اپنی بہنوں سے بھی گذارش کروں گا کہ اسلام میں جہاں اور محرمات ہیں وہاں بے پردگی بھی ایک فعل حرام ہے۔ ایک ناجائز عمل ہے خصوصیت کے ساتھ اس نکتہ کو ان حسینؑ والوں کو پہچاننا چاہئے جو اس غم میں تمام سال آنسو بہاتے ہیں کہ ظالموں نے سیدانیوں کے سروں پر چادریں نہ رہنے دیں۔ اب کوئی مکار، کوئی مذہب کا غدار آپ کو دھوکہ نہ دینے پائے کہ جب سیدانیوں کا پردہ نہ رہ گیا تو آپ کے پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ یاد رکھئے کہ سیدانیوں کا پردہ نہ رہ گیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیدانیوں نے چادر اٹھا کر پھینک دی تھی، یا معاذ اللہ بے پردہ ہوگئی تھیں۔ ان کا پردہ نہ رہ گیا اس لئے کہ ظالموں نے پردہ چھین لیا اور اسی لئے زندگی بھر عابدؑ بیمار کہتے رہے کہ شہادت تو ہماری میراث ہے مگر یہ ہماری میراث نہیں کہ ماں بہنوں کے سر کھلے ہوئے ہوں اور ہمیں درباروں اور بازاروں میں لے جایا جائے لہٰذا بے پردگی ہمارے گھر کی تاریخ نہیں ہے۔ یہ ہمارے گھر کی سیرت نہیں ہے۔ یہ ہمارے گھر کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ حسینؑ والوں اور زینبؑ والیوں کا طریقہ نہیں ہے لہٰذا ہماری بہنوں کو متوجہ رہنا چاہئے اور ہمارے بھائیوں کا بھی فرض ہے کہ وہ بہنوں کو متوجہ کریں۔ اپنی ماؤں کو، اپنی بیویوں کو، اپنے گھر والوں کو متوجہ کریں۔ تم اپنا پردہ سنبھال کے رکھو تاکہ

یہ احساس رہے کہ وہ سیدانیاں کس مصیبت سے گذر رہی تھیں جن کا پردہ چھین لیا گیا تھا۔

عزیزو! ایک ذمہ داری اور ہے جو مجھے آپ کے سامنے گذارش کرنا ہے۔ ہر سال عرض کرتا ہوں، پھر عرض کر رہا ہوں۔ اگر کوئی ناخوش ہوگا تو الحمد للہ ایسے افراد کی ناخوشی کا مجھے کوئی صدمہ نہیں ہے۔ اگر میری بات سے میرا مولا خوش ہو جائے، میرا پروردگار خوش ہو جائے جب کہ یقین ہے کہ کسی بھی حسینؑ والے کے ناخوش ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے اور کسی زینبؑ کی چاہنے والی کے ناخوش ہونے کا سوال نہیں ہے۔ اور کون سا اتنا بڑا کام ہے، کون سا اتنا بڑا مسئلہ ہے اگر آدمی کے سر کے بال چھپ جائیں۔ بدن تو چھپا رہتا ہی ہے کپڑا تو پہنتے ہی ہیں۔ ایک لے دے کے سر کے بال رہ گئے ہیں اگر اتنے سر کے بال چھپ جائیں تو میرا خیال ہے نہ کاروبارِ دنیا معطل ہو جائے گا اور نہ کوئی قیامت آجائے گی نہ کوئی مصیبت آجائے۔ ہاں اگر کسی نے طے ہی کر دیا ہے کہ مذہبِ آلِ محمدؐ کو نہ مانیں گے۔ طریقۂ شہزادی کائناتؑ کو نہ مانیں گے۔ سیرتِ زینبؑ پر عمل نہ کریں گے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے اور جب میں اپنی بہنوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں تو میں پھر گذارش کروں گا اپنے بھائیوں سے۔ اگر نہیں یاد ہے آپ کو تو میں یاد دلاؤں۔ اگر آپ کو نہیں معلوم ہے تو میں آپ کے علم میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ جتنے مجتہدین قابلِ تقلید ہیں اور جن کی آپ تقلید کر رہے ہیں یا کریں گے سارے مجتہدین کی نگاہ میں داڑھی رکھنا واجبات میں ہے اور اس کا منڈانا ناجائز ہے۔ یہ سنّت کہہ کر آپ ٹال نہیں سکتے ہیں۔ آپ کو تقلید کے قانون کے مطابق زندگی گذارنا ہوگی۔ کریں گے تو اپنی عاقبت بنائیں گے۔ نہیں کریں گے تو روزِ قیامت خود جواب دہ ہوں گے۔ بس میں اپنی جواب دہی کے واسطے اپنے فریضہ کو ادا کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو باخبر کرنا چاہتا ہوں۔ بُرا لگے تو آپ مجھے معاف فرما دیں گے لیکن مجھے معاف کرنے کے بعد حسینؑ بن علیؑ کو جواب دینے کے لئے تیار رہیں۔ میں نے سیرتِ حسینؑ میں یہ واقعہ پڑھا ہے اور آپ بھی جا کر کتاب میں دیکھئے گا کہ مسجد سے امام حسینؑ برآمد ہوئے اور سامنے کچھ لوگ نظر آئے اور ان لوگوں نے آواز دی:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ" فرزندِ رسولؐ میرا اسلام لیجئے۔

امام حسینؑ نے فرمایا "مَنْ اَنْتُمْ"، تم لوگ کون ہو؟
تو کہا "نَحْنُ شِیْعَتُکُمْ" ارے ہم آپ کے شیعہ ہیں۔ آپ کے چاہنے والے ہیں۔
فرمایا، "مَالِیْ لَا اَرٰی فِیْکُمْ سِیْمَاءُ الشِّیْعَةِ" مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں تم میں شیعوں کی علامت نہیں دیکھتا ہوں۔

کیا مطلب تھا حسینؑ بن علیؑ کا اس وقت۔ یہ جن سے کہا وہ سمجھے یا جو سمجھنا چاہتے ہیں وہ سمجھیں گے مگر حسینؑ بن علیؑ پر یہ بات بار ہے کہ ان کے چاہنے والے کے چہرہ سے شیعیت کی علامات ظاہر نہ ہوں، اس کے چہرہ سے محبت کی نشانیاں ظاہر نہ ہوں۔ یہ یاد دہانی میرا فریضہ ہے جو ہر حال میں گذارش کرنا چاہتا ہوں اور میں پھر دست بستہ معافی چاہتا ہوں کہ اگر کسی کے دل کو تکلیف ہوئی ہے میرے بیان سے تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن اگر حسینؑ بن علیؑ کے قانون سے کسی کو تکلیف ہوئی ہے تو اس سے میں ہرگز معافی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہوں اور جس نے اس قانون کی مخالفت کی ہے اسے فرزندِ رسولؐ سے معافی طلب کرنا ہوگی۔

بس اربابِ عزا! شبِ عاشور ہے۔ شبِ غم ہے۔ شبِ الم ہے۔ شبِ ماتم ہے۔ اور آج کی رات سارے تذکروں کے بعد آخری تذکرہ شہادت آپ کے سامنے پیش کرنا ہے جس کے بارے میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔ میں الفاظ ڈھونڈھ رہا ہوں کہ میں کیسے آپ کو توجہ دلاؤں۔ میں کیا آپ سے گذارش کروں اس لئے کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے تذکرہ عباسؑ علمدار کیا تھا تو میں نے آواز دی تھی میرے جوانو! شیر کا ماتم کرو۔ جب میں نے تذکرہ علی اکبرؑ کیا تھا تو میں نے کہا تھا میرے نوجوانو! آمادہ ہو جاؤ حسینؑ کے کڑیل جوان کا ماتم ہے۔ جب میں ذکر عونؑ و محمدؑ اور ذکر قاسمؑ کر رہا تھا تو میں کہہ رہا تھا میرے بچو! امِّ فروہ کے لال کا ماتم ہے۔ میرے بچو! ثانیٔ زہراؑ کے گود کے پالوں کا ماتم ہے۔ مگر آج تو کوئی مجھے نظر نہیں آتا میں کس کو متوجہ کروں، میں کس سے کہوں کہ آج کس کا ماتم کرنا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی بہنوں کو آواز دوں، اے میری بہنو! اپنی گود کے بچوں کا حوصلہ بلند کرو۔ اپنی

گود کے بچوں کو سمجھاؤ اگر رات آدھی ہو گئی ہے مگر رباب کے لال پر آنسو بہانے کا وقت آ گیا ہے۔ میرے بچو! یہ گودیوں میں سونے کا وقت نہیں ہے رباب کا لال جھولے میں تڑپ رہا ہے۔

آپ متوجہ ہو گئے میں ایک لفظ کہوں گا جو ہماری بہنیں اپنے بچوں کو گودیوں میں لے کر آئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے دودھ پیتے بچے ہیں جب گھر سے مجلس میں جلنے کے لئے تیار ہوتی ہیں تو دودھ ساتھ لے کر آتی ہیں اور فرش پر آکر بیٹھتی ہیں تو اگر بچے کو دودھ کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے فوراً دودھ دے دیتی ہیں۔ اگر بچے کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے پانی دے دیا جاتا ہے۔ فرش عزا پر آکر بیٹھتی ہیں مگر اپنے بچے کی پیاس کا خیال ہے۔ اپنے بچے کی زندگی پر نگاہ ہے۔ لے میری بہنو! جب تمہارا بچہ پیاسا ہوتا ہے تو اس کو پانی پلا دیتی ہو۔ ہائے وہ ماں کیا کرے جو تین دن سے اپنے بچے کو دیکھ رہی ہے۔ مگر کوئی قطرۂ آب نہیں ہے۔ اے اصغرؑ کہاں سے لاکر تمہیں پانی پلاؤں۔ اے بیٹا تیری پیاس کا کیا انتظام کروں۔ سنو گے عزیز وکر رباب کے دل کا کیا عالم ہے میں تو جانتا ہوں نہ سوچ سکتا ہوں البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اصغرؑ کی پیاس کو جب ظالموں نے دیکھا تو منہ پھیر کر رو دیئے۔

وہ وقت آیا جب ساری قربانیوں کے بعد حسینؑ بن علیؑ نے آواز دی "ھل من ناصر ینصرنا" مسلسل فضائے کربلا میں استغاثہ کی آواز گونج رہی ہے۔ "ھل من ناصر ینصرنا" ایک آخری آواز جو فضا میں گونجی تو ایک مرتبہ خیمہ میں کہرام مچ گیا۔ رونے کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ امامؑ کے کانوں تک آواز پہونچی میدان سے آئے۔ آواز دی بہن زینبؑ! یہ رونے کا کیا سبب ہے ابھی تو حسینؑ زندہ ہے، خیمہ میں کہرام کیسا ہے ابھی تو بھائی زندہ ہے۔ کہا بھیا آپ کی آواز استغاثہ کو سن کر علی اصغرؑ نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے۔ بھیا اب اصغرؑ کسی کی گودی میں نہیں جاتے ہیں۔ بس یہ سننا تھا حسینؑ خیمہ میں داخل ہوئے۔ آئے علی اصغرؑ کے قریب۔ کیا کہا باپ نے اور کیا سمجھا بیٹا۔ نہ کوئی مقتل جانتا ہے نہ کوئی راوی جانتا ہے۔ کیا

اشاروں میں باپ نے کہہ دیا اور کیسے بیٹا باپ کے اشاروں کو سمجھا۔ اتنا دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حسینؑ نے ہاتھ بڑھائے۔ اصغرؑ ہمک کے باپ کی گودی میں آگئے۔ بابا میں تو آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ مجھے مقتل میں لے کر چلیں۔ اگر میں چلنے کے قابل ہوتا تو میدان میں آگیا ہوتا۔ بابا مجھے آپ لے کر چلیں۔

حسینؑ نے علی اصغرؑ کو گود میں لیا۔ لے کر چلے۔ روایت کہتی ہے کہ جب درِ خیمہ کے قریب پہونچے تو دیکھا کہ رباب سر جھکائے کھڑی ہیں۔ فرمایا رباب! تم یہاں درِ خیمہ کے پاس کیوں کھڑی ہو۔ کہا آقاؑ میں دیکھ رہی ہوں کہ صبح سے جو میدان میں گیا وہ پلٹ کے نہیں آیا۔ اب میرا لال جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آخری دیدار کر لوں اور اپنے لال کو رخصت کر لوں۔

حسینؑ نے یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ رباب اب تک جو بھی میدان میں جا رہا تھا اس کے بارے میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید یہ جنگ کرنے آیا ہے۔ لڑنے آیا ہے۔ مگر تمہارا لال تو لڑنے کے لئے نہیں جا رہا ہے۔ شاید کسی کو رحم آجائے۔ یہ کہہ کر حسینؑ نے خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ باہر آئے اور ایک بلندی پر آکر آواز دی۔ اے قومِ جفاکار! اگر تیرے خیال میں حسینؑ کی کوئی خطا ہے تو چھ مہینہ کا بچہ تو خطاکار نہیں ہوتا ہے میرے لال کو دیکھو۔ اسے پانی نہیں ملا ہے۔ میرا بچہ پیاس سے جاں بلب ہے۔ کیا کوئی سبیل ہے، کیا کوئی راستہ ہے، کیا کوئی امکان ہے۔

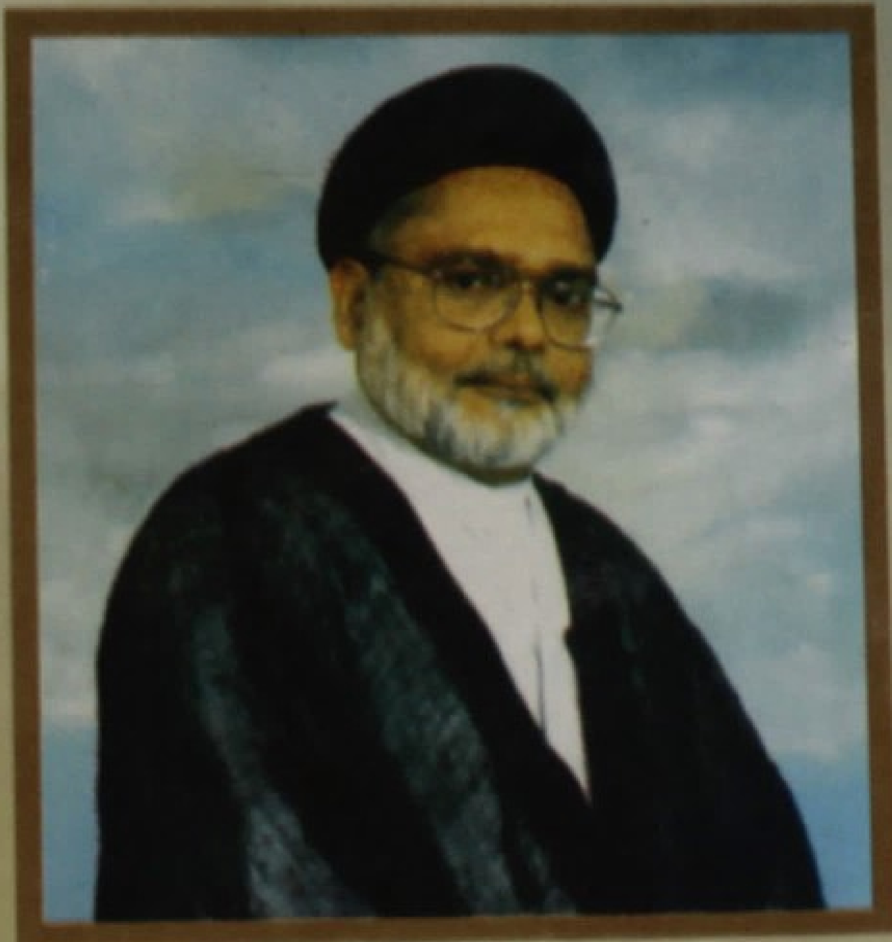
دو جملے تاریخ میں ہیں، پہلے حسینؑ نے مذہب کا حوالہ دیا "اَمَا فِیکُم مُسلِمٌ" ارے کیا تم میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ اسلام نے تو پیاسے کی پیاس بجھانے کا حکم دیا ہے۔ اسلام نے تو بچوں پر رحم کرنے کا قانون بنایا ہے پھر جب کوئی جواب نہ ملا تو ایک مرتبہ تڑپ کر حسینؑ نے کہا ارے ظالمو! اگر تم مسلمان نہیں ہو تو کیا تم میں کوئی صاحبِ اولاد بھی نہیں ہے۔ میرا بچہ پیاس سے تڑپ رہا ہے مگر تمہیں رحم نہیں آتا ہے۔ لو میں اپنے بچے کو خاک پر لٹائے دیتا ہوں کوئی پانی پلانے والا ہے؟ کوئی جواب نہ ملا فرمایا بیٹا یہ میری بات نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ میری زبان نہیں سمجھتے ہیں۔ میرے لال اب تم انھیں بتاؤ کہ تم کتنے پیاسے ہو۔ تم انھیں سمجھاؤ کہ تم کتنے پیاسے ہو

باپ کا حکم ملا۔ اصغرؑ نے اپنی سوکھی زبان ہونٹوں پر پھرائی۔ یہ منظر وہ تھا جس کو دیکھ کر پوری فوج میں کہرام مچ گیا۔ ابن سعد نے جب یہ منظر دیکھا تو آواز دی "حُرمَلَةُ اِقطَعْ کَلَامَ الحُسَینِ" حرملہ نے دوش سے کمان اُتاری۔ ترکش سے تیر نکالا۔ تیر چلہ کمان میں جوڑا۔ علی اصغرؑ کے گلے کو نشانہ بنایا۔ بچّے کے گلے پر تیر لگا۔ حسینؑ نے اپنے لال کو دیکھا۔ لبوں پر تبسّم ہے۔ ارے بابا میں مُسکرا کے جا رہا ہوں۔ حسینؑ نے بچّے کو سنبھالا۔ لے کر چلے درِ خیمہ کی طرف۔ درِ خیمہ پر پہونچے آواز دی رباب! اپنے لال کو لے جاؤ۔

بس اولاد والو! میں نے مقاتل میں دیکھا ہے کہ اب جو خیمہ میں آواز پہونچی تو اِدھر سے رباب چلیں اُدھر سے سکینہ چلیں۔ مگر روایت کا انداز کہتا ہے کہ رباب بعد میں آئیں سکینہ پہلے آئیں۔ بچّی دوڑ کے آئی، بابا علی اصغر کو پانی پلا لائے؟ ارے سکینہ بھی تو آپ کی بچّی ہے۔

رباب درِ خیمہ پر پہونچی، حسینؑ نے عبا کا دامن اُلٹا۔ ارے میرے لال کیا تجھ جیسے بچے بھی نحر کر دیئے جاتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝



صدی کے عظیم مفکر مصنف مترجم مفسر اور عالم دین
علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

(۱۹۳۸ء - ۲۰۰۰ء
۱۳۵۷ھ - ۱۴۲۱ھ)

''کربلا شناسی''

ایک عشرہ مجالس کا مجموعہ ہے جس میں فاضل خطیب نے فکر انگیز مضامین کو سحر انگیز زبان میں پیش کئے اور ادارۂ تنظیم المکاتب نے اسے کتابی صورت میں مومنین و اہل ذوق کے شوق نظر کی نذر کیا ہے۔ ان مجالس میں معرکۂ کربلا کے اقدام حسینؑ، اس کی مصلحت بینی اور آثار و نتائج پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس ضمن میں امام عالی مقام اور یزید (داخل و شنامقام) کے کردار، میراث کا تقابلی تجزیہ اور امامؑ کے نادرۂ روزگار انصار کے لازوال کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مجموعی طور سے یہ مجموعہ اپنے انداز سے بے مثال اور اچھوتا ہے۔